بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے

تصنیف

ڈاکٹر عزیز احسن

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

اک صنفِ سخن جس کا تعلق ہے نبی ﷺ سے
صد شکر! کہ نسبت ہے طبیعت کو اُسی سے

عزیز احسن

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

نام کتاب	:	نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے
مصنف	:	ڈاکٹر عزیزؔ احسن
مرتب	:	ڈاکٹر محمد سہیل شفیق
بارِ اول	:	جمادی الاول ۱۴۳۶ھ / مارچ ۲۰۱۵ء
حروف کار	:	محمد فیصل
صفحات	:	۳۵۲
قیمت	:	۴۰۰ روپے
تعداد	:	۵۰۰
ناشر	:	نعت ریسرچ سینٹر بی۔۳۰۶، بلاک۱۴، گلستانِ جوہر، کراچی۔
تعاون	:	بزمِ یوسفی، A-12 بلاک 13 ،گلستانِ جوہر، کراچی پوسٹل کوڈ:75290

ISBN: 978-969-8918-28-6

انتساب

حضرت علامہ خواجہ قاضی شفیق احمد فاروقی

القادری، چشتی نظامی المدنی قُدِّسَ سِرَّہٗ السّامی

کے نام

عزیزؔ احسن

مصنف: ایک تعارف

نام: عبدالعزیز خان ولد عبدالحمید خان [یوسف زئی پٹھان]...... **قلمی نام:** عزیزؔ احسن

پیدائش: ۱۴؍شوال المکرّم ۱۳۶۶ھ مطابق ۳۱؍اگست ۱۹۴۷ء (جے پور، بھارت)

پاکستان آمد: مئی ۱۹۴۸ء...... (میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق تاریخِ پیدائش: ۴؍جون ۱۹۴۹ء)

تعلیم: میٹرک (1966)، بی۔کام (1970) ، فاضل (اردو 1971)،
فاضل (فارسی 1974) ، ایل۔ایل۔بی (1978) ، ایم۔اے (تاریخ اسلام)
جامعہ کراچی (1985)، ایم۔فل (اقبالیات)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،
اسلام آباد (2008ء)، پی۔ایچ۔ڈی (اردو) جامعہ کراچی۔(2012)

تصنیفات: ۱۔اردو نعت اور جدید اسالیب (تنقیدی مضامین) ۱۹۹۸ء، ناشر: فضلی سنز، کراچی

۲۔تیرے ہی خواب میں رہنا (شعری مجموعہ) ۲۰۰۰ء، ناشر: بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان، پوسٹ بکس نمبر: 17667، کراچی۔75300

۳۔نعت کی تخلیقی سچائیاں (تنقیدی مضامین) ۲۰۰۳ء، ناشر: اقلیمِ نعت (نعت ریسرچ سینٹر) B-306/14، گلستانِ جوہر، کراچی

۶۔شہپرِ توفیق (نعتیہ مجموعہ) ۲۰۰۹ء، ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

۷۔نعت کے تنقیدی آفاق (تنقیدی مضامین) ۲۰۱۰ء، ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

۸۔ رموز بیخودی کا فنی وفکری جائزہ (مقالہ: ایم۔فل [اقبالیات]) ۲۰۱۱ء، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

۹۔امیدِ طیبہ رسی (نعتیہ مجموعہ) ۲۰۱۲ء، ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

۱۰۔اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ (مقالہ: پی۔ایچ۔ڈی) ۲۰۱۳ء، ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، کراچی......تعاون: بزمِ یوسفی، A-12، بلاک 13، گلستانِ جوہر، کراچی۔ پوسٹل کوڈ: 75290

۱۱۔پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، جولائی ۲۰۱۴ء

۱۲۔تعلق بالرسول ﷺ کے تقاضے اور ہم (کتابچہ)، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، دسمبر ۲۰۱۴ء

۱۳۔نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے، (تنقیدی مضامین)، پیشِ نظر

تالیفات:

۱۔جواہر النعت (نعتیہ انتخاب)، بزمِ یوسفی، کراچی۔۱۹۸۱ء

۲۔م ص (نعتیہ مجموعہ) فدا خالدی دہلوی، کراچی۔۱۹۸۳ء

۳۔آتش احساس (مجموعہ غزلیات) فدا خالدی دہلوی، کراچی۔۱۹۸۴ء

۴۔خوابوں میں سنہری جالی ہے (نعتیہ مجموعہ) صبیح رحمانی، ۱۹۹۷ء، اقلیم نعت، کراچی

۵۔قصر بلند، یعنی مطالعہ قرآن، ایچ۔ایچ، امام اکبر آبادی، ۲۰۰۱ء، آفتاب اکیڈمی، کراچی

۶۔سبد گل، ایچ۔ایچ، امام اکبر آبادی، ۲۰۰۱ء، آفتاب اکیڈمی، کراچی

۷۔بحرِ شناسائی، (فارسی کلام)، حضرت سید ظہور الحسنین شاہ ظاہرؔ احسنی، یوسفی تاجی رحمۃ اللہ علیہ، بزمِ یوسفی، کراچی، ۱۴۳۵ھ مطابق: ۲۰۱۴ء

پیشہ:

ملازمت۔ تیل اور گیس کی ترقیاتی کارپوریشن سے ڈپٹی چیف انٹرنل آڈیٹر کی حیثیت سے ۳؍جون ۲۰۰۹ء کو اپنی مدتِ ملازمت پوری کرکے سبکدوش ہوئے۔

ادبی سرگرمیاں:

☆ڈائرکٹر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی۔

☆ نگراں ''نعت رنگ'' (نعتیہ ادب کا علمی تحقیقی وتنقیدی کتابی سلسلہ) مدیر: سید صبیح رحمانی، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی۔

☆معاون مدیر: کتابی سلسلہ ''سفیرِ نعت'' مرتبہ: آفتاب کریمی، کراچی

☆رکنِ مجلسِ تحریرومشاورت: سہ ماہی ''فروغِ نعت''، اٹک

☆اعزاز: اعترافِ خدمات ایوارڈ 2014ء برائے شعبۂ تحقیق وفروغِ نعت (بیادشاہ انصار الہٰ آبادی) منجانب: ادبستانِ انصار کراچی، پاکستان۔

☆ریڈیو پاکستان، کراچی 'عالمی سروس سے 1982 تا 1984 بے شمار کتابوں پر تبصرے

نشر کیے۔

☆ایک ریڈیو فیچر ''امیر خسروؒ'' بھی لکھا جو ریڈیو پر نشر ہونے کے بعد ''احباب'' کراچی میں شائع ہوا۔

☆گاہے بگاہے .Qtv.,Ptv اور Metro One News T.V. پر نعتیہ ادب کے حوالے سے ہونے والی گفتگو میں بھی شریک رہے ہیں۔ ☆ QTV کے مشہور پروگرام ''خوشبوئے حسانؓ'' کے بیشتر پروگراموں میں نعت گو شعراء کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کیا۔

☆روز نامہ جسارت، کراچی کے ادبی صفحات پر ڈاکٹر عزیزؔ احسن کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ہفتہ وار شائع ہونے والے ''جسارت میگزین'' میں بھی ادبی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔

☆نعتیہ موضوعات پر کچھ روزناموں میں بھی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً: روز نامہ ''نوائے وقت'' کراچی۔ روز نامہ ''جنگ'' کراچی ۔روزنامہ جنگ ، راولپنڈی ۔

☆انجمنِ احبابِ جے پور، کراچی، کے مجلّے ''احباب'' کے مدیرِ معاون بھی رہے ہیں۔

☆ عمومی اور نعتیہ ادبی موضوعات پر کچھ مضامین درجِ ذیل جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں: ''احباب'' ، انجمنِ احبابِ جے پور، کراچی۔ کتابی سلسلہ ''مکالمہ'' کراچی۔ ''علم کی روشنی''، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ دو ماہی'' سربکف''، کراچی۔ سہ ماہی ''الزبیر'' بہاولپور۔ ''جامِ نور''، دہلی، بھارت۔ ''مدحت'' (نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ) لاہور، مدیر: سرور حسین نقشبندی۔ ماہنامہ کاروانِ نعت، لاہور، مدیر: محمد ابرار حنیف مغل

موجودہ پتہ: A-12 ، بلاک 13 ، گلستانِ جوہر، کراچی، پوسٹل کوڈ: 75290

سیل: 0333-5567941 ۔ گھر: 021-34634632

abdulazizkhan49@gmail.com

فہرست

عرضِ مرتب .... ڈاکٹر محمد سہیل شفیق	۱۱۔۱۳
دیباچہ .... ڈاکٹر عزیزؔ احسن	۱۴۔۱۸
۱۔اردو زبان اور نعتیہ ادب	۱۹۔۴۴
۲۔صنفِ نعت، ادبی اور ثقافتی وَرثہ	۴۵۔۵۴
۳۔نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت	۵۵۔۷۹
۴۔نعتیہ ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کے تلازمات	۸۰۔۱۲۳
۵۔نعت نگار شعراء کا اظہارِ عجز	۱۲۴۔۱۳۹
۶۔اردو نعت کا ہیئتی مطالعہ...... ایک لائقِ تحسین تحقیقی کاوش	۱۴۰۔۱۴۸
۷۔ہماری ملّی شاعری میں نعتیہ عناصر..... ایک گراں قدر مقالہ	۱۴۹۔۱۷۴
۸۔اقبال کا سفرِ عشقِ رسول ﷺ اور اظہاری مراحل	۱۷۵۔۱۸۲

۹۔کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر	۱۸۳۔۲۲۲
۱۰۔سحرؔ سہارنپوری کی نعت گوئی	۲۲۳۔۲۷۲
۱۱۔حافظ مظہرالدین کا شعرِ عقیدت..... نوائے عاشقانہ	۲۷۳۔۳۱۱
۱۲۔انور مسعود کا شعرِ عقیدت .....باریاب	۳۱۲۔۳۲۱
۱۳۔توصیف تبسم کا نعتیہ آہنگ......''سلسبیل'' کے آئینے میں!	۳۲۲۔۳۲۶
۱۴۔احساسات کی تجسیم ..... ''رسائی روشنی تک''	۳۲۷۔۳۳۴
۱۵۔مقامات (منظوماتِ حرمین شریفین)	۳۳۵۔۳۵۰

عرضِ مرتب

نعت کا بنیادی موضوع سرورِ دو عالم ﷺ کی مدح و توصیف ہے ۔حکمِ باری تعالیٰ: لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ [سورۃ الحجرات: ۲] کا تقاضا ہے کہ ہر حال میں تعظیم و شانِ رسالت مآب ﷺ کو پیشِ نظر رکھا جائے اور اس کی پاسداری کی جائے۔ اسی طرح نعتیہ شاعری کو ادبی معیارات کی روشنی میں جانچنا اور نعت کے موضوع کی نزاکت کے حوالے سے میزانِ شرعی پر تولنا ضروری ہے۔ یہ وہ بارگاہ ہے کہ:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

(عزتؔ بخاری)

یہی وجہ ہے کہ نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت و ضرورت بدرجۂ اولیٰ ہے۔اس کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی جناب میں لب کشائی کے آداب بھی سکھائے ہیں اور ذو معنی الفاظ کے استعمال کی ممانعت بھی فرمائی ہے اور خود جنابِ رسالت مآب ﷺ نے اشعار سماعت بھی فرمائے ہیں اور اصلاح بھی دی ہے۔

مصنف کتاب ہٰذا، ڈاکٹر عزیزؔ احسنؔ صاحبِ علم، وسیع المطالعہ، معروف ادیب اور معتبر نقاد ہیں اور گزشتہ چار عشروں سے علم و ادب کی تحصیل و اشاعت میں مصروفِ عمل ہیں۔ اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب سے بھی خوب واقف ہیں، اقبالؔ شناس بھی

ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں ''مثنوی رموزِ بیخودی کا فنی و فکری جائزہ'' کے موضوع پر ایم۔فل (اقبالیات) کی سند حاصل کر چکے ہیں۔نعتیہ شاعری کے شعری محاسن اور شرعی نزاکتوں پر گہری نظری رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کے پارکھ بھی ہیں۔

اردو نعتیہ ادب میں اگرچہ تحقیقی کام بہت ہوا ہے لیکن تنقیدی جہت خاطر خواہ توجہ حاصل نہیں کرسکی۔ ڈاکٹر عزیزؔ احسن ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے نعتیہ ادب میں سنجیدگی سے اظہار کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔نعتیہ تنقید کے ضمن میں اس سے قبل ان کی چار کتابیں: ۱۔ اردو نعت اور جدید اسالیب (۱۹۹۸ء)، ۲۔ نعت کی تخلیقی سچائیاں (۲۰۰۳ء)، ۳۔ہنر نازک ہے (۲۰۰۷ء)، ۴۔ نعت کے تنقیدی آفاق (۲۰۱۰ء)، اور متعدد مضامین و مقالات اور نعتیہ کتب پر تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔۲۰۱۲ء میں ''اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ'' کے موضوع پر جامعہ کراچی سے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر عزیزؔ احسن کا یہ کہنا ہے کہ:

> نعت کے مافیہ(content) یا متن (text) کی اہمیت ہر قسم کی شاعری کے مافیہ سے زیادہ ہے۔نعت کے نفسِ مضمون کے فکری رشتے قرآن و حدیث سے بڑے گہرے ہیں۔اس لیے قرآن و حدیث کے مفاہیم کو شعری قالب میں ڈھالنے کے ہنگام استنادی شان کو برقرار رکھنا' تاریخِ اسلام کے مستند حوالوں کو شعری پیکر دینا بہت ضروری ہے۔ اس موقع پر اپنے جذبات ،اپنی خواہشات اور اپنے مذہبی تعصّبات کو قابو میں رکھتے ہوئے راہِ مستقیم پر چلنا اور وادیِ نعت سے سرخرو گزر جانا بہت بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔کیوں کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ سچائی کا عنصر ہر سطح پر برقرار رہ سکے۔''

ڈاکٹر عزیزؔ احسن نے نعتیہ ادب کے حوالے سے جن نکات پر گفتگو کی ہے وہ بہت اہم ہیں اور نعتیہ تنقید کے ضمن میں غور و فکر کا سامان مہیا کرتے ہیں۔اگرچہ قاری کے لیے

بعینہٖ ان تمام نکات سے اتفاق کرنا ضروری نہیں لیکن ان مضامین میں اٹھائے گئے نکات سے صرفِ نظر کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ان مضامین میں پیش کیے گئے تنقیدی نکات ادبی حوالے سے بالخصوص اردو نعتیہ ادب کے حوالے سے تحقیق و جستجو اور دقتِ نظری کا مطالبہ کرتے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب ڈاکٹر عزیزؔ احسن کے ان خطبات اور مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں مختلف محافل میں پیش کیے گئے یا مختلف جرائد میں شائع ہوئے، اور اب ضروری حذف و اضافے کے بعد موضوعات کی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابی صورت میں شائع کیے جارہے ہیں۔ بیشتر مضامین' طبع شدہ ہیں۔ جس کی تفصیل ڈاکٹر صاحب کے پیش لفظ ''حرفِ آرزو'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

راقم، ڈاکٹر عزیزؔ احسن کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے ازراہِ خُرد نوازی ایک طفلِ مکتب کو پیشِ نظر کتاب کی ترتیب و تدوین کا اہل سمجھا اور اس کے ناچیز مشوروں کو قابل اعتناء جانا۔

امید ہے کہ یہ کتاب نعتیہ تنقید کے نئے امکانات کو روشن کرنے کا باعث اور نعتیہ ادب کے طالب علموں کی رہنمائی کا سبب بنے گی۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ فاضل مصنف کی اس سعی کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول فرمائے (آمین)!

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

اتوار: ۱۶ جمادی الاوّل ۱۴۳۶ھ/۸ مارچ ۲۰۱۵ء

Email: sascom7@yahoo.com

Cell: 03002268075

حرفِ آرزو!

الحمدللہ! نعتیہ ادب کے حوالے سے میری تحریروں کو سراہنے والوں نے اتنا سراہا کہ ان کی نیک تمناؤں کے طفیل میرا قلم رواں ہوگیا۔پی ایچ۔ڈی کے لیے جو مقالہ لکھا اس میں پیش کردہ بعض نکات کو وضاحت طلب پایا اور اس طرح اسی مقالے کے چند موضوعات کو از سرِ نو لکھنے کی کوشش کی۔ کچھ ترامیم اور اضافے کیے اور کچھ تشریحات سے بات آگے بڑھائی۔ اس نظرِ ثانی کے عمل نے کچھ نئی تحریروں کو جنم دیا۔ اقبالیات میں ایم۔فل کے لیے جو مقالہ لکھا گیا تھا اس کے بہت سارے ابواب تشنہء توضیح تھے۔ خاص طور پر اقبال کی شاعری میں نعتیہ عناصر کا ذکر جس خصوصی توجہ کا متقاضی تھا ''مثنوی رموزِ بیخودی کا فنی وفکری جائزہ'' والا مقالہ لکھتے ہوئے اس تقاضے کو پورا کرنا ممکن نہ ہوسکا تھا۔ چنانچہ اب قدرے طویل مضمون لکھ کر تھوڑا سا حق ادا کرنے کی سعی کی ہے۔نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت پر تحقیقی مقالے میں بہت زیادہ گفتگو کی گنجائش نہ تھی اس لیے جب حلقہء اربابِ ذوق، کراچی کی طرف سے مجھے اس موضوع پر کچھ عرض کرنے کی دعوت دی گئی تو میں نے عام فہم زبان میں نعتیہ شعری اظہار کے حوالے سے تنقید کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی' جسے بے حد پذیرائی ملی۔آرٹس کونسل کراچی کی جانب سے ساتویں عالمی اردو کانفرنس میں ایک اجلاس ''اردو زبان اور نعتیہ ادب'' کے عنوان پر اظہارِ خیال کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس موضوع پر میں نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ لیا تھا، لیکن وہاں وہ مضمون بھی پیش کرنے کی گنجائش نہیں نکل سکی اور زبانی چند کلمات میں بات سمیٹنی پڑی تھی۔ چنانچہ اب وہی مضمون قدرے تفصیلی

شکل میں اس کتاب میں شامل کیا جارہا ہے۔ انجمنِ ترقی اردو پاکستان کی جانب سے ''صنفِ نعت، ادبی اور ثقافتی وَرثہ' کے موضوع پر کچھ کہنے کی دعوت ملی تو وہاں بھی مضمون تو نہیں البتہ اس کے کچھ نکات پر زبانی گفتگو کرکے کام چلالیا تھا۔ اب وہ مضمون بھی پیشِ خدمت ہے۔

میرے بیشتر مضامین' طبع شدہ ہیں۔ کچھ ''نعت رنگ'' میں شائع ہوچکے ہیں اور کچھ جسارت، سنڈے میگزین ،کراچی، میں قسط وار آچکے ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ ان مضامین میں کچھ نکات میری پچھلی تحریروں میں بھی پیش کیے گئے تھے اور یہاں ان کا اعادہ کیا گیا ہے۔ پہلے میں نے چاہا کہ مکرر آنے والی عبارتوں کو حذف کردوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ''نظریات اور عقائد کی ذہن نشینی یا INDOCTRINATION'' کا عمل تکرار ہی کا متقاضی ہے...... میرے ذہن میں بھی یہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ:

''سنتا نہیں ہے بات مکرر کہے بغیر''

قرآنِ کریم میں مضامین کی تکرار سے یہ درس ملتا ہے کہ کسی نکتے کو ذہنِ انسانی میں بٹھانے کے لیے اس کی تکرار کی جانی ضروری ہے۔نعتیہ ادب میں موضوع کی یکسانیت اور احساسات و جذبات کی مرکزیت کے باعث ہی ایک متن کی بنت کے کئی زاویئے سامنے آتے رہتے ہیں۔حتیٰ کہ ایک ہی شاعر کے ہاں بعض مضامین کی تکرار ملتی ہے، لیکن مختلف اسالیب میں۔

ایک بات کی وضاحت ضروری ہے ......میرا عقیدہ وہی ہے جو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نبیء کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہوسکتے ہیں جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے''۔

(مکاتیبِ اقبال بنام خان نیاز الدین خان، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص۶۰)

......لیکن شریعت کا تقاضا ہے کہ آج کوئی بھی امتی 'حضورِ اکرم ﷺ کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہوکر خود کو صحابی کے درجے پر فائز نہ سمجھے!......یہی وجہ ہے کہ میں شاعری کا متن بننے والے ایسے مضامین پر کڑی تنقید کرتا ہوں جن میں خود کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ہم پلہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

ایسے مضامین بھی میری تنقید کی زد میں آئے ہیں جن میں حضورِ اکرم ﷺ کے علاوہ بھی کچھ بزرگوں کو ''مقصودِ کائنات'' ظاہر کیا گیا ہے' کیوں کہ اس طرح حضورِ اکرم ﷺ کی شانِ یکتائی اور انفرادیت کا استخفاف ہوتا ہے۔ میری اس جسارت پر بعض حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ......لیکن ان کے پاس کسی حدیث کی سند یا روایت کا مضبوط سہارا نہ تھا اس لیے تاویلات میں الجھ گئے ۔بہر حال مجھے انتہائی مسرت ہوئی جب حرا فاؤنڈیشن پاکستان (رجسٹرڈ)، کراچی، کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے دو ماہی مجلّے ''سربکف'' بابت مئی تا اگست ۲۰۰۸ء کو اسی عنوان (''آپ ﷺ مقصودِ کائنات ہیں'') سے مرتب کرکے اس میں میرا مضمون بھی شامل کردیا گیا۔''سربکف'' کی مذکورہ اشاعت' ڈاکٹر نظر کامرانی، منظر عارفی اورشبیر احمد انصاری کی کاوشوں سے منصۂ شہود پر آئی تھی۔بعد ازاں پاکستان میں نعتیہ ادب میں پہلی ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والے خوش بخت اسکالر جناب پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے یہ لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی :

> ''عزیز احسن اردو نعت کے معاصر منظر نامے کی وہ سعید روح ہیں جنھوں نے نعت کے باب میں قلم اٹھاتے ہوئے تو کیا نعتیہ مضامین کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے اور اس صنف سے وابستہ افراد کے تذکار میں ہمیشہ احترام و آداب کوملحوظ رکھا ہے۔ ان کا ایک اہم مضمون 'نعت اور تصورِ مقصودِ کائنات' (مطبوعہ نعت رنگ شارہ ۲۰) اسی حوالے کا عکاس ایک اہم اظہاریہ ہے جس میں نعت نگاروں سے بھی صنفِ نعت کے تقاضوں اورقرینوں کے اظہار کے بارے میں احوط (بہت محتاط)

> رہنے کا تقاضہ کیا گیا ہے''۔ (پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر، ص 15)

صبیح رحمانی نے ''نعت رنگ'' کے لیے بعض اوقات عنوانات دے کر مجھ سے نئ تحریریں لکھوائیں اور اجمل سراج نے ''جسارت سنڈے میگزین'' کراچی، کے لیے مضامین طلب کیے۔ اجمل سراج نے نعتیہ مضامین کو اتنی اہمیت دی کہ اب انھوں نے جسارت سنڈے میگزین کا ایک گوشہ ''نعت کائنات'' کے نام سے ہر اس تحریر کے لیے وقف کردیا ہے جو نعت سے متعلق ہو۔اللہ تعالیٰ ان کے حوصلے بلند رکھے (آمین!)

''نعت رنگ'' کا اجراء ،(اپریل ۱۹۹۵ء)نعتیہ ادب کے فروغ اورنعتیہ ادب میں تنقید کے آغاز کا موجب بنا اسی مجلّے میں لکھے ہوئے مضامین میری کچھ کتب میں جمع کردیئے گئے ہیں۔ اب جو مضامین پیش کیے جارہے ہیں وہ بھی کچھ'' نعت رنگ'' میں اور کچھ جسارت، سنڈے میگزین میں شائع ہوچکے ہیں۔ ایک آدھ مضمون ایسا ہے جو ابھی تک کہیں اورنہیں چھپا ہے بلکہ اس کتاب میں پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔

پروفیسرڈاکٹر محمد سہیل شفیق صاحب، شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی میں پڑھاتے ہیں اورعلمی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ۱۔نوے سالہ اشاریہ ماہنامہ'' معارف'' اعظم گڑھ(۲۰۰۶ء)،۲۔''مشرقِ وسطیٰ کا بحران'' (۲۰۰۷ء)،۳۔ اشاریہ کتابی سلسلہ''نعت رنگ'' (۲۰۰۹ء)، ۴۔''وفیاتِ معارف'' (۲۰۱۳ء)، ۵۔اشاریہ کتابی سلسلہ' ' جہانِ حمد''(۲۰۱۳ء) ، ۶۔نعت نامے بنام صبیح رحمانی (۲۰۱۴ء) ، جیسے وقیع تحقیقی و تدوینی کاموں کے باعث علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔انھوں نے میری اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا بیڑا اٹھا کر مجھے نچنت کردیا۔اللہ انھیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے (آمین)

کسی بھی علمی سرگرمی کے جاری رکھنے کا عمل اخلاصِ نیت، معروضیت اور دیانت داری سے فکری نکات قلم بند کرنے کا متقاضی ہوتا ہے۔پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہر آدمی کا پیش کردہ ہر نکتہ آسانی سے قبول نہیں کیا جاتا۔ایسی صورت میں اگر مضبوط دلیل کے ساتھ کسی بات کو رد کیا جائے تو غوروخوض کے بعد اپنے پیش کردہ نکتے پر نظرِ ثانی کرلینے میں کوئی

مضائقہ نہیں ہوتا۔لیکن مذہبی موضوعات بالخصوص نعتیہ ادب میں صرف قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی روشنی میں پیش کردہ دلیل ہی چل سکتی ہے......بعد کے ادوار میں پیدا ہونے والے نظریات اور تاریخی اندراجات کی بنیاد پر پیدا ہونے والے تعصّبات پر کسی کی کوئی بات نہیں مانی جاسکتی ہے۔اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

تب و تابِ بت کدہء عجم نرسد بسوز و گدازِ من
کہ بیک نگاہِ محمدؐ عربی گرفت حجازِ من

غیر عرب بت کدے کی چمک دمک میرے سوز و گداز کو نہیں پہنچتی ......یعنی غیر عربی یا غیر اسلامی تصورات ونظریات میری طبیعت کو راس نہیں ہیں۔[کیوں کہ] میرے دل پر حضورِ اکرمﷺ کی نگاہِ لطف وکرم کا اثر بہت گہرا ہوچکا ہے۔گویا آپﷺ کی تعلیمات کے ارتکاز کی وجہ سے میرا دل ہی حجاز بن گیا ہے......(پیامِ مشرق، غزل 34)۔

الحمدللہ! اس ضمن میں راقم الحروف بھی' علامہ اقبال ہی کا پیروکار ہے۔

سید صبیح رحمانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد سہیل شفیق اور کمپوزر محمد فیصل میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہی حضرات کی توجہ سے میرے افکار نے کتابی صورت پائی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میرے افکار میں پختگی عطا فرماکر راست سمتی کی نعمت سے نوازدے...........**آمین بجاہِ سید المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ وسلم!!!**

عزیز احسن

بدھ: ۱۴؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ مطابق: ۴؍فروری ۲۰۱۴ء

E-mail:abdulazizkhan49@gmail.com

Cell: 0333-5567941

اردو زبان اور نعتیہ ادب

کسی بھی زبان کا ادبِ عالیہ، کلی طور پر، کبھی بھی عوام کے اجتماعی شعور کا حصہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے کیوں کہ وہ ہر سطح پر کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا عکاس نہیں ہوتا۔اور تو اور زبان کے برتاؤ میں بھی وہ سادگی سے زیادہ پرکاری اور سہل پسندی کے بجائے مشکل پسندی کا شکار ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ''عوام پسند'' اور ''خواص پسند'' ادب کی علاحدہ علاحدہ حدود از خود متعین ہوجاتی ہیں۔میرؔ جیسے مقبول شاعر کو یہ کہنا پڑا تھا:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے(۱)

اسی لیے مسلم معاشرے میں تخلیق ہونے والا ادب' صرف اس صورت میں مسلمانوں کے اجتماعی شعور کی عکاسی کا حق ادا کرسکتا ہے جب اسلامی روح سے قریب ہو۔اسلامی روح سے مملو شاعری میں اسلامی اقدار کی خوشبو آنی چاہیے...........اور بلاشبہ نعتیہ ادب میں اسلامی اقدار کی خوشبو بدرجہء اتم موجود ہوتی ہے۔

دین کی عملی اور نظری سطح پر تو دو مسلمانوں میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن حبِ رسول ﷺ کے ضمن میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی ابتداء ہی سے نعتیہ ادب میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ہے اور دیگر اصنافِ ادب کے مقابلے میں اس صنفِ ادب کو معاشرے کی اکثریت نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔یہ ادب خواص میں اپنی ادبی حیثیت

اور عوام میں عقیدت کے جذبات کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔شاید نعت کی یہی عوام پسندی تھی جس نے خواص پسند ادب تخلیق کرنے والے شعراء، ادبا اور ناقدین کو اس میدان سے دور رکھا۔

اس مرحلے پر یہ بات بھی صاف ہوجانی چاہیے کہ عوامی نعت اور ادبی نعت میں کیا فرق ہے؟ میرے نزدیک عوامی نعت وہ ہوتی ہے جس میں جذبات کی عکاسی اور زبان کی سادگی تو ہوتی ہے......لیکن نہ تو زبان و بیان کا وہ معیار ہوتا ہے جس کی روشنی میں کوئی شعری مرقع پرکھا جاتا ہے اور نہ ہی متن (text) کی بنت میں کوئی احتیاط برتی جاتی ہے۔اس شاعری میں سند سے زیادہ جذباتی رو کا اہتمام ہوتا ہے۔ظاہر ہے ایسی شاعری جس میں نہ تو ادبی جمالیات کا عکس ہو اور نہ ہی موضوع کی نزاکت کا خیال رکھا گیا ہو'ادبی نقادوں کی توجہ کیوں کر حاصل کرسکتی ہے؟؟؟

رہا سوال ادبی نعت کا ....تو یہ نعت' شاعری کا ایسا نقش قائم کرتی ہے جو نک سک سے درست ہو۔ اس شاعری میں شعری جمالیات کا بھی اتنا ہی خیال رکھا جاتا ہے جتنا موضوع کی نزاکت کے احساس کے ساتھ متن (text) ، مافیہ(content) یا نفسِ مضمون کی بنت کا۔اس شاعری کو ادبی معیارات کی روشنی میں بھی پرکھا جا سکتا ہے اور نعت کے موضوع کی نزاکت کے حوالے سے شرعی میزان پر بھی تولا جاسکتا ہے۔

شاعری کس معیار کی ہو' صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔صرف وجہی کی مثال ہی کافی ہے جس نے ۱۰۱۸ھ میں ایک مثنوی قطب مشتری کے عنوان سے لکھی تھی۔وہ شعری معیارات کا ذکر اس مثنوی میں بڑی وضاحت کے ساتھ کرتا ہے۔

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات
کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو' بتیاں پچیس

بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
جسے بات کے ربط کا فام نیں
اُسے شعر کہنے سوں کچ کام نیں
نکو کر تولئی بولنے کا ہوس
اگر خوب بولے تو یک بیت بس
ہُنر ہے تو' کچ نازکی برت یاں
کہ موٹاں نہیں باندتے رنگ کیاں

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے قطب مشتری کے مقدمے میں اکیس (21) اشعار نقل کیے ہیں جو وجہی نے شعری معیارات کی تعیین کے سلسلے میں لکھے ہیں۔نمونہء کلام تو درجِ بالا اشعار سے ظاہر ہوگیا۔لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود بابائے اردو نے سلیس زبان میں وجہی کی جو ترجمانی کی ہے اس سے استفادہ کرلیا جائے۔وہ لکھتے ہیں:

''سب سے پہلی بات وہ(وجہی) یہ کہتا ہے کہ شعر سلیس ہونا چاہیے۔زیادہ کہنے کی ہوس نہ کر، ایک شعر کہہ پر اچھا کہہ، مگر اس میں کچھ نزاکت ہونی چاہیے۔پھر وہ کہتا ہے کہ شعر کہنے میں سب سے بڑی مشکل یہ آپڑتی ہے کہ لفظ اور معنی میں ایسا ربط ہو کہ دونوں مل کر ایک جان ہوجائیں۔لفظ موزوں اور منتخب اور معنی بلند ہوں۔معنی میں اگر زور ہے تو بات کا مزہ ہی اور ہوجاتا ہے۔البتہ اس کا سنوارنا ضروری ہے۔مثلاً اگر کوئی محبوب حسین ہے تو سنوارنے سے نورٌ علیٰ نور ہوجائے گا۔ایک بات بڑی اچھی یہ کہی ہے کہ شعر میں کوئی جدت ہونی چاہیے۔دوسروں کی تقلید کرنی آسان ہے لیکن شاعر وہی ہے جو اپنے دل سے نئی بات پیدا کرتا ہے۔کہتا ہے کہ میں تو اُس رنگین بات کا قائل ہوں جو دل میں جاکر بیٹھ جائے۔جس سے دل میں ولولہ پیدا ہو اور آدمی سن کر اُچھل پڑے''(۲)

چنانچہ وجہی یا اس سے قبل اور بعد کے(دنیا کی کسی زبان کے) ناقدین نے شعر کی قدر کی تعیین کے جو معیارات بتائے ہیں' ادبی نعت بھی ان معیارات پر پوری اترنے والی شاعری میں ہوتی ہے ...... اور جہاں تک شرعی معیارات کا تعلق ہے تو ادبی نعت قرآن و سنت کی کسوٹی پر کسی جاسکتی ہے۔نیز ادبی نعت، تاریخ و سِیَر کے تلمیحاتی اشاروں میں سند اور صداقت کی پابند ہوتی ہے۔

اردو زبان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے پہلے پہل صوفیاء کرام اور اولیاء عظام نے گلے سے لگایا تھا۔ اسی لیے بعد کے ادوار میں اس کے خمیر میں نعتیہ اقدار اس طور پروان چڑھیں کہ اس کی شریانوں میں ہمہ دم تازہ اور خالص خون داخل ہوتا رہا اور ہورہا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو عوامی سطح پر اپنے ادب کا ایک اہم حصہ پہنچانے کے قابل ہوگئی۔جس طرح لوک گیت کسی زبان کو عوامی سطح پر مقبول بناتے ہیں اسی طرح مذہبی اصناف خاص طور سے نعت عوامی حلقوں میں پھیل کر ادبِ عالیہ کی مقبولیت کا سامان بھی فراہم کرتی ہے اور زبان کی بقا کی ضامن بھی ہوتی ہے۔

اس نکتے کی تفہیم کے لیے مجھے اقبال کے اس رَجائی اظہاریے سے رجوع کرنا ہوگا جس میں اقبال نے قرآنِ کریم سے استشہاد کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کی بقا کی بشارت دی تھی۔علامہ نے بڑی رجائیت کے ساتھ امتِ مسلمہ کے دوام کا ذکر کرتے ہوئے ایک منطقی دلیل فراہم کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

از اجل ایں قوم بے پروا ستے
استوار از نحن نزلنا ستے

اللہ تعالی نے جو یہ فرمایا ہے کہ ہم ہی نے یہ ذکر [قرآنِ کریم] نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے[۱۵:۹]۔تو چونکہ یہ حفاظت مسلمان قوم ہی کے ذریعے ہونی ہے اس لیے یہ قوم بھی ہمیشہ زندہ رہے گی۔اس لیے یہ قوم اجل سے بے پروا ہے۔(۳)

علامہ اقبال کے اس نادر خیال کی روشنی میں مجھے یقین ہے کہ ہر وہ شخص جو اسلام ،قرآن اور صاحبِ قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذکراذکار سے منسلک رہے گا ، اسے حیاتِ دوام حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے اردو زبان کی بھی وہ اصناف ہی زندہ رہیں گی جن میں روحِ اسلام سرایت کرچکی ہوگی......اس موقع پر ایک واقعہ سناتا چلوں۔سن ۸۱ء میں' میں نے ایک نعتیہ انتخاب مرتب کرنے کے لیے کام شروع کیا تو انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری شبیر علی کاظمی صاحب سے بھی ملاقاتیں کیں۔ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا تھا تو انہوں نے ایک خط دکھایا جو بنگلہ دیش سے آیا تھا۔وہ خط ایک بنگالی کا تھا لیکن اردو میں لکھا ہوا تھا۔ شبیر علی کاظمی صاحب نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا اور مکتوب نگار سے استفسار کیا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم اب تک اردو لکھ پڑھ رہے ہو جبکہ تمہارے ملک میں اس زبان کی بڑی مخالفت ہے۔انہوں نے یہ بھی سوال کیا تھا کہ کیا اور لوگ بھی تمہاری طرح اردو لکھ پڑھ رہے ہیں؟......جواب میں مکتوب نگار نے لکھا تھا کہ دینی مدرسوں کے تمام طالب علم اردو ہی میں دینی کتب پڑھتے ہیں کیوں کہ اردو میں بنگلہ زبان کی بہ نسبت بہت زیادہ دینی لٹریچر ہے......آج مجھے یہ بات بتاتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ایک جملہ بھی یاد آرہا ہے جو انہوں نے تقریبِ تقسیمِ اسناد کے موقع پر فرمایا تھا۔ انہوں نے اطلاع دی تھی کہ اردو زبان میں مذہبی کتب کی تعداد بشمول عربی دنیا کی ہر زبان سے زیادہ ہے۔

میرا بھی مشاہدہ ہے......اور ہوسکتا ہے آپ نے بھی غور کیا ہو؟ اردو ادب میں چند شاعروں کے علاوہ نمایاں نہ ہوسکنے والے بے شمار شعراء صرف ''نعتیہ ادب'' تخلیق کرنے کی وجہ سے زندہ ہیں۔

خود بڑے شعراء کی ہر تخلیق زباں زدِ خاص و عام نہیں ہوسکی لیکن جس تخلیق کے ذریعے انہوں نے نعتیہ ارمغاں پیش کیا اس کو شہرت کے پر لگ گئے اور وہ عوام وخواص کی مشترک میراث بن گئی۔حالؔی اچھے شاعر تھے لیکن ان کا مسدس مقبولیت کی جس سطح پر ہے ان کی دوسری شاعری اس سطح پر قطعی نہیں ہے (ادبی سطح کی بات نہیں ہورہی ہے صرف

مقبولیت کی بات کی جا رہی ہے) پھر مسدس کے بھی وہ بند جو نعتیہ ادب کے عکاس ہیں یعنی:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

ایک صدی سے زیادہ ان اشعار کا نسلاً بعدِ نسلٍ ادبی سفر اس بات کا گواہ ہے کہ نعت ہی' لکھے ہوئے حروف کی آبرو ہے۔ اس کے علاوہ آج بھی روضہء رسولِ اکرم ﷺ پر کسی اردو داں کو حالی کے استغاثے کے یہ اشعار پڑھتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے:

اے خاصہء خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے سرزمینِ ہند پر کبھی قدمِ مبارک نہیں رکھا لیکن اس خطے کے حوالے سے آپ ﷺ کی بشارت نے بعد کے زمانوں میں ایک محسوس صورت اختیار کر لی۔ اس بشارت کو علامہ اقبال نے اس طرح شعری جامہ پہنایا ہے:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے(۴)

اس تمہید کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ جب مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم جمائے تو اسلامی تہذیب نے رنگ روپ نکالا۔ پھر جب فارسی، ترکی اور عربی زبانوں کا دیسی زبانوں سے میل جول ہوا اور ایک نئی زبان ''اردو'' وجود میں آئی تو اس کے ابتدائی ادبی اظہار میں نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت کا عنصر شامل تھا جسے ''نعت'' کا نام دیا گیا۔

دنیا کی تقریباً ہر زبان میں نثر سے قبل شاعری وجود میں آئی ہے۔ اردو میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اس لیے اس زبان کے ابتدائی شعری نمونوں میں حمد و نعت ہی کی تخلیقات نظر آتی ہیں۔ یعنی اردو زبان سے نعتیہ ادب کا رشتہ اسی وقت سے قائم ہو گیا تھا جب اردو کی پہلی

شعری تصنیف وجود میں آئی تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کو تسلیم کرتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ اردو کی پہلی شعری تصنیف ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' ہے تو اس میں بھی حمدیہ اشعار کے بعد نعتیہ اشعار ہی ملتے ہیں۔ فخر دین نظامیؔ کی یہ مثنوی ۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ مطابق: ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۵ء کے درمیان لکھی گئی تھی۔ اس میں نعت کے بائیس اشعار ملتے ہیں: نمونۃً چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں:

محمد جرم آد بنیاد نور
دوئے جگ سرے دے پر ساد نور
نہ اکاّس دھرتی نہ دنبو نہ چند
نہ بھریا گچھوّا دیتا نور سند
محمد بڑا راوتِ جگّ تھا
کہ شجرا چرن رائے جگ مگّ تھا
نبی یار تھے یار تے جھارجھار
بچارن نبی کام کرتے بچار
رتن چار تھے لے گئے چار جَن
رتن بیجتیں جم رہے جیو کھن
ابابکر سا چا، عمر کا نیاؤ
کہ عثماں بھنڈاری علی کھڑگ راؤ
خدا سنوریا مصطفیٰ سنوریا
خدا با صفا مصطفیٰ سنوریا
سنو فخر دیں اب کسی سنور سے
الوالامر اپنا اُسی سنور سے

نظامی جس اوپر پھری ایک چِک
رتن لال موتی بھرے تِسّ مُکھ (۵)

اردو کی ابتداء چونکہ خانقاہی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے دینی اقدار پروان چڑھانے کے لیے بدیسی زبان میں مقامی زبان کے الفاظ شامل کرکے تعلیماتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی ترسیل کا کام لیا جاتا تھا۔

’’نعت‘‘ حضورِ اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف کی ملفوظی شکل ہے ۔اس کے لیے شعری تخلیق ہونا بھی ضروری نہیں ہے ۔ اس لیے اردو کے ابتدائی نقوش میں ہمیں اولیاءِ کرام کے وہ فقرے بھی ملتے ہیں جن میں آقائے نامدار حضرت محمد مصطفی ﷺ کے حوالے سے کوئی بات کہی گئی ہے......ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخِ ادبِ اردو میں شاہ وجیہ الدین علوی کا ایک جملہ لکھا ہے جس سے حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کی طرف دھیان جاتا ہے۔شاہ وجیہ الدین علوی کا زمانہ ۹۱۰ھ سے ۹۹۸ھ مطابق: ۱۵۰۴ء تا ۱۵۸۹ء بتایا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :......’’آقا شیخ عربی کا تقویٰ کہاں میرا مکان کہاں‘‘۔(۶)

اس جملے سے اردو کی ابتدائی نشوونما کے خدوخال بھی اجاگر ہوتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ حُبِّ رسول ﷺ کے پھول ابتداء ہی سے زمینِ ادب میں کھلنے لگے تھے۔

شیخ بہاء الدین باجن کا زمانہ سن ۷۹۰ھ سے ۹۱۲ھ مطابق: ۱۳۸۸ء تا ۱۵۰۶ء ہے۔ان کا نعتیہ شغف ان کے ایک مقطعے سے ظاہر ہوتا ہے:

باجن تیرا باوَلا تجھ کارن تیپے دھمکے
نبی محمد مصطفیٰؐ سیں نور جگ میں جھمکے (۷)

قاضی محمود دریائی کا زمانہ ۸۷۴ھ تا ۹۴۱ھ مطابق: ۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۴ء ہے۔ یہ گجرات کے صوفیا میں سے ہیں۔ وہ نبی علیہ السلام کی امت میں ہونے کا اعلان کرتے ہوئے اپنے پیر سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں:

امت نبی محمد کی ...... یہ محمود تیرا داس

برکت پیر چاپلندھا ...... سائیں پورویں من کی آس (۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی ہی نے عالم گجراتی کے ’’وفات نامہ‘‘ کا ذکر کیا ہے جس کی نوعیت میلاد نامے کی سی ہے۔ اس مثنوی میں ’’ذکرِ صعوبت، مرضِ آں حضرت علیہ السلام‘‘ کے تحت چند اشعار ہیں۔گو شاعر نے مستند روایات سے زیادہ سروکار نہیں رکھا ہے تاہم نعتیہ ادب کی تشکیلی صورت میں اس کا حوالہ دیدینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

میمونہ کیاں تھے نبی
اس دن ان کی باری تھی
اوتھانبی کوں ناسکھ آئے
عائشہ کے گھر جایا جائے
پوچھا اس تھی پھر پھر کر
کال میں رہوگا کس کے گھر
تب بیبیوں نیں پائی بات
سب راضی ہو ہاتیں ہات
بی بی کے گھر لیائے در حال
نبی ہمارے ہوئے خوشحال(۹)

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے سکندرعادل شاہ (سنِ جلوس ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۶ء) کے عہد کے شاعر ’’نصرتی‘‘ کو ملک الشعرائے بیجاپور کہا ہے۔نصرتی کے کلام میں بڑی صاف زبان میں نعت ملتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زہے نامور سید المرسلیں
کہ آخر ہے وے شافع المذنبیں
عجب آفرینش کے دریا کا دُر
کہ جس نور تھے بحرِ ہستی ہے پر

نول رُکھ پہ خلقت کے ایدل توریج
وہی پھل ہے آخر جو اول ہے بیج
تہیں حق سے نت ہمزباں ہمکلام
تجے قابَ قوسین ادنٰی مقام
تہیں لامکاں کے دھنی کا انیس
توں بے مثل بے شبہ کا ہم جلیس(۱۰)

حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں شیخ خوب محمد چشتی کے کچھ اشعار لکھے ہیں جن میں دو شعر نعت کے بھی ہیں۔ ان اشعار کی تاریخِ تخلیق ۱۰۰۰ھ لکھی ہے۔

خوب ترنگ اس دییا خطاب
مدح رسول اللہ باب
یا اللہ اے مدحِ رسول
اوسی دوستی کر قبول(۱۱)

نبیء کریم کی نعت آپﷺ کے غزوات کے حوالے سے بھی رقم ہوتی ہے۔ ہمارے عہد میں لالہء صحرائی نے یہ روش خوب اپنائی ہے۔ لیکن یہاں ذکر کرنا ہے محبوب عالم عرف شیخ جیون کا جو بقول حافظ محمود شیرانی 'عہدِ عالم گیری کے شاعر ہیں۔ انہوں نے غزوہء اُحد کا ذکر کیا ہے:

ہوئے پھر مقابل قریشوں کے تب
نبی اور اصحاب ایک بار سب

حافظ شیرانی نے بتایا ہے کہ جیون نے رسول اللہﷺ کی وفات پر حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ وشیخینؓ کی طرف سے مرثیے بھی لکھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اشعار لکھے ہیں:

محمد کہہ محمد کہہ پوکاروں میں سدا اللہ
پھروں گھر گھر یہی کہہ کہہ محمد نانوں پہنچاؤں
کروں ہا ہا محمد بن سہوں پھاہا پڑا نِس دن
گئے سب چین ہر دم میں کسے دکھ بات بتلاؤں
عجب محبوب عالم تھا نہایت خوب بالم تھا
مرا نت پرت پالم تھا رہا ہے بیٹھ کس ٹھاؤں(۱۲)

یہ زبان کس قدر صاف ہے اور کس عقیدت سے حضورِ اکرم کی جدائی کا غم شعری پیکر میں سمویا ہے!

۱۰۷۴ھ عہدِ عالمگیری میں مولانا عبدی کی تصنیف محشر نامہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔

نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

علمِ شریعت نال کے بھیجا پاک رسول
جو کچھ بھیجا رن نیں سب ہم کیا قبول
یارب اپنے فضل سوں بیحد بھیج درود
نبی محمد مصطفٰی تجھ سوں ہوں خوشنود
بھیجوں اوس کی آل پر اور اصحاب تمام
تس بھیجوں احباب پر بہت درود سلام (۱۳)

شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی نے ایک استغاثہ لکھا تھا جس میں عربی، فارسی آمیز اردو موجود ہے۔ شیخ کا انتقال ۱۱۵۱ھ میں ہوا۔

ناہیں مر چھٹ تم کوئی انظر بحالی یا نبیؐ
ہے رین دن غفلت بڑی انظر بحالی یا نبیؐ
اس فضل سوں راکھو مجھے من عزل درجا الصفا
فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

میں ہوں خرابی میں پڑا کا لطفل سوء الخلق حیف
اس غم ستی چھاتی سڑی انظر بحالی یا نبیؐ
اس شرم سوں مجھ مکھ نہیں حتیٰ ارٰی ضوء الصفا
ہے مرگ بھی سر پر کھڑی انظر بحالی یانبیؐ
برقع شریعت سوں رکھوں حتیٰ کون بنورکم
اس عشق سوں کر پھل جڑی انظر بحالی یانبیؐ
رو رو لکھوں رو رو بھروں قصاً بقصاً عاصیا
افواج عصیاں سوں جھڑی انظر بحالی یانبیؐ
راکھو تمھیں راکھو تمھیں لی لیس غیرک یا ملاذ
ناہیں مرا چھوٹ تم ستی انظر بحالی یانبیؐ
بھولا ہوں میں بخشو تمھیں لا تا خذونی بالوزر
جب محی دین بخشش کری انظر بحالی یانبیؐ
فاضل پکارے رین دن اِشفع شفیع المذنبیں
فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یانبیؐ(۱۴)

حضرت غلام قادر شاہ متوفی ۱۱۷۶ھ نے مثنوی رمزالعشق لکھی ۔اس میں احد ،احمد کی یک جائی اور اکائی کا شطح آمیز ذکر ہے۔لیکن ہم یہاں نعت کے اولین نمونے پیش کرنے کی غرض سے تین اشعار نقل کرتے ہیں:

وہی وہی نہ دو جا کوئی
پر گھٹ ہو یا محمد ہوئی
احد محمد ایک پچھانوں
ایک ہی دیکھو ایک ہی جانوں
حمد کہو اور بہت درود

فھو الحامد و المحمود (۱۵)

نثر میں بھی جب کام شروع ہوا تو تقریباً ہر قصے کہانی کے آغاز میں حمد و نعت کے جملے لکھے جاتے تھے۔طوالت سے بچنے کے لیے صرف قصہء چہار درویش یعنی باغ و بہار سے ،میر امن کی لکھی ہوئی نعت کے اشعار اور نثری جملے لکھے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ باغ و بہار کا سن تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔ باغ وبہار کے مقدمے میں میر امنؔ حمد کے اشعار لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

’’اور درود اس کے دوست پر جس کی خاطر زمین اور آسمان پیدا کیا۔ اور درجہ رسالت کا دیا‘‘۔اس کے بعد اشعار لکھتے ہیں:

جسمِ پاکِ مصطفیٰ اللہ کا یک نور ہے
اس لیے پرچھائیں اس قد کی نہ تھی مشہور ہے
حوصلہ میرا کہاں اتنا جو نعت اس کی کہوں
پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہؔ دستور ہے
حمدِ حق اور نعتِ احمدؐ کو یہاں کر انصرام
اب میں آغاز اس کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام
یا الٰہی واسطے اپنے نبیؐ کی آلؓ کے
کر یہ میری گفتگو مقبولِ طبعِ خاص و عام(۱۶)

میں نے نعت کے چند نمونے پیش کرنے کے لیے اردو کے ابتدائی ادب کی سیر کی ہے۔ بعد کے ادوار میں تو تقریباً ہر مثنوی ، ہر دیوان اور ہر تصنیف کا آغاز حمد و نعت ہی سے ہوتا رہا ہے۔قدیم اردو میں نعتیہ اشعار کی کہکشاں دیکھنے کے لیے اردو نعت کی تاریخ ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔کچھ مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں افسر صدیقی امروہی کا مضمون قابلِ ذکر ہے جو غالبًا پہلی مرتبہ ماہ نو کے سیرت رسولﷺ نمبر بابت جولائی ۱۹۶۳ء’’اردوئے قدیم اور نعت گوئی‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا

تھا۔یہی مضمون سیارہ ڈائجسٹ کے رسول نمبر مطبوعہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔نعت رنگ میں بھی قدیم اردو کے نعتیہ نمونے دکھانے کے لیے متعدد مضامین لکھے گئے تھے۔

اردو ادب میں اسلامی ثقافت، اسلامی تشخص اور حضورِ اکرم ﷺ سے عقیدت کے اظہار کے لیے ہر تصنیف میں کچھ نہ کچھ نعتیہ اشعار لکھنے کا رواج عام تھا۔اس میں مذہب کی بھی قید نہیں تھی۔غیر مسلموں نے بھی نعتیں کہی ہیں اور اب بھی کہہ رہے ہیں۔فحش نگاری اور ابتذال کے حوالے سے بدنام شاعر مرزا شوق نے بھی اپنی مثنویوں کی ابتدا حمد و نعت کے اشعار سے کی ہے۔فریبِ عشق میں نعتیہ اشعار کی جھلک دیکھیے:

اے قلم! پہلے لکھ تو' بسم اللہ
بعدہٗ لا الہٰ الا اللہ
بعد احمد کی مدح کر تحریر
کہ وہ دنیا میں ہے خدا کا وزیر
پایا آدم نے ہے اسی سے شرف
تاجِ فرقِ پیمبرانِ سلف
سچ کہ محبوبِ کبریا ہے وہ
خلق میں نائبِ خدا ہے وہ(۱۷)

یہی شاعر بہارِ عشق نامی مثنوی میں تین اشعار کہتا ہے:

کس زباں سے کروں صفاتِ خدا
کیا بشر سمجھے کنہِ ذاتِ خدا
جب نبی یوں کہے کہ اے مالک!
مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ
نعتِ احمد لکھے گا کیا مداح
خُلق کا جس کے ہو خدا مداح(۱۸)

شوق کی معروف ترین مثنوی ''زہرِ عشق'' میں بھی نعت کا ایک شعر لائقِ ذکر ہے:

مدحِ احمد زباں پہ کیوں کر آئے
بحر، کوزے میں کس طرح سے سمائے(۱۹)

غور فرمائیے ! معاملہ بندی کے اشعار کہنے والا شاعر بھی مثنوی کی ابتداء حمد و نعت سے کررہا ہے۔ نیز اس کا حدیث کا مطالعہ بھی اتنا پختہ ہے کہ وہ بلا تکلف حدیثِ پاک کو جزءِ مصرع بنالیتا ہے۔ ''مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ''۔ اے اللہ !ہم نے تیری معرفت کا حق ادا نہیں کیا۔

اردو کی روایت میں تو نعتیہ ادب کی اولیت بھی ثابت ہوتی ہے اور اس کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے......لیکن پاکستان بننے کے بعد ہمارے ادب پر الحادی فکر رکھنے والوں کا اجارہ قائم ہوگیا تھا جس کی وجہ سے حمد و نعت لکھنا ادبی حلقوں کی طرف سے حقہ پانی بند کروانے کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ بہت سارے بزعمِ خویش ترقی پسندوں نے نعت کو صنفِ سخن تسلیم نہیں کیا۔ان لوگوں کی فکری روش کا خیال آتا ہے تو بے ساختہ مجھے حمایت علی شاعر کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

سوچا تو ہم ہیں کب سے اساطیر کے اسیر
کب سے ہے اپنے جہل پہ ہم کو گمانِ علم(۲۰)

عجیب بات کہ فیض احمد فیض جو عربی داں بھی تھے اور دینی فہم بھی عام ادیبوں سے زیادہ رکھتے تھے۔ انھوں نے نعت نہیں کہی اور ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی سے ایک ملاقات میں اپنی غزلوں کے ایسے اشعار کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی جن کے لفظی دروبست سے نعت کا آہنگ بھی پیدا ہونے کا امکان تھا۔یہ واقعہ میں نے کشفی صاحب کے مضمون کے حوالے سے اپنی کتاب ''پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر'' میں درج کردیا ہے۔ لیکن یہاں باردیگر میں عرض کرنے کی جسارت کررہا ہوں کہ جس شعر کی طرف فیض صاحب نے توجہ مبذول کروائی اس میں نعت کا کوئی پہلو نہیں تھا ....اور اگر شاعر کا دعویٰ مان لیا

جائے تو اس شعر میں مدح کے بجائے ذم نمایاں نظر آئے گا!......فیض کا شعر ہے :

شمعِ نظر خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اس شعر میں شمعِ نظر اور خیال کے انجم تک بات ہوتی تو ٹھیک تھی لیکن نعت میں حضورِ اکرم ﷺ کی محفل سے ''جگر کے داغ'' پانے کا تذکرہ قطعی مناسب نہیں ہے۔بہر حال فیض صاحب نے اپنی عمر کے آخری ایام میں ایک فارسی نعت کہہ کر ''نسخہ ہائے وفا'' کے مرتبین کے لیے محفوظ کردی تھی جو مذکورہ کلیات کے آخر میں شامل کردی گئی ہے۔

لیکن رفعنا لک ذکرک ......کے اعلانِ ربانی کا اثر یہ تھا کہ اُس مخالفانہ فضا میں بھی نعت کا ادبی سفر جاری رہا۔یہ اور بات کہ ضیاء الحق کے عہد میں سرکاری سطح پر نعت کی پذیرائی نے اس مقدس صنف کی تخلیق ،ترویج اور اشاعت کی راہ ہموار کردی۔ ترقی پسندی کے نام پر نعت بیزار بہت سے شعراء نے نعت کا غلغلہ محسوس کرتے ہوئے مسلسل نعتیں کہیں اور اپنی نعتوں کے مجموعے بھی شائع کیے۔احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، سرشار صدیقی وغیرہم نے نعتیہ ادب تخلیق کرکے اردو ادب میں اپنی بقا کا تصدیق نامہ حاصل کرلیا...........اورآج صورتِ حال یہ ہے کہ شعری تخلیقات کا تقریباً 60% (ساٹھ فی صد) تخلیقی سرمایہ نعتیہ ادب پر مشتمل ہوتا ہے۔

آج کون سا ادب نواز ایسا ہے جو اس حقیقت سے انکار کرے کہ جن شعراء نے سنبھل کر نعتیں کہی ہیں وہ عام شعراء سے زیادہ ادبی اور عوامی سطح پر مقبول اور لائقِ احترام سمجھے جاتے ہیں۔حفیظ تائب، حافظ مظہرالدین، پیر نصیرالدین گولڑوی،حنیف اسعدی، حافظ افضل فقیر، حافظ لدھیانوی، خالداحمد ، عبدالعزیز خالد،عاصی کرنالی،مظفر وارثی،قمر وارثی، ماجد خلیل، سید صبیح الدین صبیح رحمانی، اعجاز رحمانی اور دیگر بہت سارے شعراء نعت گوئی کے باعث ادبی دنیا میں مقبول بھی ہیں اورعوام کے دلوں پر بھی راج کرتے ہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ نک سُک سے درست نعتیہ کلام کے چند نمونے بھی پیش

نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے عزیز احسن

کردوں تاکہ میرے اس دعوے کی دلیل فراہم ہوجائے کہ نعتیہ شاعری ادبی اور عوامی سطح پر یکساں مؤثر ہے اور اسے LITERATURE OF POWER یعنی پُر تاثیر ادب کا حصہ بنانے میں پس و پیش کرنے والے سخت غلطی پر ہیں۔

ماہرالقادری کہتے ہیں:

وارفتہ و بیچارہ درماندہ و ناکارہ
دربار میں حاضر ہے ، اک شاعرِ آوارہ
پہلے تو مری آنکھیں اشکوں سے وضو کرلیں
اتنی مجھے مہلت دے، اے حسرتِ نظارہ
چھینٹا کوئی پڑ جائے ہاں! شبنمِ رحمت کا
مدت سے دہکتا ہے، سینے میں اک انگارہ
مسجد کے ستوں کیا ہیں، انوار کے فوارے
جالی ترے روضے کی، رحمت کا ہے گہوارہ
جو اشکِ ندامت ہے، نادار کی دولت ہے
دل کا بھی یہی فدیہ، آنکھوں کا بھی کفارہ(۲۱)

دیکھیے اقبال راہی نے کس سلیقے سے ذکرِ ولادتِ رسول ﷺ سے نعتیہ اشعار کو سجایا ہے:

دنیا میں جب ولادتِ ختمِ رسل ہوئی
تاریک دائروں سے نکل آئی روشنی
کلیوں نے آنکھ کھولی ،گلستاں نے سانس لی
غنچوں کا روپ لے کے نکھر آئی زندگی
ذہنِ بشر پہ رنگ چڑھا اعتبار کا
اوڑھا دوشالہ آب و ہوا نے بہار کا

انگڑائی برگ و بار نے لی جھوم جھوم کر
عنبر فشاں نسیم اڑا لے گئی گہر
غنچے شگفتگی کی ادا پر تھے مفتخر
ہر شے چڑھی ہوئی تھی لطافت کے بام پر
چاندی بکھیر نے پہ تُلا روئے آفتاب
ضو بار ہوکے اور بڑھا حسنِ ماہتاب
مابینِ عرش و فرش کھلی نور کی کتاب
ذروں نے اپنی آنکھ سے دیکھا یہ انقلاب
موجِ صبا شفق میں نہاتی ہوئی چلی
شبنم کو ڈالیوں پہ گراتی ہوئی چلی
معیار آدمی کا بڑھایا حضور ؐ نے
پردہ حقیقتوں سے اٹھایا حضورؐ نے (۲۲)

......گوئٹے نے ایک نعت لکھی تھی جس کا پہلی بار فارسی زبان میں علامہ اقبال نے ترجمہ کیا تھا۔ڈاکٹر شان الحق حقی نے اس نعتیہ نظم کا اردو میں ترجمہ کیا۔......دیکھیے ایک بڑا شاعر گوئٹے کس انداز سے نعت کہتا ہے اور کس خوبصورتی سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

وہ پاکیزہ چشمہ جو اوجِ فلک سے چٹانوں پہ اترا
سحابوں سے اوپر بلند آسمانوں پہ جولاں ملائک کی
چشمِ نگہداشت کے سائے سائے
وہ کتنے ہی صد رنگ انگھڑ خزف ریزے
آغوشِ شفقت میں اپنی سمیٹے بہت سے سسکتے ہوئے،
رینگتے، سست، کم مایہ سوتوں کو چونکاتا، للکارتا،
ساتھ لیتا ہوا، خوش خراماں چلا

بے نمو وادیاں لہلہانے لگیں
پھول ہی پھول چاروں طرف کھل اٹھے
جس طرف اس کا رخ پھر گیا
اس کے فیضِ قدم سے بہار آگئی
یہ چٹانوں کے پہلو کی چھوٹی سی وادی ہی کچھ اس کی منزل نہ تھی
وہ تو بڑھتا گیا
کوئی وادی، کوئی دشت، کوئی چمن، گلستاں، مرغزار
اس کے آگے ابھی اور صحرا بھی تھے
خشک نہریں بھی تھیں، اترے دریا بھی تھے
سیلِ جاں بخش کے اس کے سب منتظر
جُوق در جُوق پاس اس کے آنے لگے
شور آمد کا اس کی اٹھانے لگے
راہبر! ......ساتھ ہم کو بھی لیتے چلو
کب سے تھیں پستیاں ہم کو جکڑے ہوئے
راہ گھیرے ہوئے پاؤں پکڑے ہوئے
یاد آتا ہے مسکن پرانا ہمیں
آسمانوں کی جانب ہے جانا ہمیں
ورنہ یونہی نشیبوں میں دھنس جائیں گے
جال میں ان زمینوں کے پھنس جائیں گے
اپنے خالق کی آواز کانوں میں ہے
(دیکھیے! گوئٹے کہہ رہا ہے......خالق کی آواز......یعنی......اَلستُ بِرَبِّکُم)
اپنی منزل وہیں آسمانوں میں ہے
گرد آلود ہیں پاک کردے ہمیں

آ، ہم آغوشِ افلاک کردے ہمیں
وہ رواں ہے رواں ہے ، رواں اب بھی ہے
ساتھ ساتھ اس کے اک کارواں اب بھی ہے
شہر آتے رہے ، شہر جاتے رہے
اس کے دم سے سبھی فیض پاتے رہے
اس کے ہر موڑ پر ایک دنیا نئی
ہر قدم پر طلوع ، ایک فردا نئی
قصر ابھرا کیے ، خواب ہوتے گئے
کتنے منظر تہہِ آب ہوتے گئے
شاہ اور شاہیاں خواب ہوتی گئیں
عظمتیں کتنی نایاب ہوتی گئیں
اس کی رحمت کا دھارا ہے اب بھی رواں
از زمیں تا فلک از فلک تا زمیں
از ازل تا ابد جاوداں ، بیکراں
دشت و در ، گلشن و گل سے بے واسطہ
فیضیاب اس سے کُل
اور خود کُل سے بے واسطہ (۲۳)

[نغمہء محمدی Song of Muhammad جرمن شاعر گوئٹے' ترجمہ ڈاکٹر شان الحق حقی]

عبدالعزیز خالد مشکل پسند شاعر تھے۔ کئی زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، اردو، پنجابی، سندھی سب زبانوں کے الفاظ اپنی تخلیقات میں شامل کر لیتے تھے.....کبھی کبھی سادہ زبان میں بھی شعر کہہ لیتے تھے۔ میں ان کی ایک سادہ نظم پیش کرتا ہوں:

درِ یتیمِ مکہ..................وہ لالِ آمنہ کا...........طائف کا آبلہ پا
خلوت نشیں حرا کا......روزہ ہے ڈھال جس کی......محرم وہ ھل اتیٰ کا
فاقے ہیں جس کا توشہ......سرور، وہ دوسرا کا......وہ رہنما و راہی
ہر جادۂ وفا کا ......وہ سربراہ و سالک......ہر مسلکِ رِضا کا
وہ ساقی و معاشر......ہر مشربِ صفا کا
فیضان کا جو سوتا......سرچشمہ ہے عطا کا
منجملہ ٔ مساکیں......مالک خلا ملا کا
عرشِ بریں کا زائر......وہ ہم زباں خدا کا
عمامہ جس کے سر پر......مازاغ ما طغیٰ کا
وہ شاہبازِ وحدت ......شاہِ جہادو ہجرت
جس خوش لقا کا اسوہ......جس خوش ادا کی سنت
بیکس کی دستگیری......مظلوم کی امانت
معذور کی کفالت......محروم کی وکالت
تاحدِ ظرف و وسعت............خلقِ خدا کی خدمت
بہبودِ نوعِ انساں ....فوز وفلاحِ امت
وہ پیکرِ صداقت......جس کا علم عدالت
انصاف کا وہ داعی............پیغمبرِ اخوت
کی جس نے آشکارا......انسانیت کی عظمت
دیدار جس کا مژدہ ......گلزار جس کا طلعت
جس کا کلام مرہم...........جس کا بیاں بشارت
سلطانِ علم وعرفاں......خاقانِ حرف وحکمت
سالارِ عشق و مستی ...... سردارِ عزم و ہمت
کہتی ہے ساری خلقت......جس کو رسولِ رحمت

امرت بنائے بِس کو .... کندن بنائے مِس کو

یزداں پکارے جس کو .... یا ایھاالرسولُ............ یا ایھا النبیُّ!

اپنا پکاروں خالدؔ......اس کے سوا میں کس کو (۲۴)

رحمان کیانی نے نعتیہ شاعری کو رزمیہ لہجہ دیا اور اسلام کے اصل مجاہد کی شان ظاہر کرتے ہوئے نعت کہی۔ نعتیہ ادب میں اس سے زیادہ مؤثر نظم میری نظر سے نہیں گزری۔اس کی وجہ یہ تھی کہ شاعر صاحبِ سیف بھی تھا اور صاحبِ قلم بھی:

لوگو سنو! جناب رسالت مآب میں
شانِ رسول ؐ صاحبِ سیف و کتاب میں
ماحی لقب نبیؐ مَلاحِم کے باب میں
کرتا ہوں فکرِ مدح تو جوشِ خطاب میں
مصرع زباں پہ آتا ہے زورِ کلام سے
تلوار کی طرح سے نکل کر نیام سے
نعتِ رسولؐ کا یہ طریقہ عجب نہیں
سمجھیں عوام داخلِ حدِ ادب نہیں
لیکن یہ طرزِ خاص مرا بے سبب نہیں
شیوہ سپاہیوں کا نوائے طرب نہیں
رائج ہزار ڈھنگ ہوں ذکرِ حبیبؐ کے
شاہیں سے مانگیے نہ چلن عندلیب کے
مانا حبیبِ خالقِ اکبر رسولؐ کو
خیرالوریٰ و شافعِ محشر رسولؐ کو
عین النعیمؐ، ساقیِ کوثر رسولؐ کو
شمع و چراغِ مسجد و منبر رسولؐ کو

لیکن جو ذات مدحِ بشر سے بلند ہے
ہم سے یہ پوچھیے کہ ہمیں کیوں پسند ہے؟
جب بھی سپاہیوں سے پیمبرؐ کو پوچھیے
خندق کا ذکر کیجیے، خیبر کو پوچھیے
بدر و احد کے قائدِ لشکر کو پوچھیے
یا غزوۂ تبوک کے سرورؐ کو پوچھیے
ہم کو حنین و مکہ و موتہ بھی یاد ہیں
ہم امتی بانیِ رسمِ جہاد ہیں
رسمِ جہاد حق کی اقامت کے واسطے
کمزور و ناتواں کی حمایت کے واسطے
انصاف امن اور عدالت کے واسطے
خیرالممات مرگِ شہادت کے واسطے
لڑتے ہیں جس کے شوق میں ہم جھوم جھوم کر
پیتے ہیں جامِ مرگ کو بھی چوم چوم کر
لاکھوں درود ایسے پیمبرؐ کے نام پر
جو حرفِ لاتخف سے بناتا ہوا نڈر
اک جاوداں حیات کی بھی دے گیا خبر
یعنی خدا کی راہ میں کٹ جائے سر اگر
ہم کو یقین ہے کبھی مرتے نہیں ہیں ہم
اور اس لیے کسی سے بھی ڈرتے نہیں ہیں ہم
توپ و تفنگ و دشنۂ و خنجر صلیب و دار
ڈرتے نہیں کسی سے محمدؐ کے جاں نثار

ماں ہے ہماری اُمِّ عمارہؓ سی ذی وقار
ہم ہیں ابو دُجانہؓ و طلحہؓ کی یادگار
ہاں مفتی و فقیہ نہیں مان لیتے ہیں
ناموسِ مصطفیٰؐ پہ مگر جان دیتے ہیں(۲۵)

شاہ حسن عطا مرحوم ایک شعلہ بیاں مقرر اور بڑے ذی علم انسان تھے۔میں نے ان کی شاعری کی ایک کتاب دیکھی تھی اس لیے''جواہرالنعت'' کے لیے نعت کی فرمائش کی تو انہوں نے طبع آزمائی کی اور کئی نعتیہ غزلیں لکھ ڈالیں۔ان کی ایک نعت پیشِ خدمت ہے:

نہیں کہ تجھ کو بشر ہی سلام کرتے ہیں
شجر حجر بھی ترا احترام کرتے ہیں
اِسی سے گرمیء محفل ہے آج بھی قائم
کہ تیرا ذکر جہاں میں مدام کرتے ہیں
وہ ضبطِ نفس وہ سرمستیء پیامِ الست
ترے حضور فرشتے قیام کرتے ہیں
تری طلب میں جو رہتے ہیں رہ نورد یہاں
وہی تو سارے زمانے میں نام کرتے ہیں
مصافِ زیست میں جاں دادگانِ عشق ترے
ہر ایک آفتِ دوراں کو رام کرتے ہیں
ترا یقیں ہے فزوں تر مہ و ثریا سے
کہ اس کے نور سے برپا نظام کرتے ہیں
رہِ جنوں کی طلب میں بھی جاں نثار چلیں
رہ خرد کا جو یہ اہتمام کرتے ہیں
ملی ہے جن کو محبت تری زمانے میں
خموش کارِ امم وہ غلام کرتے ہیں
تری قیادتِ عظمیٰ ہوئی ابد پیما

کہ تجھ کو سارے پیمبر امام کرتے ہیں
تری زباں کے توسط جو مانتے ہیں کتاب
وہ کیوں حدیث میں تیری کلام کرتے ہیں

(جو حدیث نہیں مانتے یہ ان کے لیے بہت بڑی بات ہے۔حضورﷺ ہی نے تو یہ بتایا ہے کہ یہ قرآن ہے......تو یہ حدیث تو ہوگئی نا! حدیث پہلے ہوئی قرآن بعد میں آیا):

جو مستحق تھے عقوبت کے ہوں وہ خلد نشیں
نگہ کرم کی شہِ ذی مقام کرتے ہیں
سکھائے تونے جو پیکار و صلح کے آئیں
جہاں کی رہبری تیرے غلام کرتے ہیں
ترا مقام ہے اب تک نظر سے پوشیدہ
اگرچہ ذکر ترا خاص و عام کرتے ہیں (۲۶)

الغرض نعتیہ ادب میں تخلیق، تحقیق اور تنقید پر بہت کام ہو چکا ہے اور الحمدللہ یہ کام اب بھی جاری ہے۔نعتیہ ادب کی تخلیق میں صرف مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی شریک ہیں۔نور احمد میرٹھی مرحوم نے ''بہر زباں بہر زماں'' کے نام سے ایک ضخیم نعتیہ مجموعہ مرتب کیا'جس میں دنیا کی کئی زبانوں کی شاعری موجود ہے اور ساری شاعری غیر مسلموں کی جانب سے وجہِ تخلیقِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں ہے۔کاش تمام مسلمان شعراء، ناقدین اور محققین بھی اس صنفِ شریف کو اپنی فکر کا محور بنا سکیں۔

پیش کردہ حقائق کی روشنی میں بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان اور نعتیہ ادب کا چولی دامن کا ساتھ تھا، ساتھ ہے اور ساتھ رہے گا ....اور بلا شبہ اسی تعلق کی بنا پر زبان اور شعری ادب کی بقا کی امید بھی کی جاسکتی ہے۔

مآخذ ومنابع:

۱۔کلیاتِ میؔر، دیوانِ دوم، مرتبہ: کلبِ علی خاں فائق،مجلسِ ترقی ءادب، لاہور،طبع، دوم: جنوری ۱۹۹۱ء،ص۳۸۰

۲۔مقدماتِ عبدالحق،مرتبہ:ڈاکٹر عبادت بریلوی ،اردو مرکز ،لاہور،ص۱۲۸

۳۔عزیؔز احسن [ڈاکٹر]مثنوی رموزِ بیخودی کا فنی وفکری جائزہ،نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، بارِ اول مارچ ۲۰۱۱ء، ص189 ۴۔کلیاتِ اقبال(اردو)سروسز بک کلب، ۱۹۹۵ء ،ص۸۷

۵۔مثنوی نظامی دکنی المعروف کدم راؤ پدم راؤ، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی ، انجمن ترقی ء اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی، اشاعتِ اول۱۹۷۳ء ،ص۷۳)......(تاریخِ ادبِ اردو،ص۱۶۰)

۶۔جمیل جالبی (ڈاکٹر)، تاریخِ ادبِ اردو۔جلد اول،مجلسِ ترقی ءاردو، لاہورطباعتِ ششم، اگست ۲۰۰۷ء،۔ص۱۰۱

۷۔ایضاً ص۱۱۰ ۸۔ایضاً ۱۱۳ ۹۔ایضاً ص ۱۳۸

۱۰۔نصرتی۔مؤلفہ: ڈاکٹر عبدالحق۔کل پاکستان انجمن ترقی اردو، کراچی۔اشاعتِ ثانی ۱۹۶۱ء۔ص۳۳

۱۱۔حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو(حصہ اول)،مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع دوم: ۱۹۹۸ء،ص۱۷۸

۱۲۔ایضاً ص۲۰۲ ۱۳۔ایضاً ص۲۴۴ ۱۴۔ایضاً ص۲۵۰

۱۶۔، میر امن، باغ و بہار مرتبہ: ابوالخیر کشفی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، سالِ اشاعت ۱۹۶۵ء،ص۴۷

۱۷۔نواب مرزا شوق لکھنوی،مثنویاتِ شوق، مرتبہ:رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء،ص ۱۶۱

۱۸۔ایضاً ص ۱۸۶ ۱۹۔ایضاً ۲۳۴

۲۰۔صبیح رحمانی، نعت رنگ ۔شمارہ ۳، نعت ریسرچ سینٹر،کراچی ،ص۲۹۹

۲۱۔عبدالغفور قمر، انتخابِ نعت، حصہ دوم، EE ۔19 فیز 4 ، ایل سی ایچ ایس، لاہور کینٹ، طبعِ اول۱۹۹۷ء، ص۳۰۸

۲۲۔راجا رشید محمود، نعت کائنات ، جنگ پبلیشرز، لاہور، اشاعتِ اول اکتوبر۱۹۹۳ء،ص555

۲۳۔عزیز (صابری)احسن ، جواہرالنعت ،بزمِ یوسفی کراچی،نقشِ اول ۱۹۸۱ء ،ص۴۴

۲۴۔ایضاً ص۴۸

۲۵۔شفیق بریلوی،ارمغانِ نعت ، مکتبہ خاتونِ پاکستان، کراچی ، اشاعتِ دوم:مارچ ۱۹۷۵ء ،ص ۲۹۹

۲۶۔جواہرالنعت ،ص۴۱

....

☆یہ مضمون ساتویں عالمی اردو کانفرنس میں،بروز اتوار، 19 /اکتوبر 2014 ء کو (آرٹس کونسل آف پاکستان،کراچی)پیش کرنے کے لیے لکھا گیا‘لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف چندنکات پیش کیے گئے تھے۔اب یہ مقالہ اپنی اصل شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

صنفِ نعت، ادبی اور ثقافتی ورثہ

صنفِ نعت ایک عرصے تک ادب شناس کاملین کی توجہ حاصل نہیں کرسکی تھی۔ ہمارے وطن میں ایک مدت تک ترقی پسندی کے نام پر دین بیزاری سے مملو ادب تخلیق ہوتا رہا تھا..........پھرحمایت علی شاؔعر صاحب یہ کہہ کرنعتیہ ادب کی طرف متوجہ ہوئے کہ:

سوچا تو ہم ہیں کب سے اساطیر کے اسیر
کب سے ہے اپنے جہل پہ ہم کو گمانِ علم

لیکن حمایت علی شاعر کے علاوہ جو لوگ ادبی میدان میں کام کررہے تھے وہ پھر بھی بیدارنہیں ہوئے۔پھر جب ضیاء الحق نے سرکاری طور پر صنفِ نعت کی پذیرائی کی تو بہت سے ترقی پسندوں نے بھی اس صنفِ شریف کی طرف توجہ کی اور کئی ایک کی تو نعتیہ کتب بھی منظرِ عام پر آگئیں......لیکن دیکھا گیا کہ علمی حلقوں میں جب بھی کوئی مذاکراہ ہوا اس میں ہر صنفِ ادب پر گفتگو ہوئی۔نہیں ہوئی تو نعت پر کیوں کہ اس کی شرطِ صداقت نویسی اور اخلاص پڑوہی ایک کڑوا گھونٹ تھا جسے ہر ادیب ، شاعر اور اسکالر پینے کے لیے تیار نہ تھا۔

اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی جانب سے مدتوں سہ ماہی ’’ادبیات‘‘ کے نمبر نکلتے رہے لیکن انہیں بھی نعت نمبر نکالنے کی توفیق پچھلے سال ہی ہوسکی۔ پھر بھی یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ عمومی ادب کے حوالے سے بارہ ،تیرہ سو صفحات پر مشتمل نمبر نکالنے والوں نے نعت نمبر کو پانچ سو باون (552) صفحات تک ہی محدود رکھا..........حال (2014 ء)ہی میں ساتویں

عالمی اردو کانفرنس منعقد کی گئی تو آرٹس کونسل کے اربابِ حل وعقد نے کسی دباؤ میں آکر ایک مذاکرہ نعتیہ ادب کے حوالے سے بھی رکھ لیا تھا......اور اب میں حیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ انجمنِ ترقیء اردو کے احباب کو بھی اس صنف شریف کا خیال آیا ہے...... یہ شکوہ لبوں پر آنا تھا کہ سیفؔ کا ایک شعر ذہن کے پردے پر نمودار ہوگیا:

کہتے ہیں قصہء غم ہر انجمن میں جاکر
ہم اہلِ دل بھی کتنے دیوانے ہوگئے ہیں

لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے مجاز بھی یاد آگئے جو کہہ گئے تھے:

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک، ادھر دیکھا تو ہے

اب ذرا موضوع کی طرف آتا ہوں جس کے الفاظ ہیں ......

......''صنفِ نعت، ادبی اور ثقافتی وَرثہ''......

انجمنِ ترقیء اردو میں اہلِ علم کی کمی نہیں ہے جن میں ایسے بھی ہیں جو داغؔ دہلوی کی طرح کہہ سکتے ہیں..........اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ

لیکن معذرت کے ساتھ میں عرض کرنے کی جسارت کررہا ہوں کہ نعتیہ ادب کے حوالے سے موضوع میں الفاظ کی معنوی جہت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ وَرثہ یا وِرثہ...... دونوں طرح درست ہے۔ لیکن اِرث، میراث اور ورثہ کے الفاظ کے معنی میں زندگی کے بجائے موت غالب ہے کیوں کہ ورثہ ''مردے کے مال، میراث اور ترکے'' ہی کو کہتے ہیں۔ میراث میں بڑھوتری کا عنصر نہیں ہوتا۔ وہ یا تو سینت سینت کر رکھی جاتی ہے یا مال کی صورت میں خرچ ہوجاتی ہے۔ تہذیبی وَرثہ بھی زیادہ تر عجائب گھروں میں ملتا ہے۔

اس لیے میری رائے میں ورثہ کے بجائے روایت کا لفظ زیادہ مناسب تھا......

کیوں کہ روایت کے لفظ میں طریقہ، ڈھنگ اور پہلے سے قائم دستور یا رسم کے مفاہیم شامل ہیں۔ روایت میں ماضی کے سرمائے سے حال کا سنگم ہوتا ہے اور مستقبل کے امکانات کی راہ نکلتی ہے۔گویا ''روایت'' ایک سیلِ رواں ہے۔نعتیہ ادب پر گفتگو کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ سے تعلق کا حوالہ دینا ہو تو ہم اقبال کی زبان میں کہہ سکتے ہیں:

ع عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

یعنی' انسانی دنیا میں، جو روایت تُبَّع حِمْیَری نے حضورِ اکرم ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سے ایک ہزار یا سات آٹھ سو سال قبل قائم کی تھی اس کا سرا تھام کر چلنے والے آج بھی فخر سے صنفِ نعت کے خدمت گزار کہلا رہے ہیں۔

تُبَّع حِمْیَری کا ذکر نکلا ہے تو اس کا احوال بھی کچھ عرض کردوں:

تُبَّع حِمْیَری یمن کا بادشاہ تھا۔اس نے یثرب پر حملہ کیا۔ اہلِ یثرب دن بھر تبع کی فوج سے لڑتے اور رات کو ان کی ضیافت کرتے تھے۔ان کے اخلاق سے متاثر ہوکر تبع نے صلح کرلی اور جب صلح نامہ لکھا جارہا تھا تو یثرب کے بنیامین قرظی نے تبع سے کہا ''آپ اس شہر کو فتح نہیں کرسکتے تھے۔ بولا کیوں؟ کہنے لگے، یہ شہر ایک نبی (ﷺ) کی فرودگاہ ہے جو قریش سے ہوگا۔ تبع نے اس پر یہ شعر پڑھا:

القی الیی نصیحته کی ازدجر
عن قریة محجورة بمحمدٌ

(اس نے مجھے نصیحت کی کہ میں اس بستی سے ہٹ جاؤں جو محمد ﷺ کی وجہ سے محفوظ رکھی گئی ہے)۔

تاریخِ نعت گوئی میں اس کے اور اشعار بھی محفوظ ہیں۔اس نے ایک مکان بھی بنوایا تھا جو حضورِ اکرم ﷺ کی ہجرتِ یثرب کے وقت حضرت ابوایوبؓ انصاری کی تحویل میں تھا اور آپ ﷺ کی اونٹنی اسی مکان کے سامنے رُکی تھی۔(۱)

پھر نعت کہنے والوں میں حضرت کعب بن لوئی، قیس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل،

اعشیٰ بن قیس، حضرت عبدالمطلب وغیرہم نے حضورِ اکرم ﷺ کی شان میں اشعار کہے۔ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے کفیل آپ ﷺ کے چچا حضرت زبیر بن عبدالمطلب بنے اور انہوں نے بھی مدحیہ اشعار کہے۔ علامہ قمر رعینی نے ان اشعار کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ملاحظہ ہوں:

محمدؐ میرے بھائی کی نشانی
اسے حاصل ہو عیشِ جاودانی
کمی کچھ مال و دولت میں نہ آئے
ملے عزت، حکومت، کامرانی
رہے مستغنیِ امدادِ اعمام
بوڑھاپے تک پہنچ جائے جوانی(۲)

حضرت بی بی آمنہ سلام اللہ علیہا کے بھی کچھ اشعار ملے ہیں اور حضرت خواجہ ابوطالب کے بھی اشعار متداول ہیں......اس طرح یہ روایت بعد کے ادوار میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شاعری سے مستحکم ہوئی اور عرب سے ایران کے شعراء تک پہنچی ، پھر ہندوپاک میں نعت کا غلغلہ ہوا۔

عنوان میں ایک لفظ'' ادبی'' ہے جس کے معنی یقیناً تخلیقی ادب کے ہیں اور جس پر میں تھامس ڈی کوئینسی کے حوالے سے قدرے تفصیلی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں ۔لیکن اسی عنوان میں ''ثقافت'' کا لفظ بھی آیا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ بات اور توجہ کو مرکوز رکھنے کے لیے ثقافت کی طویل تعریفات میں الجھنے کے بجائے میں فیض صاحب کی کلچر یا ثقافت کے ذیل میں لکھی ہوئی تحریر سے اقتباس پیش کردیتا ہوں، وہ لکھتے ہیں:

''قومی تہذیب کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے ان کی مجموعی شکل و صورت ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس مجموعے کے بنیادی اجزا کیا ہیں؟......اول وہ سب عقیدے، قدریں، افکار، تجربے، امنگیں (Ideals)

یا آدرش، جنہیں کوئی انسانی گروہ یا برادری عزیز رکھتی ہے۔دوم وہ آداب، عادات، رسوم اور طور اطوار جو اس گروہ میں رائج اور مقبول ہوتے ہیں۔سوم: وہ فنون مثلاً ادب، موسیقی، مصوری،عمارت گری اور دستکاری جن میں بھی باطنی تجربے، قدریں،عقائد،افکار اور ظاہری طور اطوار بہت ہی مرصع اور ترشی ہوئی صورت میں اظہار پاتے ہیں''۔(۳)

ثقافت کی اس تعریف کی روشنی میں نعت کو عقیدے،عقیدت اور اس کے ادبی اظہار کی روایت میں رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے۔

اب ذرا لفظ ''ادبی'' پرغور فرمالیجیے!

تھامس ڈی کوئینسی نے (1785-1859)انیسویں صدی میں اپنے مضمون The Meaning of Literature میں ادب کی دو اقسام بتائی تھیں۔ Literature of Knowledge اور Literature of Power معلوماتی ادب اورمؤثر ادب۔(۴)

ادب کو ان دو اقسام میں تقسیم کرنے کا جواز یہ تھا کہ ادبِ عالیہ یا تخلیقی ادب کو عام تحریری مواد سے جدا کرکے دیکھا اور دکھایا جائے۔

شاعری شروع ہی سے تخلیقی ادب کا جزءِ لاینفک رہی ہے۔ اس لیے نعتیہ شاعری کو بھی تخلیقی ادب میں شامل صنف سمجھا جاتا ہے ۔لیکن اس صنفِ شریف میں اور ادب کی دوسری اصناف میں چاہے وہ موضوعاتی ہوں، یا ہیئتی ، یہ فرق ہے کہ دوسری اصناف میں مبالغہ بلکہ ذرا جھوٹ بھی شعری قوت کے ساتھ اچھا لگتا ہے ۔لیکن نعت میں مبالغہ اور جھوٹی خیال آرائی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو نعت وہ واحد صنفِ سخن ہے جس کو [۱]معلوماتی ادب، اور[۲]مؤثر ادب یا Literature of Knowledge اور LLiterature of Power دونوں کا امتزاج قراردیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس صنف میں پیش کی جانے والی اچھی سے اچھی شاعری کو غیر مصدقہ روایت کی روشنی میں لچر قراردیا جاسکتا ہے اور کمزور شاعری کو مضبوط

روایت کی روشنی میں سراہا جاسکتا ہے۔مطلب یہ کہ نعتیہ شاعری کا متن(text) اہم اور بنیادی نوعیت کا ہے جبکہ اس کا اسلوب ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ناقدین کو ادبی سطح پر نعتیہ شاعری کو سراہتے ہوئے علمی سند اور اظہار کی جمالیاتی قدر کوضرور سامنے رکھنا ہے۔

اردو کو چونکہ سب سے پہلے صوفیہ کرام نے اپنایا تھا اس لیے اس میں معرفت کے مضامین اورعشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے اظہار کی روشنی سے مستنیر شعری مرقعے ملتے ہیں۔

دینی اقدار سے مملوکسی بھی ادب کو مٹایانہیں جاسکتا۔اس لیے مجھے باربار اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے :

از اجل ایں قوم بے پروا ستے
استوار از نحن نزلنا ستے (۵)

یعنی بفحوائے آیہء قرآنی یہ طے ہے کہ قرآنِ کریم کی حفاظت ہرحال میں ہونی ہی ہے۔اس لیے مسلمان قوم بھی ہمیشہ زندہ رہے گی کیونکہ اسی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام محفوظ رہے گا۔چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دینی اقدار سے مملو ادب بھی زندہ رہے گا۔

حالی کے مسدس اور عرضِ حال بہ جنابِ سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوات و اکمل التحیات کی مثال سامنے ہے کہ مسدس کے نعتیہ اشعار اور استغاثہ آج بھی اسی طرح زندہ ہیں جس طرح حالی کے عہد میں تھے۔

اردو کے ابتدائی نقوش سے لے کر آج تک لکھی جانے والی بیشتر مثنویات اور مراثی میں حمد کے بعد نعت کے چند اشعار موجود ہیں۔مثنویات پر تو اب تک کام نہیں ہوا تاہم ٫مراثی میں نعتیہ اشعار کی نشاندہی ایک مقالے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے کردی ہے جو نعت رنگ شمارہ نمبر ۵ میں شائع ہو چکا ہے۔اس مقالے میں 64 چونسٹھ مرثیوں کے نعتیہ بند

موجود ہیں۔اس طرح بڑی تعداد میں مرثیہ گوشعراء کی نعت نویسی کا تعارف ہوگیا ہے۔ (۶)

پیام شاہجہاں پوری نے اپنی کتاب ’’جنوبی ہند میں اردو‘ کے ذریعے یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ نظامی اردو زبان کا پہلا مثنوی نگار تھا جس نے مثنوی ’’کدم راؤ پدم راؤ‘‘ لکھ کراولیت کا اعزاز حاصل کیا۔ افسر صدیقی امروہوی اور ڈاکٹر ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق بھی اردو کی پہلی شعری تصنیف ’’مثنوی کدم راؤ پدم راؤ‘‘ ہے تو اس میں بھی حمدیہ اشعار کے بعد نعتیہ اشعار ہی ملتے ہیں۔فخر دین نظامی کی یہ مثنوی ۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ مطابق: ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۵ء کے درمیان لکھی گئی تھی۔اس میں نعت کے بائیس اشعار ہیں۔(۷)

شیخ بہاء الدین باجن کا زمانہ سن ۷۹۰ھ سے ۹۱۲ھ مطابق: ۱۳۸۸ء تا ۱۵۰۶ء ہے۔قاضی محمود دریائی کا زمانہ ۸۷۴ھ تا ۹۴۱ھ مطابق: ۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۴ء ہے۔

نصرتی کے کلام میں بڑی صاف زبان میں نعت ملتی ہے۔دو اشعار ملاحظہ ہوں:

زہے نامور سید المرسلیں
کہ آخر ہے وے شافع المذنبیں
عجب آفرینش کے دریا کا دُر
کہ جس نور تھے بحرِ ہستی ہے پر(۸)

حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ’’پنجاب میں اردو‘ میں شیخ خوب محمد چشتی کے کچھ اشعار کی نشاندہی کی ہے۔

میر انیس کے دادا ، میر حسن(متوفی ۱۲۰۱ھ یا ۱۷۸۶ء) نے مثنوی سحر البیان میں حمدیہ اشعار کے بعد نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ملاحظہ ہوں:

نبیؐ کون یعنی رسولِ کریمؐ
نبوت کے دریا کا دُرِّ یتیم
محمدؐ کے مانند جگ میں نہیں
ہوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں

سلام ان پہ جو ان کے اصحابؓ ہیں
وہ اصحاب کیسے کہ احباب ہیں
خدا نے انہوں کو کہا مؤمنیں
وہ ہیں زینتِ آسمان و زمیں
خدا ان سے راضی رسولؐ ان سے خوش
علیؓ ان سے راضی بتولؓ ان سے خوش
ہوئی فرض ان کی ہمیں دوستی
کہ ہیں دل سے وہ جاں نثارِ نبیؐ(۹)

نثر میں بھی جب کام شروع ہوا تو تقریباً ہر قصے کہانی کے آغاز میں حمد و نعت کے جملے لکھے جاتے تھے۔طوالت سے بچنے کے لیے صرف فسانۂ عجائب سے نثری جملے لکھے جاتے ہیں۔ فسانۂ عجائب غالباً ۱۸۴۶ء کی تصنیف ہے جس میں رجب علی بیگ سرؔور نے بڑی خوبصورت زبان میں نعتِ شہِ کونینﷺ لکھی ہے:

''بعد حمدِ خالقِ جن و بشر ،حاکمِ قضا و قدر، مبدءِ شام و طالعِ سحر ،نعتِ سیدِ کائنات، خلاصۂ موجودات، بہترینِ عالم،برگزیدۂ نوعِ بنی آدم کی ہے۔جس کے چراغِ ہدایت کی روشنی سے تیرہ بخت گم گشتۂ کوچۂ ضلالت براہ راست آئے ۔بتوفیقِ رفیق اور مدارجِ تحقیق کیا کیا مرتبے بلند پائے۔اور منحرف کور باطنوں کو فہمِ ناقص کی کجی اور زَعمِ فاسد نے کیسے کیسے روزِ سیہ دکھائے۔اس کے حق میں یہ حکم آیا ہے ۔بچشمِ غور دیکھو تو اور کسی نے بھی یہ رتبہ پایا ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک سر حلقۂ اولین ،خاتم المرسلین ، مظہرِ صنعتِ کریم احمدِ بے میم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہٖ الطاہرین و اصحابہٖ المکرّمین وسلم''۔(۱۰)

اردو زبان کی تاریخ نعتیہ روایت کا بلا انقطاع تسلسل دکھاتی ہے۔ **رفعنا لک**

ذکرک ......کے اعلانِ ربانی کا اثر یہ تھا اور ہے کہ نعت کا ادبی سفر زبان کے سفر کے ساتھ ساتھ جاری رہا ہے......آج کی شعری تخلیقات میں بلا شبہ نعتیہ تخلیقی سرمایہ دیگر تمام اصناف سے زیادہ ہے۔

میرا دل تو بہت کچھ کہنے کو چاہتا ہے......کیوں کہ مجھے تو اپنا عرصۂ حیات بھی اس ذکر کے مقابلے میں بہت کم لگتا ہے:

کم لگے فرصتِ حیات مجھے
جب کبھی تیرا ذکر چل جائے

(راقم الحروف)

......لیکن وقت اجازت نہیں دیتا۔نعتیہ ادب میں ہر سطح پر کام ہوا بھی ہے اور ہو بھی رہا ہے۔تخلیق، تحقیق اور تنقید کے میدان میں تخلیق کار، محققین اور ناقدین کی فکرِ رسا کے نجوم سے نعتیہ ادب کا آسمان' جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔نعتیہ ادب کی تخلیقی سرگرمیوں میں تو غیر مسلم بھی شریک ہیں۔امید بندھتی ہے کہ نعتیہ ادب کی طرف سے مجرمانہ غفلت کا جو شکوہ آغازِ کلام کے ہنگام' میرے لب پر آیا تھا ، اب اس کی تلافی ہو جائے گی......ان شاء اللہ!!!

مآخذ و منابع:

۱۔تفصیل کے لیے دیکھیے نعت کائنات مرتبہ : راجارشید محمود ، جنگ پبلیکیشنز، لاہور و سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، نعت نمبر شمارہ 101 ، جنوری تا جون 2014 ء،ص 331

۲۔عزؔیز احسن، ڈاکٹر، ہنر نازک ہے، نعت ریسرچ سینٹ، کراچی، جولائی ۲۰۰۷ء،ص ۱۷۴

۳۔فیض احمد فیض، میزان ،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،جدید ایڈیشن ۱۹۸۷ء،ص ۱۵۴

۴۔ Essays of Yesterday and Today, Selected and Edited by Dr. Imdad Husain, Meaning of Literature by Thomas De Quincey , Published by R.H.D. Khalid , Lahore , Page 37

۵۔عزؔیز احسن [ڈاکٹر]مثنوی رموزِ بیخودی کا فنی وفکری جائزہ،نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، بارِ اول مارچ ۲۰۱۱ء، ص189

٦۔صبیح رحمانی، نعت رنگ، شمارہ نمبر ۵، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، فروری ۱۹۹۸ء، مضمون اردو مرثیے میں نعتیہ شاعری کے امتیازات، ڈاکٹر ہلال نقوی، صفحات ۸۰ تا ۱۲۳

۷۔مثنوی نظامی دکنی المعروف کدم راؤ پدم راؤ، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقیء اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی، اشاعتِ اول ۱۹۷۳ء، ص۳۷)......(تاریخِ ادبِ اردو، ص۱۶۰)

۸۔نصرتی۔مؤلفہ: ڈاکٹر عبدالحق۔کل پاکستان انجمن ترقی اردو، کراچی۔اشاعتِ ثانی ۱۹۶۱ء۔ص۳۳

۹۔میر حسؔن دہلوی، مثنوی سحرالبیان، قابل بک ہاؤس ایجوکیشنل پبلیشرز، اردو بازار، لاہور، بارِ اول ۱۹۶٦ء، ص۵۴

۱۰۔رجب علی بیگ سرؔور، فسانہء عجائب، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، پہلی بار ۱۹۶۷ء، ص٦

....

☆ یہ مضمون انجمنِ ترقیء اردو پاکستان، کراچی کے مذاکرے میں پیش کرنے کے لیے لکھا گیا۔ یہ مذاکرہ ہفتہ ۱۷/جنوری ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوا۔وقت کی تنگ دامانی کے باعث مقالے کے چیدہ چیدہ نکات زبانی پیش کیے گئے تھے۔

مطبوعہ: جسارت، سنڈے میگزین، کراچی، 1 اور 8 فروری، 2015ء

نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت!

ادب تنقیدِ حیات ہے۔اصنافِ ادب اپنا الگ الگ تشخص بھی رکھتی ہیں اور مزاج بھی۔فنکار کے لیے اصنافِ ادب کی ہیئت کے حدود کا جاننا بھی ضروری ہے اور ان اصناف کے مزاج سے آگاہ ہونا بھی لازمی ہے۔تب ہی وہ کوئی فن پارہ تخلیق کرسکتا ہے۔فن پارے کی تخلیق، جذبِ دروں کی محتاج ہے لیکن اس کی ہیئت خارجی عوامل کی آگاہی کی مقتضی ہے۔اس لیے جیسے ہی تخلیق کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے ''تنقیدی شعور'' کی مداخلت کا بھی آغاز ہوجاتا ہے۔بات شاعری کی حد تک محدود رکھنے کی غرض سے کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ صنفِ سخن کے انتخاب کے مرحلے پر ہی شاعر یہ طے کرلیتا ہے کہ اسے اپنی شعری استعداد کس صنف کے حوالے سے استعمال کرنی ہے اور اس صنفی ہیئت میں کس بات کو کس اسلوب میں کہنا ہے۔اس مختصر سی گفتگو سے یہ نکتہ تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ کوئی بھی ادب تنقیدی شعور کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

اب آیئے نعت کی طرف!......نعت شعری پیکر میں ڈھالی جاتی ہے اور اس کے لیے کوئی ہیئت مخصوص بھی نہیں ہے۔اصنافِ سخن کے کسی بھی پیکر میں نعتیہ مضمون کی جلوہ آرائی ممکن ہے۔چنانچہ یہاں بھی موضوع کی آگاہی کے ساتھ ساتھ شعری اصناف کے مزاج اور ان کی مقتضیات کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔شاعر جو کچھ لکھے گا اسے بار بار کی خواندگی کے بعد کچھ نہ کچھ تبدیلیوں اور کانٹ چھانٹ کے بعد ہی کوئی حتمی شکل دے گا۔کبھی کوئی لفظ

بدلے گا ، کبھی عروضی اوزان کے خیال سے کسی لفظ کی درست بنت پر غور کرے گا اور کبھی اسلوب میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے نئی نئی تراکیب تراشے گا۔فن پارے کی زبان کی درستگی کے لیے لغت کی پابندیوں کا بھی دھیان رکھے گا!اسلوب میں دلکشی پیدا کرنے کی شعوری کوشش بھی کرے گا۔شعر کے مفہوم کے ابلاغ کا خیال رکھ کر کسی بات کو اس طرح ادا کرنے کی سعی بھی کرے گا کہ سامع تک شاعر کے خیال کی ترسیل ممکن ہوجائے ...... شاعر کے غوروفکر کا یہی عمل ،تنقیدی سرگرمی کے ذیل میں آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اہلِ دانش تخلیق کے لمحہءتولید سے ہی تنقید کا رشتہ جوڑتے ہیں۔

ایسی صورت میں کسی سنجیدہ تخلیق کار کے سامنے نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت کا ذکر کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے مچھلی کے جائے کو تیرنا سکھانے کی کوشش............لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ نعتیہ ادب میں تنقید کا سنجیدگی سے اظہار کرنے کا بیڑا میں نے بھی اٹھا رکھا ہے اس لیے مجھ سے یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ نعتیہ ادب میں تنقید کے کیا معنی ہیں؟ سو میں مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نعتیہ ادب میں تنقید عام ادب کی تنقید سے زیادہ ضروری ، زیادہ اہم اور بہت زیادہ لازمی ہے۔

اردو دنیا میں شاعری کے ثقافتی مظاہر کی بنیاد وقتاً فوقتاً برپا ہونے والے مشاعرے ہیں۔ مشاعروں میں کسی شاعر کو کسی شعر پر بہت زیادہ داد مل جاتی ہے اور کسی شعر پر سامعین خاموش رہتے ہیں۔داد کا سلسلہ شعر کے مفہوم تک سامعین کی ذہنی رسائی کے حوالے سے ہی کم یا زیادہ ہوتا ہے۔شعر کے مفہوم تک رسائی کا معاملہ بذاتِ خود تنقیدی عمل ہے جو سخن فہمی کے شعور کے ساتھ بے ساختگی سے اپنا اظہار کرواتا ہے۔نعتیہ مشاعروں میں بھی کسی شاعر کو کسی شعر پر بہت داد ملتی ہے اور کسی شعر پر سامعین خاموش رہتے ہیں ۔مختلف شعراء کو ملنے والی داد میں کمی بیشی بھی گو کہ شعر کی سماعت کے بعد فوری طور سے ردِعمل کے مظہر کے طور پر سامنے آتی ہے لیکن سامع یا سامعین کا یہ ردِعمل بھی تنقیدی شعور ہی کا غماز ہوتا ہے۔ایسی صورت میں نعت پر تنقید کے نام سے چونکنے والا کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ

اسے نعتیہ مشاعروں میں بھی بعض اشعار بہت اچھے لگے اور بعض معمولی !کوئی بھی دیانتدار سامع یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ہر شعر پر یکساں پسندیدگی کا اظہار کیا یا ہر شاعر کو یکساں داد دی۔لہٰذا ثابت ہوا کہ جولوگ نعتیہ ادب میں تنقیدی سرگرمیوں کے قائل نہیں ہیں وہ بھی غیر محسوس طور پر نعتیہ شاعری کی سماعت (یاقرائت) کے وقت کچھ نہ کچھ معیارات ذہن میں رکھ کر ہی اشعار کو سراہتے ہیں ۔ اچھے اور کم اچھے شعر میں تمیز کرکے ہی کسی شعر کی تحسین کرتے ہیں اور کسی شعر پر سکوت اختیار کرتے ہیں۔ وہ جو صائب نے کہا تھا ؎

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعرا را
تحسینِ نا شناس و سکوتِ سخن شناس

(اے صائب! دو چیزیں کسی شعر کی قدر کو کم کردیتی ہیں۔ یا تو کوئی کم فہم شعر کی تعریف کردے یا کوئی سخن فہم خاموشی اختیار کرلے!)

اس شعر میں بیان کردہ حقیقت کے مظاہرے عام مشاعروں میں بھی سامنے آتے ہیں اور نعتیہ نشستوں میں بھی......تحسین وسکوت کا یہی مظاہرہ نعتیہ اشعار کی قراءت کے وقت بھی ہوتا ہے۔چنانچہ غیرمحسوس تنقیدی عمل تو نعت کے اشعار کی تخلیق کے مرحلے سے لے کر سماعت اور قراءت کے مرحلوں تک میں ہمیشہ سے جاری ہے ۔

ایسی صورت میں صرف تحریری تنقیدی عمل سے گریز کا مشورہ دینے والوں کو اپنے فکری تضاد کا خود جائزہ لینا چاہیے۔نعتیہ اشعار کی تخلیق، ان کی سماعت یا قراءت کے ہنگام جو تنقیدی عمل غیرمحسوس طور پر جاری ہوتا ہے اگر وہی عمل نعتیہ ادب کے مطالعے کے وقت شعوری طور پر اختیار کرلیا جائے تو اس میں کونسی غلط بات ہے؟ اشعار کی پسندیدگی کے محرکات تو ہر مرحلے پر یکساں ہی رہتے ہیں ۔البتہ سنجیدہ مطالعے میں اشعار کی پسندیدگی یا نا پسندیدگی کے واضح معیارات اور اصول سامنے لائے جاتے ہیں اور شعر کی تحسین یا عدم تحسین کا منطقی جواز پیش کیا جاتا ہے...... یہ تو ہوئی عمومی بات۔اب آیئے نعت کے حوالے سے اٹھنے والے سنجیدہ سوالوں کی طرف۔

''نعت'' شاعری کی وہ موضوعاتی صنف ہے جس کی حدود ماورائی ہیں۔ اس کے لیے شعریت کے اصولوں کو بھی بروئے کار لانا پڑتا ہے اور شریعت کے ابعاد کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔نعت میں یا تو حضورِ اکرم ﷺ سے براہِ راست تخاطب ہوتا ہے، کبھی استغاثے کی صورت میں کبھی اظہارِ عشق کے نام پر، یا نعت میں آپ ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کا بیان ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کے فضائل و شمائل کا ذکر ہوتا ہے۔حضورِ اکرم ﷺ سے متعلق افراد، اصحاب، اشیاء، بستیوں اور شہروں کا تذکرہ ہوتا ہے یا اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے ہی نبوت کی ابتداء ہوئی اور آپ ﷺ پر ہی نبوت کی انتہا ہوئی ۔ آپ ﷺ کے معجزات کو بیان میں لایا جاتا ہے یا آپ ﷺ کے غزوات کا ذکر کیا جاتاہے۔ دینِ اسلام کی خوبیوں کو اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ یہ ظاہر کیا جاسکے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات کسی فلسفی کی نظریاتی سطح کی تعلیمات نہیں ہیں بلکہ عملی زندگی کے ہر مرحلے کے لیے رہنمائی کرنے والی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیمات پہلے حضورِ اکرم ﷺ کے عمل میں ڈھلی ہیں تب امت کو ان پر عمل کی دعوت دی گئی ہے تاکہ امت میں قیامت تک پیدا ہونے والا ہر فرد ان تعلیمات کو عملی سانچے میں ڈھالتے ہوئے اپنے نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ سامنے رکھے!

یہاں نعتیہ شاعری کے تمام موضوعات کا احاطہ نہ تو ممکن ہے نہ ان کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنا میرا مقصد ہے۔ میں تو اس نشست میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نعتیہ شاعری کرنے والوں کو پہلے ''شعر'' کی حقیقت سے آگاہ ہونا پڑے گا اور پھر حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت کے صحیح خد و خال کی جان کاری درکار ہوگی۔اس لیے کوئی شاعر، توسنِ شاعری کو صرف ''شعور کی رَو'' کے میدان میں بے لگام نہیں چھوڑسکتا۔نعتیہ موضوع کی نزاکت کے ادراک ہی نے عرفی جیسے قادرالکلام شاعر سے یہ کہلوایا تھا:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قلم را

نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے — عزیز احسن

(اے عرفی جلدی مت کر کہ یہ نعتیہ ادب کی شاہراہ ہے کوئی صحرا نہیں ہے ۔یہاں تو قلم کو تلوار کی دھار پر چل کر راستہ طے کرنا ہے اس لیے آہستہ چل)۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی کرتا چلوں کہ نعت گوشعراء کے ہاں جو اس طرح کا عجز بیاں ملتا ہے کہ ہم نعت کا حق ادا نہیں کرسکتے ۔رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے وغیرہ وغیرہ ......اشعار تو ہزاروں ہیں لیکن اختصار کی غرض سے غالب ہی کے اس شعر کو دیکھیے وہ کہتا ہے :

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کآں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

(اے غالب! کارِ ثنائے رسول ﷺ، اللہ پر چھوڑ تے ہیں کہ وہی آپ ﷺ کا مرتبہ جانتا ہے) ......نعتیہ ادب کی تخلیق میں شاعروں کا یہ عجز ہی دراصل ان کے تنقیدی شعور کا اظہار ہے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے جسے حدیث کے طور پر بھی بیان کیا جاتا ہے''اللہُ جمیلٌ و یحب الجمال''۔ اللہ تعالیٰ حسنِ تمام ہے اور حسن ہی کو پسند فرماتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تھا: **''فیم الجمال یا رسول اللہ!''** (اے اللہ کے رسول ﷺ! حسن و جمال کا دارومدار کس چیز پر ہے؟) تو نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا تھا: ''فی اللسان'' (زبان پر)!

(نقوش رسول نمبر۔ج ۸،ص ۳۴۷)

اس حدیث سے زبان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ایسی صورت میں شاعروں کے لیے یہ بھی لازمی ہوجاتا ہے کہ وہ نعتیہ ادب کی تخلیق کے وقت زبان و بیان میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔زبان کا حسن پیدا کرنے کے لیے زبان کا مزاج جاننا ضروری ہے۔زبان میں جو الفاظ ہوتے ہیں وہ زندہ شخصیتوں کی طرح ہوتے ہیں۔جس طرح انسانی معاشرے میں اچھے اور برے دونوں طرح کے انسان ہوتے ہیں اسی طرح معاشرے میں

بولی جانے والی زبانوں میں اچھے اور برے الفاظ ہوتے ہیں۔اس لیے اچھے موضوع کے بیان کے لیے اچھے الفاظ کا چناؤ لازمی ہوجاتا ہے۔یہ تو طے ہے کہ نعت ایک اچھا موضوع ہے۔اس لیے نعت گو شاعر کو خیال کی طہارت، فکر کی نزہت و نظافت، تخیل کی رفعت اور بیان کی عفت کا خیال رکھنا ضروری ہوجاتا ہے۔خیال کی اصابت کے لیے اسے قرآن و احادیث اور آثارِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ذخیرے سے بھی استفادہ کرنا ہوگا اور تاریخِ اسلام کے مطالعے کی بھی ضرورت ہوگی۔ بیان کی عفت کے لیے لفظوں کی پرکھ کی استعداد پیدا کرنی ہوگی۔نعت میں اپنے احساسات کے اظہار میں تو صرف احساس کی پاکیزگی اور اظہار کی شائستگی ہی درکار ہوگی لیکن نبی علیہ السلام یا آپ ﷺ کی تعلیمات کے حوالے سے جو بات بھی کی جائے گی اس کے لیے سند درکار ہوگی۔ظاہر ہے یہ سند بغیر کاوش کے شاعر کے علم میں نہیں آسکتی ہے۔

فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے کہ ''جس نے میرے متعلق قصداً جھوٹ بات کہی تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے''۔

اتنی سخت حدیث کی موجودگی میں کون صحیح العقیدہ مسلمان ایسا ہوگا جو اپنی من مانی بات کو حضورِ اکرم ﷺ سے منسوب کرنے کی جسارت کرے؟

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ تنقید کیا ہے؟

ڈاکٹر سید عبداللہ تنقید نگاری کا مقصد اصلی ہی ادب کی قدر شناسی Evaluation قرار دیتے ہیں جو دو بنیادوں پر ہوتی ہے (۱) بر بنائے حسن اور (۲) بر بنائے افادہ۔

یعنی تنقیدی عمل کی بنیاد ''ادب'' کے مطالب کی آگاہی اور اس کے اظہار پر قائم ہے۔

عربی: عربی لغات میں نَقَدَ ، نَقْداً و تَنْقَادًا کے معانی ہیں سِکّوں (دراہم) کو پرکھنا۔کھوٹے کھرے کو جانچنا۔ نَقْدًا و انتقادًا ۔ الدَّراھِمَ۔

فارسی: فارسی لغات میں ''انتقاد'' کا مطلب ہے : ا۔نقد لینا (۲) بھوسے سے

دانے جدا کرنا، غلہ صاف کرنا۔(۳) پرکھنا (۴) تنقید کرنا۔

انگریزی: انگریزی میں تنقید یا انتقاد کے لیے CRITICISM کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

Fallon's اردو انگریزی ڈکشنری میں لکھا ہے: Criticism, n : critical examination دقیقہ شناسی۔دقیقہ سنجی۔حسن و قبح کی دریافت۔[تبصرہ۔نقد۔تنقیدی مضمون۔نکتہ چینی۔انتقاد]۔۔۔ نکتہ چینی۔حرف گیری۔خردہ گیری۔کسی کتاب کا سختی کے ساتھ عیب نکالنا یا بتانا۔

پینگوین انگریزی ڈکشنری میں تحریر ہے: Criticism [kRitisizm] n art or process of judging merits of artistic or literary work; analysis or review of such work; principles guiding critic's method; expression of unfavourable opinion, pointing out of faults.

Critic [kRitik] n expert judge of literary or artistic merit; professional reviewer of books, drama etc; one expert in study of manuscripts and texts; severe judge, fault.finder.

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہے: ''عربی میں نقد یا انتقاد کے بنیادی معنی کھوٹا کھرا پرکھنا ہے۔یونانی زبان میں Krinein کا مطلب ہے: ''To Judge or to discern''۔انگریزی کتابوں، لغات اور دائرۃ المعارف کے مطالعے سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے مندرجہ ذیل نکات اخذ کیے ہیں:

☆ تنقید کامل بصیرت و علم کے ساتھ ،موزوں و مناسب طریقے سے، کسی ادب پارے یا فن پارے کے محاسن و معائب کی قدر شناسی یا اس کے بارے میں ''حکم لگانا'' [فیصلہ صادر کرنا] ہے۔ Webster, New International, 2nd ed:-

☆ آئی۔اے۔رچرڈز کا خیال ہے کہ تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ، اس کی مدلل توضیح اور بالآخر اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔

☆تنقید فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے کہ ''شاعری کیا ہے؟'' اس کے فوائد و وظائف کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کی تسکین کرتی ہے؟ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ ۔۔۔یا پھر یہ اندازہ لگا تا ہے کہ کوئی شاعری یا نظم اچھی ہے یا بری ہے۔(ٹی ایس ایلیٹ)

اردو:اردو لغات میں ''تنقید'' (فت ت، سک ن، ی مع) کے معانی ہیں:

(i)ایسی رائے جو برے بھلے یا صحیح اور غلط کی تمیز کرادے، پرکھ، چھان بین، کھوٹا کھرا جانچنا۔

نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''ادبیات کے مطالعے کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم چیز جو نہ صرف اپنے ذوق کی تسکین بلکہ دوسروں کے نتائج فکر کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے بھی از بس ضروری ہے کہتے ہیں اس کا ماخذ یونانی لفظ ہے، جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔ اردو میں عام طور پر اس کا ترجمہ تنقید کیا جاتا ہے، لیکن زیادہ صحیح لفظ نقد یا انتقاد ہے جس کا مفہوم پرکھنا یا جانچنا ہے اور ہر وہ شخص جو یہ خدمت انجام دیتا ہے اسے نقاد کہتے ہیں''۔

حامد اللہ افسر رقم طراز ہیں:

''لفظ تنقید عربی صرف ونحو کے اعتبار سے صحیح نہیں ، اس کی جگہ نقد یا انتقاد ہونا چاہیے۔لیکن اردو میں اب یہ لفظ اس قدر رائج ہوگیا ہے کہ اس کی جگہ دوسرے لفظ کا استعمال مناسب نہ ہوگا۔جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اسے صحیح سمجھنا چاہیے''۔

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی تنقید کے منصب پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''تنقید کے مختلف منصب بتائے گئے ہیں۔تحسین، تشریح، حسن و قبح کی توضیح، تجزیہ،فن پارے کی قدر کا تعین وغیرہ۔مگر تنقید کا سب سے

مفید کام یہ ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ تخلیقی بنانے کے متعلق سوال اٹھاتی ہے''۔

سید وقار عظیم رقم طراز ہیں:

'' تنقید ، اچھائی برائی جانچ پرکھ کی ایسی کسوٹی ہے جس میں اصول و ضابطے بھی کام کرتے ہیں اور ذاتی پسند اور ناپسندیدگی بھی'' ۔

مولوی نجم الغنی، رامپوری نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''بحرالفصاحت'' میں جہاں شعری اصناف کو ہیئت کے اعتبار سے غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کی صورت میں تقسیم کرکے بیان کیا ہے وہیں شعر کے معنوی اوصاف کے حوالے سے بھی اصنافِ شعر کا ذکر کیا ہے۔شعر کے معنوی جمال کی یہ تفصیل دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے شاعری کو کن کن زاویوں سے پرکھا ہے اور کس عرق ریزی سے اس کے صوری و معنوی حسن کو اجاگر کرکے، شعر کی ہر معنوی سطح کو ایک نام دیا ہے۔مثلاً

(۱) شعر مطبوع: ایسا شعر جو پسندیدہ وزن میں بنایا جائے جیسے مومن کا شعر

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے، گل شمع شبستاں ہوں گے!

(۲) نا مطبوع: جس کا وزن ثقیل ہو جیسے:

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

(غالب)

(۳)ملائم: ایسا شعر جس کے الفاظ آسان اور شیریں اور دل پسند ہوں، جیسے

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھ اے انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا!

(۴) متنافر، ملائم کی ضد، جیسے

ترے عہد میں ہیں معطل بتوں کے
سہام جفون و سیوف حواجب

(منیرؔ)

(۵) ایسا شعر جس کے لطائف و معانی سمجھنا آسان ہو جیسے میر تقی میرؔ

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

(۶) سہل شعر کی ضد منعقف (سیدھے ہاتھ سے پھر جانے والی) کہلاتی ہے، جیسے غالبؔ

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

(۷) سہلِ ممتنع: لغت میں سہل آسان کے معنی میں ہے اور ممتنع دشوار کے معنی میں۔اصطلاح میں ایسے شعر کو کہتے ہیں جس کی مثال بنانا دشوار ہو، اگرچہ بظاہر سہل معلوم ہوتا ہے، جیسے بقاؔ

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں
اس کا میں چاہنے والا ہوں بقا، واہ رے میں(۸)

حزل: لغت میں تمام اور بڑے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں ایسے شعر کا نام ہے جس میں الفاظ عمدہ اور زوردار ہوں، ان کی نشست مضبوط ہو۔ معانی عالی اور متین ہوں۔ پھس پھسے الفاظ اور پھسپنڈی بندش سے پاک ہو۔لفظاً اور معناً اس میں کسی طرح کا نقصان متصور نہ ہو، جیسے غالبؔ

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا!

(۹) مرتجل: ارتجالاً بلا سوچے سمجھے فی البدیہہ شعر بنانا جیسے ناسخ نے ایک مصرعہ کہا:

ع ہے چشم نیم باز، عجب خواب ناز ہے

اور دوسرے مصرعے کی فکر میں تھے کہ خواجہ وزیر آگئے۔خاموشی کا سبب پوچھا۔ناسخ نے مصرعہ پڑھا تو انہوں نے فی البدیہہ مصرعہ کہدیا:

ع فتنہ تو سو رہا ہے، درِ فتنہ باز ہے

(۱۰) فکری: یعنی وہ شعر جو غور و فکر کے بعد بنایا جائے۔ یہ مرتجل کی ضد ہے۔

علمی ذخیرے کی اس بانگی سے ہمیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ تنقید ہی دراصل کسی تحریر کے حسنِ معنوی اور جمالِ صوتی کی پرکھ کا نام ہے۔حسن کے ساتھ ہی اگر کسی شاعری میں کچھ معنوی یا صوتی نقائص رہ گئے ہوں تو ان کی نشاندہی بھی تنقید ہی کے ذیل میں آتی ہے۔

نعت چونکہ شعرِ عقیدت کی شکل میں موزوں ہوکر صورت پذیر ہوتی ہے اس لیے اس شعری ذخیرے کو تنقید سے بالا قرار دینے کا مطلب ہے کہ اس شعری چمن کی تہذیب کا عمل روک کر اسے خزاں کے بے رحم ہاتھوں میں دیدیا جائے۔

موضوع بہت بڑا اور وقت بہت کم ہے اس لیے صرف اشارۃً عرض کیے دیتا ہوں کہ اللہ رب العزت نے شاعری کے حوالے سے واضح فرمادیا کہ یہ علم اس نے اپنے محبوب، نبی علیہ السلام کو قطعی نہیں سکھایا کیوں کہ یہ شعری فن آپ ﷺ کے شایانِ شان نہیں تھا:

''وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ط''

''اور نہیں سکھائی ہم نے اس نبی (ﷺ) کو شاعری اور نہیں تھی اس کے شایانِ شان یہ چیز''۔

نری شاعری کے بارے میں بھی اللہ رب العزت نے کوئی دل خوش کن فیصلہ نہیں دیا' بلکہ فرمایا:

''وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ O اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ O وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ O اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ط وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ O

اور رہے شعراء تو چلا کرتے ہیں ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگO کیا نہیں دیکھتے ہو تم کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیںO اور بلا شبہ وہ کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیںO مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور کیے انہوں نے نیک عمل اور ذکر کیا اللہ کا کثرت سے اور بدلہ لیا انہوں نے اس کے بعد کہ زیادتی کی گئی ان پر اور عنقریب معلوم ہوجائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے زیادتی کی کہ کس انجام سے وہ دوچار ہوتے ہیں''۔

سورۂ العصر میں تمام بنی نوعِ انسان کو خسارے میں بتایا گیا تھا اس کے بعد چار شرطوں کے پورا کرنے والے انسانوں کو خسارے سے محفوظ قرار دیا گیا۔بعینہٖ اسی طرح شعراء کی پوری برادری کو ایسا ظاہر کیا گیا جس کے پیچھے چلنے والے لوگ سب گمراہ ہیں(اورخود شعراء بدرجہء اولیٰ گمراہ ہیں)۔پھر سورۂ العصر کا اسلوب برقرا رکھتے ہوئے ایسے شعراء کومستثنیٰ کیا گیا جو ایمان لا کر اعمالِ صالحہ کے عملی مظاہرے کریں۔لیکن سورۂ الشعراء میں موقع کی مناسبت سے جو تیسری شرط رکھی گئی وہ اللہ کے ذکر کی کثرت ہے۔ کیوں کہ شعراء اپنے کلام میں جس قدر بھی اللہ کا ذکر کریں گے، وہ دین کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنے گا۔حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے تفسیری حاشیے میں ''وَذَکَرُ ا اللّٰہَ کَثِیْرًا'' کی تشریح میں ''فی الشعر'' کے الفاظ ہی لکھے ہیں۔چوتھی شرط یہ لگائی کہ دنیائے کفر کی جانب سے جو ہرزہ سرائی اسلام اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے حوالے سے کی جائے ، اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ سیدابولاعلیٰ مودودی نے ظلم کے لیے بدلہ لینے کے ذکر سے مملو آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:......''اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا''۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بدلہ لیتے وقت بھی اعتدال کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ، یہاں بھی مبالغہ آمیز جواب کی راہ مسدود کردی گئی ہے۔

سورۂ العصر کا خطاب پوری بنی نوعِ انسان سے تھا اور سورۂ الشعراء کی مذکورہ آیات میں شاعروں کی پوری برادری کو مخاطب کیا گیا ہے۔دونوں مواقع پر اسلوب کی یکسانیت اس بات کی غماز ہے کہ ایمان، اعمالِ صالحہ، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی جو اہمیت بنی نوعِ

انسان کے لیے ہے۔انسانی معاشرے کے لیے''شاعروں'' کے افعال یعنی ان کے اشعار کی اہمیت ویسی ہی ہے ۔

یہ بات بھی مشہور ہے کہ جب سورۂ شعراء کی محولہ بالا آیات نازل ہوئیں تو ان میں استثنائی آیات نہیں تھیں، اس پر عبداللہ بن رواحہؓ ، کعبؓ بن مالک اور حسانؓ بن ثابت وغیرہم ،حضور اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض پرداز ہوئے:''یا رسول اللہ! اللہ نے یہ آیت نازل کی ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہم شاعر ہیں،اب ہم تو غارت ہوگئے۔اس پر اللہ نے آیت ''اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ ا......نازل فرمائی۔رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو طلب فرمایا اور یہ آیات پڑھ کر سنائیں''۔

مزید برآں شعراء کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت نے اسلامی معاشرے کے ہرفرد کو اس بات کا مکلّف بنایا کہ وہ نبی علیہ السلام کی رفعتِ شان کا لحاظ کرتے ہوئے، آپ ﷺ سے تخاطب کے آداب کا خیال رکھے۔ارشاد ہوا :

''یٰٓاَ یُّھَا ا لَّذِیْنَ اٰمَنُوْ ا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَا لُکُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَO اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُوْلٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ا مْتَحَنَ ا للّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ط لَھُمْ مَّغْفِرَ ۃٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ O اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّ رَ آ ءِ ا لْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ O

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو نہ بلند کرو اپنی آوازیں اوپر نبی کی آواز کے اور نہ اونچی کرو اپنی آواز اس کے سامنے بات کرتے وقت جیسے اونچی آواز میں بولتے ہو تم ایک دوسرے سے،کہیں ایسا نہ ہو کہ غارت ہوجائیں تمہارے اعمال اور تمہیں خبر بھی نہ ہوO بلا شبہ وہ لوگ جو پست رکھتے ہیں اپنی آواز رسول اللہ کے حضور، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے تقویٰ کے لیے ان کے لیے ہے مغفرت اور اجرِ عظیمO درحقیقت وہ لوگ جو پکارتے ہیں تمہیں حجروں کے باہر سے ان میں سے اکثر بے عقل ہیں O

ذو معنی الفاظ کے استعمال کی ممانعت اس طرح فرمائی:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَقُوۡلُوا انۡظُرۡنَا وَاسۡمَعُوۡا ط......اے لوگو جو ایمان لائے ہو، راعنا مت کہا کرو، بلکہ اُنۡظُرۡ نا کہو، اور توجہ سے بات کو سنو!

شعراء کی رہنمائی کے لیے،قرآنِ کریم کی بہت سی آیات سے استنباط کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس وقت یہ ممکن نہیں ہے کہ تفصیلی مطالعہ پیش کیا جائے ۔ اس لیے چند احادیثِ نبوی کا اجمالاً جائزہ لیتے ہیں کہ شعراء کے لیے حضورِ اکرمﷺ کے اسوۂ حسنہ میں کیا رہنما اصول ملتے ہیں؟

قرآنِ کریم میں جو کچھ فرمایا گیا وہ نظری (Theoretical) ہے ۔ قرآنِ کریم میں دیئے گئے احکامات اور منشائے رب کی عملی تفسیر حضورِ اکرم ﷺ کے عمل(حضورﷺ کا ذاتی فعل یا دعوتِ عمل اور اسلامی معاشرے کی تشکیل میں آپﷺ کی عملی رہنمائی)، قول(حضورِ اکرمﷺ کی ملفوظی حدیث) اور تقریر(کسی معاملے کو ملاحظہ فرما کر کوئی حکم صادر فرمانے کے بجائے حضورِ اکرمﷺ کا سکوت اختیار کرلینا) سے ہوتی ہے۔ اس لیے شعرو شاعری اور شعراء کے ساتھ حضورِ اکرم کے رویئے کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا یا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں کس قسم کی شاعری پسندیدہ ہے اور کس قسم کی شاعری کو ناپسند فرمایا گیا ہے۔

قرآنِ کریم میں شعر و شاعری اور شعراء کے لیے حزم و احتیاط کے جو اصول لفظوں میں بیان کیے گئے ہیں ، اللہ کے نبی جنابِ رسالت مآبﷺ نے عملی طور پر ان اصولوں کی نگہداری کا مظاہرہ فرما کر دنیائے اسلام میں شعروشاعری کے آفاقی اصولوں کونقش کالحجر کردیاہے۔

امام ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب العمری رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ شریف میں کچھ احادیث ''بَابُ الۡبَیَانِ وَالشِّعۡرِ''(بیان اور شعر کا بیان) کے تحت جمع کی ہیں۔ہم ان احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے کچھ یہاں نقل کرتے ہیں:

١ .''قَالَ رَسُوۡ لُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الۡبَیَانِ لَسِحۡرًا (رواہ البخاری)

٢.وَعَنۡ اُبَیِّ بِنۡ کَعۡبٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ ا لشِّعۡرِ حِکۡمَۃً(مُتَّفِقٌ عَلَیۡہِ)

٣.وَعَنِ ابۡنِ مَسۡعُوۡدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی ا للّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ ھَلَکَ الۡمُتَنَطِّعُوۡنَ قَالَھَا ثَلَا ثًا (رواہ مسلم)

۴.قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الۡمُؤمِنَ یُجا ھِدُ بِسَیۡفِہٖ وَلِسَانِہٖ وَالَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیدِہٖ لَکَاَ نَّمَا تَرۡ مُوۡ نَھُمۡ بِہٖ نَضۡحَ ا لنَّبۡلِ .(رواہ فی شرح السنۃ)

ا۔''رسول اللہﷺ نے فرمایا بعض بیان سحر ہوتا ہے''۔

٢۔ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض اشعار حکمت ہوتے ہیں۔

٣۔ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہا رسول اللہﷺ نے فرمایا کلام میں مبالغہ کرنے والے ہلاک ہوگئے یہ کلمات تین مرتبہ فرمائے۔روایت کیا اس کومسلم نے۔

۴۔رسول اللہﷺ نے فرمایا مومن شخص کفار کے ساتھ اپنی تلوار اور زبان کے ساتھ جہاد کرتا ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم کفار کوشعر اس طرح مارتے ہو جس طرح تیر مارا جاتا ہے۔(روایت کیا اس کوشرح السنۃ میں)

حکمت کی باتوں کی شعروں میں موجودگی کو جنابِ رسالت مآب محمد مصطفےﷺ نے خوب سراہا ہے۔اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

عنترۃ بن شداد العبسی کا ایک شعر آپ نے سماعت فرمایا:

وَلَقَدۡ اَبِیۡتُ عَلَی الطَّوٰی وَاَظَلُّہٗ
حَتّٰی اَنَالَ بِہٖ کَرِیۡمَ الۡمَا کَلِ

میں دن بھر بھوکوں گزارتا لیتا ہوں اور رات بھی،کھانا اس وقت کھاتا ہوں جب عزت کی روٹی ملے۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:ایسا کوئی بدوی نہیں ہے جس کے اوصاف میرے سامنے بیان کیے گئے ہوں اور مجھے اس کے دیکھنے کی خواہش ہوئی ہو، سوا عنترہ کے''۔

حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ نے حضورِ اکرمﷺ کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا۔ وہ مدحیہ قصید ''بانت سعادُ'' اور قصیدۂ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔اس قصیدے میں جب یہ شعر آیا تو حضورِ اکرمﷺ نے اس میں اصلاح فرمائی اور شاعر کو اپنی چادر عطا فرمادی:

''ان الرسول لنور یستضاء بہٖ
وصارم من سیوف الھند مسلول''

''رسول اللہ (ﷺ)ایک نور ہیں جن سے اجالا حاصل کیا جاتا ہے، اور وہ نور ایک مضبوط فولاد کی بے نیام تلوار کے مانند ہے''۔

شاعر نے ''سیوف الھند'' کہا تو حضور اکرمﷺ نے فرمایا ''سیوف اللہ'' کہو۔اس واقعے کو علامہ اقبال نے مثنوی رموزِ بیخودی میں نظم کیا ہے:

پیشِ پیغمبرؐ چو کعبؓ پاک زاد
ہدیہء آورد از ''بانت'' سعاد
در ثنائش گوہرِ شب تاب سفت
سیف مسلول از ''سیوف الھند'' گفت
آںؐ مقامش بر تر از چرخِ بلند
نامدش نسبت باقلیمے پسند
گفت ''سیف ِ من سیوف اللہ'' گو
حق پرستی، جز براہِ حق مپو

(ایک پاک فطرت حضرت کعبؓ نے حضور اکرمﷺ کی شان میں ''بانت سعادُ'' کے عنوان سے قصیدہ پیش کیا۔اس قصیدے میں گویا الفاظ کے موتی رولے تھے۔ایک جگہ

آپﷺ کو ہندی تلواروں میں سے برہنہ تلوار کی تشبیہ دی تو آپﷺ نے ،جن کا رتبہ آسمانوں سے بھی بلند ہے، کسی ملک سے اپنی نسبت کو پسند نہیں فرمایا۔انہیں اصلاح دیتے ہوئے فرمایا کہ ''سیف من سیوف اللہ'' کہو۔تم حق پرست ہو، سوائے حق پر چلنے کے دوسری راہ اختیار مت کرو)۔

ایسے تمام اشعار جو حضورِ اکرمﷺ کے سامنے پڑھے گئے اور آپ نے انہیں سراہا یا ان کے اسالیب و مفاہیم کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار نہیں فرمایا ان تمام اشعار کے مافیہ (content) اور طریقِ اظہار کو دیکھ کر بھی شعر گوئی کے لیے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔حضرتِ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضورِ اکرمﷺ کے درباری شاعر تھے۔انہوں نے حضورِ اکرمﷺ کی پسندیدگی کا خیال کر کے ہی شعراء کی رہنمائی کے لیے یہ فرمایا تھا:

وان احسن بیتٍ انت قائلہ
بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

(اور بے شک سب سے اچھا شعر جو تم کہو وہ ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو لوگ کہیں سچ کہا) (حقیقت اور سراب۔ص۷۷)

اس شعر کے آئینے میں شعراء جب اپنا کلام دیکھیں گے اور نقادانِ ادب کسی شعر کے مافیہ کو پرکھیں گے تو وہ عمل یقیناً ایسا تنقیدی عمل ہوگا جس کے لیے تحسین کا سلسلہ دنیا سے عقبیٰ تک پھیلا ہوا دکھائی دے گا!

شعر گوئی کی صلاحیت کو محض حظِ نفس کے لیے استعمال کرنے والوں کو حضورِ اکرم کا وہ تبصرہ نہیں بھولنا چاہیے جو آپﷺ نے امراء القیس کے کلام پر کیا تھا۔آپﷺ نے اس کا کلام سن کر فرمایا تھا ''اشعرالشعراء و قائد ہم الی النار'' (وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے)۔

اور حرفِ آخر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ پرنور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر درود بھیجنے کا جو حکم سورۂ احزاب کی آیت ۵۶ میں دیا ہے:

''اِنَّ ا للّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓاَ يُّهَاا لَّذِيْنَ اٰمَنُوْاصَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًاO

(بلا شبہ اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر،اے لوگو جو ایمان لائے ہو درود بھیجو ان پر اور خوب سلام بھیجا کرو)۔تو اس حکم کی بجا آوری کے ذیل میں نعتیہ شاعری بھی آتی ہے کہ یہ بھی حضورِ اکرمﷺ پر درود بھیجنے ہی کی ایک شکل ہے۔

جب عام شاعری کے بارے میں ہم شعراء کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ:

'شاعری تمام علم انسانی کی جان اور اس کی لطیف ترین روح ہے۔شاعری جذبات کی وہ پر جوش علامت ہے جو تمام علم و حکمت کے چہرے میں نمایاں ہوتی ہے'۔(ورڈس ورتھ)

تو کیا نعتیہ شاعری کے حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شاعری علمِ انسانی سے کوئی مختلف شے ہے؟......ظاہر ہے اگر عام شاعری علمِ انسانی کی جان ہے تو نعتیہ شاعری تو علم و عرفان و آگہی کی جان کی بھی جان ہے۔ایسی صورت میں نعتیہ شاعری کے تخلیقی لمحے اور تحسینی ساعت کو تنقیدی شعور سے بے بہرہ کیسے رکھا جاسکتا ہے؟

قرآنِ کریم کی آیات اور رسول اللہﷺ کی اصلاحات اور آپ کے پسندیدہ اشعار کی خواندگی کی روشنی میں بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ نعتیہ ادب میں تنقید انتہائی درجہ ضروری ہے۔اس کی اہمیت کے لیے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیﷺ کی جناب میں لب کشائی کے آداب بھی سکھائے ہیں اور ذو معنی الفاظ کے استعمال کی ممانعت بھی فرمائی ہے اور خود جنابِ رسالت مآبﷺ نے اشعار سماعت بھی فرمائے ہیں اور اصلاح بھی دی ہے۔

حضورِ نبی کریمﷺ نے ،کفارِ قریش کے ہجویہ اشعار کے جواب کے لیے کئی شاعروں میں سے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا تھا۔یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضورِ اکرمﷺ کی مدح اور آپ کے خلاف ہونے والے مذموم پروپیگنڈے کا جواب

نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے   عزیز احسن

دینے کے لیے اعلیٰ شعری صلاحیتیں رکھنے والے شعراء ہی کی ضرورت تھی۔عرب معاشرہ جس میں تقریباً ہر فرد کی طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل تھی اور عربوں کو اپنی زبان دانی پر ناز بھی تھا۔اس معاشرے کے شعراء میں سے بھی حسان بن ثابتؓ کا انتخاب ہونا قیامت تک آنے والے شعراء کے لیے گویا ایک پیغام ہے۔وہ پیغام یہ ہے کہ حضورِ اکرمﷺ کی عظمتوں ، رفعتوں ، تعلیمات اور فضائل و مناقب کے بیان کے لیے مضبوط، قادرالکلام اور زباندانی میں طاق شعراء ہی کی ضرورت ہے۔

یہ اہم ، نازک اور انتہائی درجہ حساس کام صرف تخلیقی سطح پر طبیعت کی موزونیت ہی کے بل بوتے پر نہیں ہوسکتا ہے اس کے لیے تنقیدی شعور کی بھی ضرورت ہے۔چاہے یہ تنقیدی شعور شاعر کی ذات سے ظاہر ہو یا نقاد کے وجودِ مسعود سے!

ہمارے معاشرے میں راست گوئی کی قدروں کے زوال کے باعث ، جہاں اور شعبوں میں رواداری نے راہ پائی ہے وہیں نعتیہ کتب کی تقریظ،دیباچہ یا مقدمہ لکھنے والوں کے ہاں بھی شاعر کی شخصیت سے مرعوبیت اور مروت کے آثار جھلکنے لگے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ مقدمہ نگاروں نے کلام کے معنوی حسن اور بیان کی جمال افروزی کو دیکھے بغیر صرف موضوع کی رفعتوں کا خیال کرکے بات کی ہے اور کوئی مقدمہ،تقریظ یا دیباچہ لکھ دیا ہے۔میں نے ایسی چند کتب کا تذکرہ اپنے تحقیقی مقالے میں کردیا ہے۔

اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آیا۔ راقم الحروف نے دو کتابوں''تیری شان جل جلالہ'' اور''سبز گنبد کے خیالوں میں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''ہمارا عہد سہل انگاری کے فروغ کا عہد ہے۔اس عہد میں فنی ریاضت اور موضوع کی تقدیس کے حوالے سے احتیاط آمیز محنت مفقود ہوتی جارہی ہے۔پھر ظلم یہ ہے کہ جب کسی ناپختہ شاعر کا کلام طباعت کے مراحل سے گزرنے لگتا ہے تو شعرو ادب کی دنیا کے بزرگ غالبًا تالیف قلب کی خاطر اس کتاب پر کچھ تحسین آمیز کلمات ضرور ہی لکھ دیتے ہیں۔اہلِ علم کی

اس روش سے نوجوان شعراء کے دل تو بڑھ جاتے ہیں لیکن شاعری میں شعورِفن کے آثار پیدا ہونے کے امکانات کوسوں دور جا پڑتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حمدیہ ونعتیہ غزلیں شاعر نے بحر کے بجائے لہر میں لکھی ہوں لیکن ان دونوں کتابوں پر رائے دینے والوں نے شاعر کو طباعتِ کتب کے ضمن میں عجلت پسندی کے رویئے سے باز رکھنے کی نصیحت کیوں نہیں کی؟ یہ بات میرے لیے ایک معمہ ہے!!!''۔(نعت رنگ شمارہ ۹،ص ۱۹۱)

بعد ازاں ، میرا تبصرہ پڑھ کر صاحبِ کتاب نے تبصرے والا صفحہ پھاڑ کر مدیرِ نعت رنگ(صبیح رحمانی) کو واپس بھجوادیا تھا۔ یہ واقعہ میرے لیے عبرت کا باعث بنا۔

یہ چند باتیں عرض کرنے کے بعد میری خواہش ہے کہ آپ حضرات کو ایسے اشعار کی ایک جھلک بھی دکھادوں جن کی نعتیہ ادب میں موجودگی خود آپ کو بھی کھٹکے گی! یہاں شعراء کے نام حذف کیے جارہے ہیں کیوں کہ صرف اصلاح کی جانب اشارے کرنا مقصود ہے۔

قرآنِ معظم کی قسم کچھ نہیں لکھتے
جز اسمِ نبیؐ لو ح و قلم کچھ نہیں لکھتے

مشورہ تخلیقِ عالم کے لیے درکار تھا
کیوں نہ ہوتے عرش پر مہماں چراغِ عالمیں

ان دونوں اشعار پر معروضی انداز سے غور کریں تو دونوں اشعار کا نفسِ مضمون نعتیہ شاعری کے موضوعاتی منظر نامے پر کچھ بدنما داغ کی طرح ابھرتا ہے۔ پہلے شعر میں قرآن کریم کی قسم کھا کر حصر کے ساتھ یہ کہنا کہ لوح وقلم ''نبیؐ کے نام کے علاوہ'' کچھ نہیں لکھتے، حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ پھر لکھنے کا کام قلم کے ساتھ ساتھ لوح (تختی) کو بھی سونپ کر ، شاعر نے اپنے علم ، مشاہدے اور شعر گوئی کے منہاج کا خود ہی پول کھول دیا ہے۔

اب ذرا قرآنِ کریم کی سورۂ ''القلم'' کی پہلی آیت دیکھئے :

''نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۱)''[قسم ہےقلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں]

اس آیت کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلم کی تحریر کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے لکھا ہے:

''قلم تفصیل کا مرتبہ ہے۔واؤ قسم ہے۔القلم سے بعض حضرات نے وہ قلم مراد لیا ہے جس نے امرِ الٰہی سے تقادیرِ عالم کو لوحِ محفوظ میں تحریر کیا......قلم،ایک ایسا آلہ ہے جو زمان و مکان کی مسافتوں کوتسلیم نہیں کرتا۔وہ گزشتہ صدیوں کے علوم وفنون سے حال و مستقبل کو روشن کرتا ہے اور دور دراز علاقوں میں پیدا ہونے والے اولوالعزم حکماء وفضلا کے افکار ونظریات کو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچاتا ہے''۔

اس تفصیل سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ شاعر نے بڑے بھول پن سے ایک ایسی بات کی قسم کھالی جومبنی برحقیقت نہیں تھی۔ مزید برآں ''لوح'' [تختی] کو بھی ردیف (کچھ نہیں لکھتے) کی شعر میں بنت کے باعث لکھنے کے وظیفے میں شامل کرلیا۔ اس طرح یہ شعرقرآن کی تعلیمات کے خلاف تو ہے ہی، زندگی کے عام مشاہدات کے خلاف بھی جا پڑا۔

دوسرا شعر جس میں شاعر نے بڑی سادگی سے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ''اللہ رب العزت کو [نعوذ باللہ] تخلیق عالم کے لیےمشورہ درکار تھا اس لیے چراغِ عالمیں جنابِ محمد مصطفٰےﷺ عرش پر مہمان ہوئے''...... اپنے مافیہ کی غیر فطری اور حقیقت گریز حیثیت کا احساس دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے بندے اور رسول سید الکونین حضرت محمد مصطفٰےﷺ کو اپنی نشانیاں دکھانے کے لیے بلایا تھا۔اللہ تعالیٰ تخلیقِ عالم کے لیے مشورے کا قطعی محتاج نہیں ہے۔قرآنِ کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ
الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط

[ہر عیب سے] پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں، مسجد حرام سے مسجدِ اقصٰی تک، بابرکت بنادیا ہم نے جس کے گردونواح کو تاکہ دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں‘‘۔

ایک اور شاعر نے عروضی پابندیوں، اوزان و بحور کی حد بندیوں اور مفہوم کی درستگی کا خیال کیے بغیر اپنے اشعار میں حضورِ اکرم کے القاب کو اشعار کی ردیف بنانے کی کوشش کی اور اس طرح کے اشعار کہہ دیئے:

آپؐ کے حسنِ کرم سے سرشار
ہر گل و خار محبّ الفقراء
ان پہ قربان ہو میرا ایمان و دیں اللّٰہم صلِ علیٰ محمدٍؐ
جن سے وابستہ ہے جلوہٴ آفریں اللّٰہم صلِ علیٰ محمدٍؐ
شافع روز حشر راحت العاشقیں اللّٰہم صلِ علیٰ محمدٍؐ
حسنِ عین الیقیں حاجت شائقیں اللّٰہم صلِ علیٰ محمدٍؐ
آپؐ فخرِ یقیں، آپؐ روشن مبیں، اللّٰہم صلِ علیٰ محمدٍؐ
روشن ہے شایانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم
اللہ اللہ شانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم
کہتے رہیے کہتے رہیے جب تک سنیئے نام انکا
ہوتی ہے پہچانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم
آیا ہوں مدینے جب سے میں سودا ہے یہی سر میں میرے
حاصل ہو عرفانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم
ذکر کرے خود جن کا خدا بیٹھ کے اپنے فرشتوں میں
خوب ہے یہ بھی شانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

کہیے دل سے صلِ علےٰ محمدٌ رسول اللہ
جب آئے کانوں میں صدا محمدٌ رسول اللہ
عرش گواہی دیتا ہے اسکی صداقت کی ہم سے
لا الہٰ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ
آئے جب محبوب خدا کفر کا ٹوٹ گیا جادو
ہر جانب سے شور اٹھا محمدٌ رسول اللہ
اسکے کرم کا رخ بدلا جب یہ کلمہ وردہوا
دل نے جب تسلیم کیا محمدٌ رسول اللہ
جو ہیں خیرالامم وہ ہیں محبوبِ رب
جن کی امت میں ہم وہ ہیں محبوبِ رب
نام سے جن کے تابندہ عہد آفریں
جن کے لوح و قلم وہ ہیں محبوبِ رب
آپ تسکینِ غم شافع یوم النشر
آپ فخرِ امم شافع یومُ النشر
اپنے پیکر کو اس میں پرودیجیے
یہ ہے بابِ نظر شافع یوم الحشر
ہوں ہمقدم کسی کے اگر افضل البشر
وہ معتبر ہو راہ گزر افضل البشر

ایک شاعر نے اللہ کے بندے اور رسول ﷺ کی تعلیمات کا یہ اثر لیا ہے:

انسانیت کو بخشی وہ توقیر آپؐ نے
ہر آدمی سمجھنے لگا ہے خدا ہوں میں

ایک صاحب نے عشق کے بل بوتے پر صحابیت کا درجہ تقسیم کرنا شروع کردیا:

جس نے دل و جگر کو نچھاور کیا بقا
ہاں ہاں بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ ہوگیا

معلوم ہوا کہ یہ شعر تو درجِ ذیل شعر کی تمہید کے طور پر کہا گیا تھا اصل میں تو شاعر صاحب خود کو صحابیت کے درجے پر فائز دیکھ رہے تھے:

مری ہستی کو آئینہ بنا ڈالا محبت نے
بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ ہوں اب اور کیا کہیے

صحابیت کے مرتبے پر خود کو فائز دیکھنا اگر صوفیانہ شطح کے درجے کی چیز ہے تو اس کا ذکر نعتیہ اشعار میں قطعی نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ نعت صرف اور صرف صداقت آثار احوال کے بیان کی متحمل ہوسکتی ہے صوفیانہ شطحیات کے بیان کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مزید برآں موصوف نے ایک شعر غالباً اسی قسم کی شطح کے زیرِ اثر ایسا کہہ دیا کہ ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگ سکتا تھا:

انا بشرٌ زمانہ تم کو سمجھے، ہم نہ سمجھیں گے
بنائے کن فکاں تمؐ وجہ تخلیقِ جہاں تم ہو

قرآنِ کریم کی آیت ہے:

''قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ''

کہہ دیجیے [اے نبی] کہ درحقیقت، میں بھی ایک بشر ہوں تم ہی جیسا، وحی کی جاتی ہے میری طرف''. (سورہ کہف ۱۸، آیت ۱۱۰)

قرآن کریم کی آیت کا حوالہ دے کر، فخریہ انداز میں یہ کہنا کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ ﷺ بشر ہیں، کیسی بڑی اور سنگین جسارت ہے! اس لیے یہ شعر بھی شرعی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ بہر حال ہم شاعرِ موصوف کے لیے مغفرت کی دعا ہی کرسکتے ہیں!

شاعری کے اچھے اور برے ہونے کا معیار وہی ہے جو ایمان اور اعمالِ صالحہ سے

مشروط زندگی کے لیے ہے، کہ اس میں ہر وہ کام جو اللہ کی مرضی کے تابع، سنتِ رسول ﷺ کی پیروی میں اور انسانیت کی فلاح کے لیے ہے، وہ خیر ہے باقی سب شر۔ چناں چہ حضورِ اکرم ﷺ نے بڑے بلیغ انداز میں فرمادیا:

''عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنها قَالَتْ ذُكِرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الشِّعْرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ كَلَامٌ فَحَسَنُهٗ حَسَنٌ وَّ قَبِيْحُهٗ قَبِيْح.

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہا نبی ﷺ کے سامنے شعر کا تذکرہ ہوا آپ ﷺ نے فرمایا ''شعر کلام ہے، اس کا اچھا، اچھا ہے، اگر کلام برا ہے وہ برا ہے۔ روایت کیا اس کو دارقطنی نے اور شافعی نے عروہ سے مرسل بیان کیا۔

....

[☆ یہ مضمون، اتوار: ۲؍رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ مطابق: ۲۲؍جولائی ۲۰۱۲ء کو آرٹس کونسل، کراچی میں ''حلقہء اربابِ ذوق کی تنقیدی نشست'' میں پڑھا گیا تھا۔ مطبوعہ: جسارت، سنڈے میگزین، 3،10، 17، 24 فروری......3 مارچ 2013ء]

نعتیہ ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کے تلازمات!

نعتیہ ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کرتے ہوئے دو باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے:
ا۔شعرِ عقیدت میں شعری جمالیات کے تقاضے......اور ۲۔خیال کی بنت میں مضامین کی صحت کے تقاضے۔

ا۔شعرِ عقیدت میں شعری جمالیات کے تقاضے:

ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے بتایا ہے:

"When we are considering poetry we must consider it primarily as poetry and not as another thing"

''شاعری کو بنیادی طور پر محض شاعری کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے کسی اور شے کی حیثیت سے نہیں''۔(۱)

یعنی شعری تخلیق کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اسے محض شاعری کے اصولوں کی روشنی میں قرطاس کی زینت بنایا جائے۔گویا نعتیہ تخلیق کا آغاز اسی نقطے سے ہوگا کہ جو شاعری ''نعت'' کے نام پر لکھی جارہی ہے آیا وہ شعری اقدار کی روشنی میں ''شاعری'' کہلانے کے قابل بھی ہے کہ نہیں۔

نقاد اور محقق کو بھی اچھی شاعری کے معیارات اور شعری جمالیات کے اصول پیشِ نظر رکھنے ہوں گے۔ اس عمل میں تنقید کے چار پہیئے "Four wheels" کام میں لائے جائیں گے،یعنی تقابل(Comparison) ،تجزیہ (analysis)، امتیاز (discrimination) اور تعیینِ قدر(evaluation)۔(۲)

اس مرحلے پر شاعر، نقاد اور محقق کے لیے چند اصولوں کی نشاندہی کردینا مناسب ہے:

ا۔لفظوں کا صحیح استعمال:

ڈاکٹر محمد ابوالخیر کشفی کی رائے ہے:

''نعت گو شاعر ہر لفظ کو اسی طرح پرکھتا ہے جیسے جوہری ہیرے کو اور پھر ہشت پہلو الفاظ کے ہیروں سے نعت کا ہار خلوص کے دھاگے سے پروتا ہے۔نعت کے الفاظ میں: ا۔خلوص، ۲۔گہری معنویت، ۳۔تہہ داری، ۴۔عظمت، ۵۔عشق، ۶۔فکر، ۷۔روانی، ۸۔ایک دوسرے سے ہم آہنگی کا اجتماع ضروری ہے''۔(۳)

کلیم عاجز نے بڑے پتے کی بات کی ہے، وہ کہتے ہیں:

''بقول انگریزی نقاد، کولرج کہ 'شاعری یہ نہیں کہ کیا کہا گیا ہے، شاعری یہ ہے کہ کیسے کہا گیا ہے'۔میں نے اس قول کو بہت فراخ دلی سے جانچا پرکھا اور تجربے نے یہی کہا کہ بات سچ ہے۔اگر صرف اونچی بات ہی شاعری کہلاتی تو اونچی باتیں تو تھوڑی ہی ہیں۔زندگی کی حقیقتیں اور سچائیاں تو شمار میں آسکتی ہیں لیکن اچھی شاعری کا شمار مشکل ہے۔تو اچھی شاعری جو کہ کی گئی ہے وہ دراصل یہی ہے کہ کسی کہنے والے نے کسی انوکھے ڈھنگ سے کہہ دی تو کہی ہوئی بات بھی نئی ہوگئی''۔(۴)

تلفظ:

شاعری میں لفظوں کو درست تلفظ کے ساتھ استعمال کرنا لازمی ہے۔کیوں کہ لفظوں میں مستعمل حروف کی حرکات شعری سانچوں میں اپنی اصل ھیئت کو واضح کردیتی

ہیں۔یہاں سکون کو حرکت یا حرکت کو سکون سے نہیں بدلا جاسکتا۔نثر میں لفظ کے تلفظ کی نشاندہی ،اعراب لگائے بغیر ممکن نہیں ہوتی لیکن نظم میں لفظ کا تلفظ شعر کی خواندگی ہی سے طے ہوجاتا ہے۔ اس لیے اشعار میں لفظ کے تلفظ کی پابندی لازمی ٹھہرتی ہے۔ادب میں لفظوں کو عوامی سطح پر بولے جانے والے (غلط العوام) لفظوں کو استعمال کرنے کے بجائے لغت کی سند کے دائرے میں رہ کر برتا جاتا ہے۔مثلاً عوام ''برف'' فتح با، سکونِ ثانی و سوم کے بجائے فتح را یعنی را پر زبر کے ساتھ بولتے ہیں۔لیکن اس لفظ کے صحیح تلفظ میں را ساکن ہے، اس لیے شعر میں یہ لفظ اسی طرح لکھا جائے گا۔

معنی:

لفظوں کے معانی کا علم بھی شاعر کو ہونا چاہیے۔نقاد کو اس سے بھی زیادہ معنی فہم ہونا چاہیے۔لغت میں ہر لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔شاعر اپنے شعر میں متعین معانی کا پابند تو نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ معانی کے کسی بھی لونی عکس کا پابند نہو۔زبان کسی شاعر کی انفرادی کوشش سے معانی میں تبدیلی نہیں کرتی ہے۔یہ الگ بات کہ شاعر نے اپنے آپ کو اتنا منوالیا ہو کہ کہہ سکے :

''سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا''(۵)

لیکن یہ بات میرؔ ہی کو زیب دیتی ہے۔ہر ہما ،شما،لفظوں کو اپنی مرضی سے نہیں برت سکتا۔چنانچہ نعت گو شعراء کو بھی لفظوں کے لغوی اور مرادی معانی کے تمام عکس سامنے رکھنے چاہئیں۔نقاد بھی اسی کسوٹی پر نعتیہ اشعار کو پرکھے گا۔کیوں کہ نعت میں لفظوں کے معانی قطعیت کے ساتھ طے ہونا ضروری ہیں۔یہاں ابہام یا ذومعنویت کے عناصر بہت خطرناک نتائج مرتب کرسکتے ہیں۔

عروض:

ہماری کلاسیکی یا روایتی اصنافِ سخن مثلاً غزل، رباعی، قطعہ ،مثنوی، مسدس، مسمط ،

مخمس،ترجیع بند وغیرہ،صنفی ہیئت کے علاوہ عروضی اوزان و بحور کی بھی پابند ہوتی ہیں۔یہ ضروری تو نہیں کہ ہر شاعرعروض داں ہو۔لیکن ہر شاعر کا موزوں طبع ہونا بہرحال لازمی ہے۔ورنہ وہ بے وزن اشعار کہے گا اورخود اپنا مذاق اڑوائے گا۔

اسی طرح نقاد کے لیے اشعار کی موزونیت جاننے کا فطری ہتھیار تو اس کا وجدان ہے ،لیکن عروضی حوالے سے اشعارکو پرکھنے کے لیے علمِ عروض کی شد بد بھی ضروری ہے۔

اصنافِ سخن کی ہیئت:

اصنافِ سخن کی شناخت مختلف ہیئتوں میں ہوتی ہے۔مثلا غزل ، جس کے ہر شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر شعر اپنی معنیاتی اکائی کا غماز ہوتا ہے۔قصیدہ، جس کا مطلع غزل کے مانند ہوتا ہے اور ہر شعر بھی غزل سے مشابہ ہوتا ہے کیوں کہ اس میں قافیہ اور ردیف (اگرشعر، مردف ہوتو) کی پابندی ضروری ہے ۔البتہ قصیدے کی زبان پرشکوہ (بھاری بھرکم الفاظ سے لبریز)ہوتی ہے کیوں کہ اس میں شاعر اپنی علمی لیاقت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ مثنوی کا ہر شعرغزل کے مطلع کے مانند ہوتا ہے۔یعنی مثنوی کا ہر شعر ہم قافیہ بھی ہوتا ہے اور اگر ردیف موجود ہے تو بیت کے دوسرے مصرعے میں ردیف کی تکرار بھی لازمی ٹھہرتی ہے۔ رباعی کے اوزان کا ایک الگ جہان ہے۔اس کے لیے چوبیس بحریں مقرر ہیں اورمتن میں فلسفیانہ گہرائی بھی ضروری ہے ۔ مسدس کے چھ مصرعوں کی جو ترتیب مقرر ہے وہی ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ایسی صورت میں شاعر پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی صنف سخن کو استعمال کرتے ہوئے اس کے ہیئتی تقاضے جانے اور برتے ۔نقاد بھی انہی اصولوں کے تحت اس شاعری کوتنقید کی کسوٹی پر پرکھے گا۔

دیگر شعری اصناف مثلاً نظمِ معریٰ، نظمِ آزاد، سہ مصرعی یا ثلاثی، ہائیکو، نثری نظم، وغیرہ وغیرہ۔ان میں سے ہر صنف کے کچھ اصول ہیں،ہر صنف کی تخلیقی جمالیات ہے، اس لیے پہلے تو شاعر کے لیے لازمی ہے کہ وہ ان اصناف کے صنفی تقاضوں کا خیال رکھے ،بعد ازاں نقاد کی ذمہ داری ہے کہ ان اصناف کے صنفی تقاضوں اورشعری جمالیات کی روشنی میں

ایسی شاعری کا جائزہ لے۔محقق کو تو ہر لحاظ سے یہ نکات مدِ نظر رکھنے ہوں گے۔

صنائع بدائع کے استعمالات کا جائزہ:

شاعری میں حسن پیدا کرنے کے لیے خیال کو اچھے سے اچھے اور انتہائی موزوں الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کوشش میں شاعر کبھی لفظوں کی تکرار اور کبھی صوتی ہم آہنگی کے لیے کچھ صنائع بدائع کا استعمال بھی کرتا ہے۔صنائع بدائع کے بالقصد استعمال سے ، اشعار میں کچھ حسن تو پیدا ہوجاتا ہے لیکن تصنع اور بناوٹ کا عنصر بھی داخل ہوجاتا ہے۔تاہم محتاط کاوش ، شعری حسن کے ساتھ تأثر میں اضافے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

جدید عہد خیال کی ترسیل میں ندرت پیدا کرنے کا ہے ، صنائع بدائع کے اظہار کا نہیں۔اس لیے شاعر، نقاد اور محقق کو ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔

شعری جمالیات:

اچھے اور برے اشعار میں امتیاز کرنے کی غرض سے شاعر پر لازم ہے کہ اپنے تخلیقی سرمائے کو پر کھنے کے لیے کلاسیکی اور جدید ادب کی شعری تخلیقات کا بغور مطالعہ کرے۔نقاد اور محقق بھی کسی شعری تخلیق کا تجزیہ کرنے کے لیے قدیم و جدید شعراء کی تخلیقات کے گہرے مطالعے کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرنے کی سعی کریں۔

معائبِ سخن سے گریز:

☆ شاعر کے لیے معائبِ سخن سے بچنا بھی ضروری ہے مثلاً اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عیبِ تنافر کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے؟

☆ کلام میں عیبِ تنافر اس وقت پیدا ہوجاتا ہے جب کسی مصرعے میں ایک لفظ کا آخری حرف اور دوسرے لفظ کا پہلا حرف مل کر یک آہنگ ہوجائیں......جیسے

ہے حمدِ ربِ جہاں لاالہٰ الااللہ
کہ ہے جہاں میں اماں لاالہٰ الااللہ

تو سایہء رب ہے تو کہاں عقل کی زد میں
مخلوق تیرے رتبے سے آگاہ ہی نہیں ہے

پہلے شعر میں ’’ہے‘‘ کی ہائے ہوز کی آواز حمد کی حائے حطی میں مدغم ہورہی ہے۔اور دوسرے شعر میں ’’آگاہ‘‘ کی ہائے ہوز ’’ہی‘‘ کی ہائے ہوز سے مل کر ایک آواز نکال رہی ہے جس سے لفظ ’’آگاہی‘‘ بن رہا ہے۔ یہ عیبِ تنافر ہے۔(واضح رہے کہ یہ اشعار بہت ہی کمزور ہیں لیکن یہاں شعر کی خوبصورتی یابدصورتی کا ذکر نہیں ،عیبِ تنافر کی مثال دینی ہے)(۶)

وہی ہے مالک وہی ہے مولا وہی الہ ہے وہی احد ہے
وہی ہے دائم مرا ہے دعویٰ وہی الہ ہے وہی احد ہے

اس شعر میں اِلہٰ کی ہائے ہوز بھی ’’ہے‘‘ کی ہائے ہوز کے ساتھ مل رہی ہے اور صرف ایک ’’ہ‘‘ کی آواز قائم رہ سکتی ہے۔ چنانچہ اِلہٰ کے بجائے ’’اِلاہے‘‘ پڑھا جارہا ہے۔ یہ عیب اصوات کے ادغام کی وجہ سے بہت سنگین ہوگیا ہے۔(۷)

عیب تنافر کی ایک اور مثال دیکھیے:

احمد فراز نے ایک مصاحبے میں بتایا کہ ذوالفقار علی بخاری کے سامنے انہوں نے اپنا ایک شعر پڑھا:

فراز تیری محبت کا پاس ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

تو بخاری صاحب نے کہا ’’ہاں بیٹا‘‘ کیا کپاس کہا ہے۔یہ سن کر فرازؔ نے مصرع بدل دیا:

ع فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ (۸)

۞ اب دیکھیے ’تعقید کسے کہتے ہیں اور اس کی موجودگی سے شعر میں کیسی کراہیت پیدا ہوجاتی ہے؟

☆عیبِ تعقید اس وقت پیدا ہوتا ہے جب الفاظ شعری بُنت میں آگے پیچھے آئیں اور لفظوں کی ترتیب بگڑی ہوئی معلوم ہو۔

جب نقشِ کفِ پائے نبیؐ چوم ہیں آتیں
ہر دید طلب دل میں اترتی ہیں یہ آنکھیں
دامانِ طلب گار ہیں بھر جاتے گہر سے
جب فیض رساں در سے گزرتی ہیں یہ آنکھیں

پہلے شعر میں شاعر کہنا چاہتا ہے کہ جب میری آنکھیں نقشِ کفِ پائے نبیؐ چوم کر آتی ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں دید کی طلب ہے ان کے دلوں میں میری آنکھیں اتر جاتی ہے۔یعنی وہ میری آنکھوں کو رشک سے دیکھتے ہیں۔اس شعر کے پہلے مصرعے میں تعقید بھی ہے اور مصرعے کی بُنت بھی بڑی کمزور ہے۔''چوم کے آتی ہیں'' کی جگہ ''چوم ہیں آتیں'' میں الفاظ بے ترتیب ہیں۔

دوسرے شعر میں ''دامانِ طلبگار بھر جاتے ہیں'' کی جگہ ''ہیں بھر جاتے'' میں تعقید ہے۔(۹)

﴿﴾شتر گربہ کیا ہوتا ہے اور اس عیب سے شاعری میں کیا خرابی پیدا ہوتی ہے؟

☆شتر اونٹ کو کہتے ہیں اور گُربہ بلی کو۔لہٰذا جب آپ کے ساتھ تم یا تیرا، تیری آئے تو اس کو عیبِ شُتر گربہ کہتے ہیں۔جیسے:

مانا حقیر ہیں ہم، پر آپؐ سے ہے نسبت
تم ہو سراپا رحمت، عاشق ہیں ہم تمہارے
معراج کے سفر میں، مہماں خدا کے گھر میں
رب نے کہا کہ پیارے ہم تیرے تم ہمارے

اشعار دونوں بہت کمزور اور ناقص ہیں لیکن اس موقع پر صرف شتر گربہ سمجھ لیجیے۔
پہلے شعر کے مصرعہء اولیٰ میں ''آپؐ'' سے حضورِ اکرمﷺ سے تخاطب ہے جبکہ دوسرے مصرعے میں ''تم......اور تمہارے'' سے خطاب ہے۔ دوسرا شعر انتہائی رکیک اور مبتذل ہے ۔ رب تعالیٰ سے منسوب بات کذب کی انتہا ہے۔لیکن مصرعہء ثانی میں ''ہم تیرے تم ہمارے'' میں تیرے اور تم کی وجہ سے شتر گربہ کا عیب بھی پیدا ہوگیا ہے۔(۱۰)

معائبِ سخن کی فہرست خاصی لمبی ہے۔لہٰذا صرف اتنا کہہ کر میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں کہ نعت گو شاعر کو بھی معائبِ سخن سے بچنا چاہیے اور نقاد کو بھی ایسے عیوب شاعری میں دیکھتے ہوئے خاموش نہیں رہنا چاہیے، محقق کو بھی اس پہلو پر نظر رکھنی چاہیے۔بعض لفظوں کا استعمال تو از روئے قرآن ممنوع ہے۔مثلاً ''راعنا'' کے بجائے ''انظرنا'' کا لفظ استعمال کرنے کا قرآنی حکم (آیت نمبر۱۰۴ سورۂ البقرہ) سب کے سامنے رہنا لازمی ہے۔

شعری معیارات کے حوالے سے بات سمیٹتے ہوئے مجھے ڈاکٹر ریاض مجید کی ایک تحریر یاد آگئی۔وہ کہتے ہیں:

''نعت محض ایک موضوع نہیں ایک فنی کل (whole) ہے۔ایک ایسی تخلیقی اور نامیاتی وحدت، جس میں خیال، لفظ، اسلوب، ہیئت، آہنگ اور دوسرے اسلوبیاتی وسائل اور شعری محاسن ، ایک موثر فنی اکائی کی طرح تخلیق یاب ہوتے ہیں۔نعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرکزی و محوری موضوع آپ کی ذاتِ گرامی سے محبت کا اظہار اور آپ کی شخصیتِ ستودہ صفات کا تذکار ہے۔اس موضوع سے ہزاروں مضامین نے جنم لیا''۔(۱۱)

﴿۲﴾خیال کی بنت میں مضامین کی صحت کے تقاضے:

نعتیہ ادب میں تخلیق کار، نقاد اور محقق کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر سطح پر ''صداقت'' کی جستجو کرے۔یعنی تخلیق کار ہر وہ بات شعری زبان میں بیان کرے جو قرآن و سنت اور آثارِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حوالے سے درست طور پر شاعر تک پہنچی ہو۔نقاد اسی پیمانے پر شعرِ عقیدت کی پرکھ کا کام انجام دے اور محقق بھی اسی نہج پر تحقیق کرے۔

بدقسمتی سے اردو نعت میں غیر محتاط شعراء نے بہت سی ایسی روایات کو تلمیحاتی سطح پر عام کردیا ہے جن کی اصل یا تو اسرائیلیات کی من گھڑت حکایات ہیں یا گمراہ فرقوں کی

موضوعات۔ اس کی مثال جاننے کے لیے علامہ شہزاد مجددی کی تحقیقی کاوش کا صرف ایک نمونہ پیش کرنا ہی کافی ہوگا:

......محمد شہزاد مجددی نے ایک بہت مشہور روایت ’’**الفقر وفخری و بہ افتخر**‘‘(فقر میرا فخر ہے اور میں اس کے ساتھ مفتخر ہوں) بے اصل بتاتے ہوئے امام ابنِ تیمیہؒ، العسقلانی، شیخ محمد پٹنی اور ان کے شیخ،حافظ ابن حجر اور محدث بریلوی حضرت احمد رضا خاںؒ وغیرہم کے حوالے سے اس روایت کو’’موضوع‘‘ اور’’باطل‘‘ لکھا ہے۔اپنی تحقیق کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے فتاویٰ الرضویہ جلد ششم کے صفحہ نمبر ۱۲۶ کا حوالہ بھی دیا ہے(۱۲)۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث نقل کرکے اس کے معانی کی تفہیم کے لیے بھی زعمائے حدیث کے حوالے دیے ہیں۔حدیث شریف ہے ’’**اللھم احینی مسکیناً و امتنی مسکیناً و احشرنی فی زمرۃ المساکین**‘‘(اے اللہ! مجھے مسکین ہی زندہ رکھ، مسکنت میں موت دے اور مساکین کے ساتھ میرا حشر فرما)۔وہ لکھتے ہیں:

’’اس روایت کو امام ترمذی نے غریب کہا اور اس کی سند میں ضعف ہے۔ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی نے اسے الگ الگ طریق سے روایت کیا ہے......امام بیہقیؒ کہتے ہیں میرے نزدیک اس کی صورت یہ ہے کہ رسولﷺ نے یہاں اس مسکنت کا سوال نہیں کیا جس کا معنی قلت لیا جاتا ہے بلکہ آپؐ نے اس مسکنت کا سوال کیا ہے جس کا معنی انکسار اور عاجزی لیا جاتا ہے۔ایک اور قابلِ غور امر یہ ہے کہ صحیح احادیث میں حضورﷺ کا فقر سے استعاذ اور پناہ مانگنا ثابت ہے اور آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی تعلیم فرمائی ہے۔چنانچہ صحیحین میں فقر سے استعاذ کے الفاظ یوں مروی ہیں:’’**اللھم اعوذ بک من فتنۃ الفقر**‘‘ ترجمہ:اے اللہ! میں فقر کے فتنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں(بخاری الدعواۃ رقم ۵۸۹۱ مسلم فی الذکر والدعا رقم ۴۸۷۷)۔

سنن ابی داوٗد میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی روایت میں دعائیہ کلمات یوں ہیں:**اللھم انی اعوذ بک من الکفر و الفقر** (ابو داوٗد......۴/۳۲۴ رقم ۵۰۹۰) ترجمہ: اے اللہ! میں کفر وفقر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔یہاں کفر کے ساتھ فقر کا تذکرہ لائقِ عبرت بھی ہے اورمحلِ تنبیہ بھی۔صحیح ا بن حبان میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے:**فقال رجل و یعتدلان؟ قال نعم**(الاحسان ۳/ رقم ۱۰۲۶)ترجمہ: ایک شخص نے پوچھا کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔**تعوذ و باللہ من الفقر**(احمد رقم ۳/۱۰۸۷،ابنِ حبان، ۱/۲۳۹:رقم ۹۷۹) ترجمہ: فقر سے اللہ کی پناہ مانگو۔سننِ نسائی میں ہے۔ **نعوذ و من الفقر و فاقہ**، ترجمہ: فقر و فاقہ سے اللہ کی پناہ مانگو۔ (نسائی:۵۷۷۵)......الغرض احادیثِ صحیحہ میں فقر سے پناہ و نجات اور براء ت کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔یہاں ایک بات کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ حضورﷺ نے اپنے لیے موجود، مذکور اور منصوص فضائل کا اظہار بھی فخر سے نہیں فرمایا ہر جگہ فرمایا’’**ولا فخرٌ و لا فخر**‘‘ کی تکرار سے اپنے رب کی بارگاہ میں اظہارِ عبودیت اور تواضع فرمایا ہے‘‘۔(۱۳)

اس لیے نعت گوشعراء نعتیہ ادب کے محققین اورشعرِ عقیدت کی تنقیدی سرگرمیوں سے وابستہ اہلِ قلم کو چاہیے کہ نبی علیہ السلام سے منسوب ہر روایت کو اچھی طرح پرکھنے کے بعد قبول کریں۔کیوں کہ یہ معاملہ صرف بیان کی فصاحت اور بلاغت ہی کا نہیں ہے بلکہ ایمان کی حفاظت اورعقبیٰ کے مواخذے سے بچنے کا بھی ہے۔ دو احادیث اور بھی دیکھ لیجیے:

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہٗ من النار(:جس نے قصداً

مجھ پر جھوٹ باندھا اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیا......متفق علیہ)......**كفى بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع** (کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کردے)۔(۱۴)

نعت کے مافیہ (content) یا متن (text) کی اہمیت ہر قسم کی شاعری کے مافیہ سے زیادہ ہے۔نعت کے نفسِ مضمون کے فکری رشتے قرآن و حدیث سے بڑے گہرے ہیں۔اس لیے قرآن و حدیث کے مفاہیم کو شعری قالب میں ڈھالنے کے ہنگام استنادی شان کو برقرار رکھنا' تاریخ اسلام کے مستند حوالوں کو شعری پیکر دینا بہت ضروری ہے۔اس موقع پر اپنے جذبات ،اپنی خواہشات اور اپنے مذہبی تعصّبات کو قابو میں رکھتے ہوئے راہِ مستقیم پر چلنا اور وادیِ نعت سے سرخرو گزر جانا بہت بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔کیوں کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ سچائی کا عنصر ہر سطح پر برقرار رہ سکے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"**لا يجمع الله هٰذِهِ الامة علىٰ الضلالة ابدا**" (اللہ تعالیٰ اس امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا)"......"**اِنَّ اُمَّتِیْ لَا تَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَةٍ فَاِذَا رَاَیْتُمْ اخْتِلَافاً فَعَلَیْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ** o (میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔اگر تم امت میں اختلاف دیکھو تو بڑی جماعت کے ساتھ موافقت لازم ہے)(۱۵)

اس حدیث کی روشنی میں امت کے سواد اعظم کی مستند روایات اور صحاح ستہ اوراحادیث وسیَر کی امہاتِ کتب کا مطالعہ کرنا شاعر کے لیے بھی ضروری ہے' نقاد کے لیے بھی اور محقق کے لیے بھی لازمی ہے۔

شاعری میں جذبہ اور احساس ہی شعر کا حسن بڑھاتا ہے۔تاہم نعتیہ شاعری میں جذبے اور احساس کے ارتعاشات کو شعری پردے پر ابھارنے کا عمل انتہائی سچائی اور احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔

جدید عہد نے نعتیہ مضامین کو بڑی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ان موضوعات میں کیا کیا شامل ہے؟اس طرح کی کوئی فہرست بنانا تو ممکن نہیں ہے لیکن ہم اس مسئلے کو چند احساساتی اورفکری ابعاد (dimensions) کے حوالے سے دیکھ سکتے ہیں۔مثلاً......

☆حضورِ اکرم ﷺ کا جمالِ صوری ☆حضورِ اکرم کے اسمائے مبارکہ کی معنوی تنویر☆حضورِ اکرم ﷺ کا جمالِ معنوی ☆حضورِ اکرم ﷺ کی الفت اور آپ کی اتباع کی آرزو ☆حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیمات ☆ حضورِ اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ☆حضورِ اکرم ﷺ کا تعلق مع اللہ☆ نبی ﷺ کا تعلق مع الخلق ☆نبی ﷺ کی ذات کی عظمت ☆ نبی ﷺ کے معجزات ☆ اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے نبی اکرم ﷺ کا تعلق☆نبی ﷺ کا اپنے اہل بیت یعنی آپ کی ازواجِ مطہرات کے ساتھ تعلق ☆نبی ﷺ کا اپنی آل کے ساتھ تعلق☆ نبی ﷺ کے اقوال☆ نبی ﷺ کے اعمال☆ نبی ﷺ کی تقریر☆حضورِ اکرم ﷺ کے غزوات☆حضورِ اکرم کے خطبات ☆حضورِ اکرم ﷺ کی بزم آرائی ☆شاعر کی طرف سے اپنے غم کا استغاثہ ☆امت کی طرف سے استغاثہ ☆شفاعت طلبی کی التماس☆خواب میں حضورِ اکرم ﷺ کے دیدار کی آرزو☆حضورِ اکرم سے نسبت رکھنے والے اشخاص ، اصحاب ، ازواج اور اشیاء کا ذکر☆ ہر اس خطے کا ذکر جس میں حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ دنیوی میں قدم رنجا فرمایا ☆مدینہ منورہ کا ذکر☆ اس تک رسائی کی آرزو ☆ اس شہر کی فضیلتوں کا بیان ☆ گنبدِ خضرا کا تذکرہ ☆شاعر کے احساسات و جذباتِ حبِ رسول ﷺ کی سچی عکاسی......غرضیکہ اس موضوع کے ہزار ہا زاویئے ہیں۔شاعر کے احساسات، اس کے قلبی احوال، ہجر نبوی کا اظہار ، مدینہ طیبہ سے دوری کے احساس کا شعری مرقع ، مدینہ پہنچ جانے پر اپنے نصیب پر رشک اور حیرت و استعجاب میں ڈوب جانے کی کیفیت کا اظہار وغیرہ، سب ہی کچھ تو نعت کا موضوع بن جاتا ہے ۔ شرط صرف اتنی ہے کہ بیان میں اعتدال ہو، اظہار میں سچائی ہو،تلمیحات کا پس منظر بالکل درست اور مستند ہو۔

ممنوعاتِ نعت:

نعت کے اشعار کی شعری بُنت میں شرعی حدود کا خیال رکھنے کے لیے کچھ امتناعی زاویوں کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔مثلاً

ا۔نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔اس تصور کے منافی کوئی خیال شعر میں نہیں باندھنا چاہیے۔علامہ رزی جے پوری کہتے ہیں:

محمدؐ کو خدا کہنا، خدا کو مصطفیٰ کہنا
یہ ہے ترکِ مدارج، شرک ہے، الزام وتہمت ہے (۱۶)

☆حضورِ اکرمﷺ ، اللہ رب العزت کے بندے ضرور ہیں لیکن اللہ کی تمام مخلوقات میں صرف آپﷺ کی ذات افضل ہے۔ ع...... بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن ہمارے شاعر حضورِ اکرمﷺ کی محبت میں انہیں وہی نام دینے کی کوشش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔جیسے :

وہ احمد ،اللہ احد ہے
اسمِ محمد اسمِ صمد ہے(۱۷)
وہ والی وہ عالی ہے
وہ مالک ہے وہ مولا
اللّٰھم صلِ علیٰ (۱۸)

پہلے شعر میں شاعر نے اسمِ محمد کو اسمِ صمد کہا ہے۔یہ تو مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ اللہ نے سورۂ اخلاص میں اپنا تعارف ''اللہُ الصّمد'' کہہ کر کروایا ہے۔یہی حال ''والی'' اور ''مالک'' کا ہے۔ یہ دونوں نام بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔

حضورِ اکرمﷺ کی اسم شماری میں شاعروں نے ذرا احتیاط نہیں کی ہے۔ مثلاً عربی کا ایک جملہ ہے''صلِ علیٰ''......صَلِّ (فت ص،شد ل بکس) [فعلِ امر]......رحمت نازل فرما۔درود وسلام بھیج ......علیٰ یعنی اوپر۔

اس صورت میں صرف صَلِّ علیٰ کہنے سے بات مکمل نہیں ہوتی ہے ۔صَلِّ علیٰ محمد کہنے سے بات بنتی ہے۔لیکن بعض شعراء ایک مجہول فقرہ ہی لکھتے ہیں ۔ستم تو یہ ہے کہ بعض شعراء اس مجہول فقرے کو حضورِ اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی سمجھتے ہیں۔جیسے :

صَلِّ علیٰ ہی حامیء کل ہے
صَلِّ علیٰ ہی والیء کل ہے
صَلِّ علیٰ سردارِ رسل ہے
صَلِّ علیٰ ہی والیء کل ہے
صَلِّ علیٰ ہے اسمِ احمدؐ
رحم و کرم ہے اس کا لاحد(۱۹)

اس لیے حضورِ اکرمﷺ پر درود بھیجنے کی درخواست کے لیے صرف ''صَلِّ علیٰ'' کہدینا کافی نہیں ہے۔آپﷺ کے اسمِ گرامی کے طور پر یہ مجہول فقرہ استعمال کرنا تو اور زیادہ قابلِ گرفت ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ کسی اور کو آپﷺ کا ہم مرتبہ یا ہم رتبہ ظاہر کرنا۔کسی خاص صفت میں نبیﷺ کا شریک قرار دینا۔صریحاً شرک فی النبوت ہے۔حضورِ اکرمﷺ کی ذات ہی صرف وجہِ تخلیقِ کائنات ہے۔صرف حضورِ اکرم ہی کی ذات ''معصوم عن الخطاء'' ہے۔حضورِ اکرم کے قرابت دار، اصحاب اور ازواج سب ''محفوظ عن الخطاء'' ہیں۔یہ نکتہ ضرور ملحوظ رہے۔

☆محض عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے خیال سے کسی فلمی گانے کی طرز پر نہ تو شعر کہے جائیں اور نہ ہی اس گانے کی دھن اپنائی جائے۔

☆حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا مطالبہ نہ کیا جائے کہ ''آپ ایک بار پھر دنیا میں تشریف لاکر ہماری حالتِ زار ملاحظہ فرمائیں''۔ کیوں کہ اسلام میں آپﷺ کی بعثتِ ثانی کا کوئی تصور نہیں ہے۔استغاثہ ،بحدِ اعتدال پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

☆انبیائے سابقین کی ذات سے حضورِ اکرم کی ذاتِ اقدس کی افضلیت ثابت کرتے ہوئے کہیں ان انبیاءِ کرام علیہم السلام کی توہین کا پہلو نہ نکلے۔اس ضمن میں بہت احتیاط درکار ہے۔

☆کسی صحابی یا آپ کے کسی رشتہ دار امتی کا ذکر اس طرح نہ کیا جائے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی تبلیغی سرگرمیوں کی کامیابی کا سہرا ان کے سر باندھنے کی کوشش ظاہر ہو۔یا یہ ظاہر ہو کہ اگر وہ صحابی نہیں ہوتے تو دین پھیلتا ہی نہیں۔تمام اصحاب النبی ﷺ ، ازواج النبی ﷺ اور نبی ﷺ کے ہاشمی قرابت دار،امت کے لیے محترم ضرور ہیں لیکن حضور ﷺ کے صرف خادم اور امتی ہیں۔

☆معراج میں اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کو اپنی نشانیاں دکھانے کے لیے فلک الافلاک کی سیر کرائی تھی۔اسی بات کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے۔اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے۔ معراج کی تفصیلات قرآن کریم میں موجود ہیں اور تفاسیر میں معراج کی روایت صحیح احادیث کی روشنی میں بھی ملتی ہے۔اس لیے یہ کہنا کہ ''اللہ نے حضورِ اکرم ﷺ کو دیدار کے لیے طلب فرمایا تھا'' بڑی بھاری غلطی اور ظلم ہے کیوں کہ اللہ کی شان ''البصیر'' کا استخفاف ہوتا ہے۔

☆معجزات کے بیان میں بھی صرف حضورِ اکرم ﷺ کی عظمت کا خیال پیش کیا جائے ، کسی صحابی کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے کسی معجزے کا تصور پیش کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

☆نعتیہ اشعار میں اصحاب النبی ﷺ ، ازواج النبی ﷺ اور نبی علیہ السلام کے قرابت داروں کا ذکر مناقب کے اشعار کی صورت میں آتو سکتا ہے۔لیکن صرف اس لیے کہ ان اشعار سے حضور ﷺ ہی کی عظمت ظاہر ہو۔ان حضرات میں سے کسی کا بھی حسنِ سیرت و کردار ،کرامت اور حسنِ معنوی، صرف اور صرف حضورِ اکرم ﷺ کی تربیت اور فیضانِ نظر کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے اس کے علاہ کچھ نہیں۔

☆تاریخی استناد کی روشنی میں نعتیہ اشعار کی پرکھ کے اصول:

تاریخی واقعات کو بھی اپنے تعصب کی نذر نہیں کیا جانا چاہیے......تاریخ میں لکھا ہے اور بہت لوگوں نے بغیر تحقیق یہ بات باور کرلی ہے کہ فتح مکہ کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور بلندی پر نصب بت کو توڑنے کا حکم فرمایا۔یہ واقعہ درایت کی رو سے بھی غلط ہے اور روایت بھی اس کی بالکل غلط ہے۔علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی نے بروایت سنن ابی داؤد لکھا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ضرور تھے لیکن علی بن ابی طالب نہیں بلکہ نواسہء رسول ﷺ ، حضرت بی۔بی۔زینب رضی اللہ عنہا کے فرزند علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ تھے:

''فحمل علی بن ابی العاص علیٰ عاتقه
یعنی آپ ﷺ نے علی بن ابی العاص کو اپنے کاندھے پر اٹھایا''۔(۲۰)

رحمۃ اللعالمین کے مصنف قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے لکھا ہے:
''فتح مکہ کے دن یہی علی سبطِ رسول، نبی ﷺ کے ناقہ پر حضور کے ردیف تھے''(۲۱)

یہ تو صرف ایک مثال ہے تاریخ میں بے احتیاطیوں اور قصداً داخل کی جانے والی جھوٹی روایتوں کی وجہ سے آج امت میں انتشار ہے۔

شعراء،نقادانِ فن اور محققین کی توجہ مبذول کروانے کی غرض سے چند ایک ایسی مثالیں پیش کردینا ضروری ہے جن کی شعری بنت، قرآن، حدیث یا تاریخی سند سے متصادم ہے:

۱۔واقعہء معراج :

اردو نعتیہ شاعری میں سب سے زیادہ جس واقعے کو خیالی شاعری کے ذریعے روحِ قرآن کے خلاف شعری بنت میں لایا گیا ہے، وہ واقعہء معراج ہے۔اس کی بے شمار مثالیں نعتیہ ادب کا حصہ بن چکی ہیں۔قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے صاف بیان فرمایا ہے:

"(ہرعیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک ۔بابرکت بنادیا ہم نے جس کے گردونواح کو تاکہ دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں"۔(۲۲)

اس کے علاوہ سورۂ نجم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"جب سدرہ پر چھارہا تھا جو کچھ چھارہا تھا۔نہ درماندگی ہوئی چشمِ (مصطفیٰ) اور نہ (حد ادب سے) آگے بڑھی ۔یقیناً انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں"۔(۲۳)

ضیا القرآن میں پیر محمد کرم شاہ الازہری نے تفسیرِ مظہری کے حوالے سے لکھا ہے:

"یعنی آیاتِ کبریٰ سے مراد عالمِ ملکوت کی وہ عجیب وغریب چیزیں ہیں جن کا مشاہدہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سفرِ معراج پر جاتے ہوئے اور واپسی کے دوران میں کیا جیسے براق، سمٰوات ، انبیاء، فرشتے، سدرۃ المنتہیٰ، جنت الماویٰ وغیرہا......ان اشیاء کو آیاتِ کبریٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان آیات کے ساتھ جن مخصوص تجلیات کا تعلق ہے اور اللہ کی رحمتوں اور برکات کا نزول جس کثرت سے ان پر ہوتا ہے، وہ کسی دوسری آیت کو نصیب نہیں"۔(۲۴)

آیاتِ قرآنی کے ترجمے اور کچھ تفسیری حاشیئے سے سفرِ معراج کی غرض و غایت واضح ہوجاتی ہے۔لیکن ہمارے شعراء اس سفر سے عجیب وغریب باتیں منسوب کرکے اپنے اشعار کو چٹخارے دار بنانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔مثلاً :

"کچھ اس انداز سے بختِ شبِ معراج چمکا ہے
اجالا تو اجالا ہے، اندھیرا بھی اندھیرا ہے
جو پردہ مدتوں سے درمیاں تھا آج الٹا ہے
محمدؐ عرش پر بیٹھے ہیں چپ خالق یہ کہتا ہے
تمہارا گھر ہے اپنے گھر میں شرمایا نہیں کرتے" (۲۵)

درجِ بالا بند میں پہلے تین مصرعے ہلال جعفری کے ہیں۔ان مصرعوں میں بیان

کی صفائی بھی ہے اور اعتدال بھی لیکن قمر جلالوی کے جس شعر پر یہ تین مصرعے لگائے گئے ہیں وہ معراجیہ ادب میں انتہائی رکیک شعر ہے۔حیرت ہے کہ قمر جلالوی نے جو غلطی کی تھی اس کو تضمین نگار نے خوبی جانا اور اس مبتذل شعر کی تضمین کردی!

قمر جلالوی کا یہ شعر غزل کا محاکاتی بیان لیے ہوئے ہے اور رومانوی انداز کی شاعری کا نمونہ پیش کررہا ہے۔اس شعر میں نہ تو معراجِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی غرض و غایت کا لحاظ کیا گیا ہے اور نہ ہی واقعاتی صداقت کا پہلو سامنے رکھا گیا ہے۔یہاں تو ہرعیب سے پاک خالق کو اپنے مقدس اور پاکیزہ بندے اور رسول ﷺ سے ملتے ہوئے ایسے دکھایا گیا ہے کہ اس کی تشریح کرنے میں دینی حمیت اورایمانی غیرت مانع ہے۔پھر اپنے رب سے ایسی بات بھی منسوب کردی گئی ہے جو ہر قرینے سے "کذب" کے زمرے میں آتی ہے۔قمر جلالوی کے شعر کا دوسرا مصرعہ اس انداز سے لکھا گیا ہے کہ یہ قول، اللہ تعالیٰ کا قول بن کر سامنے آیا ہے ......

ع "تمہارا گھر ہے۔۔۔الخ"۔

یہ تو ایک مثال ہے۔معراج کے حوالے سے نعتیہ شاعری میں بے شمار اشعار ایسے مل جائیں گے جن میں اللہ رب العزت کو حضورِ اکرم ﷺ کے دیدار کا تمنائی ظاہر کیا گیا ہے۔گویا [معاذ اللہ] اللہ تعالیٰ زمین پر چلتے ہوئے حضورِ اکرم ﷺ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔اس ضمن میں بڑے بڑے جغادریوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔علامہ قابل گلاؤٹھوی کا ایک شعر ہے جس کی تضمین ہلال جعفری نے کی :

"عرش پر نور کی قندیل سے چلتا ہے پتہ
عبد و معبود کی تشکیل سے چلتا ہے پتہ
آمدِ حضرتِ جبریل سے چلتا ہے پتہ
شبِ معراج کی تفصیل سے چلتا ہے پتہ
اپنے ہی حسن کے خود طالبِ دیدار ہیں آپؐ" (۲۶)

اس تضمین کے دوسرے مصرعے میں ''تشکیل'' کا لفظ ''عبد و معبود'' کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔تشکیل کے معنی ہیں شکل بنانا، صورت بنانا، خاکہ تیار کرنا، بنانا،مرتب کرنا،شکل دینا۔(اردو لغت، اردو ڈکشنری بورڈ)۔معراج کے حوالے سے اللہ اور رسول ﷺ کی ملاقات کو تشکیل کا نام دینا کسی طور مناسب نہیں ہے۔

خیر یہ تو لسانی مسئلہ ہے۔قابل گلاؤٹھوی نے ''اپنے ہی حسن کے خود طالبِ دیدار ہیں آپ ؐ'' کہہ کر معراج کے واقعے کو عجیب رنگ دیدیا۔اب ذرا غور فرمایئے:

☆''آپ'' کی ضمیر اگر حضورِ اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے ،تب تو یہ مطلب ہوگا کہ حضور ﷺ کا حسن ہی اللہ تعالیٰ کا حسن بھی ہے اور آپ ﷺ اپنے ہی حسن کی طلب میں معراج پر تشریف لے گئے تھے۔اس طرح سوچنے سے دو نکتے زیرِغور آئیں گے:

☆حضور ﷺ کا حسن اصل ہے اور [نعوذ باللہ من ذالک]اللہ تعالیٰ کا حسن فروع۔

☆معراج پر جنابِ رسالت مآب ﷺ اپنی مرضی سے تشریف لے گئے تھے۔

اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔پہلی بات اس لیے کہ اللہ کا وجود ''واجب'' ہونے کے بجائے'' ممکن'' ہونے کا احتمال پیدا ہوتا ہے......اور دوسری بات واقعاتِ معراج کے صریح خلاف ہے۔پتہ نہیں شاعر کو''شب معراج کی تفصیل سے'' کیا پتہ چلا تھا؟

قمر رعینی جیسے بالغ نظر شاعر نے جب معراج کی تلمیح کو متنِ شعر بنایا تو عجیب بات کہہ گیا:

''موسیٰ اللہ کے جلووں کے تمنائی تھے
اُنؐ کے دیدار کا اللہ تمنائی ہے''(۲۷)

اس شعر میں اللہ کو نعوذ باللہ دیدارِ محبوب ،حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ سے محروم جان کر یہ خیال نظم کردیا گیا ہے کہ ''اللہ بھی ان کے دیدار کا تمنائی ہے''۔ اس طرح اللہ کی دو صفات کی نفی ہوگئی۔''البصیر'' اور ''الصمد''۔وہ ہرشے کو دیکھ رہا ہے۔اور وہ کسی شے کا محتاج نہیں ہے۔تمنا کرنا محتاجوں کا کام ہے، اللہ کا نہیں۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی شان کا استخفاف:

نعتیہ شاعری میں بعض شعراء صرف حضورِ اکرم ﷺ کی شان ظاہر کرنے کے لیے بلا سند ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جس سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی شان کا استخفاف ہوتا ہے۔مثلاً

قربان ہوا جاتا ہے اس در پہ زمانہ
جس در کا تو دربان بھی جبریلِ امیں ہے(۲۸)

یہاں شاعر روضہء رسول ﷺ کو درِ رسول ﷺ کہہ رہا ہے۔ جبریلِ امین نے تو حضورِ اکرم ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد زمین پر قدم نہیں رکھا۔آخری مرتبہ جبریل امین، ملک الموت کے ہمراہ تشریف لائے تھے اور سلام کے بعد حضورِ اکرم ﷺ کو یہ اطلاع دی تھی کہ ''آج زمین پر اترنے کا میرے لیے آخری دن تھا۔ (۲۹)........... پھر وہ روضہء رسول ﷺ کی دربانی کیسے کررہے ہیں۔دربانی کا منصب تو جبریلِ امین کے پاس اس وقت بھی نہیں تھا جب وہ حضورِ اکرم ﷺ کے پاس وحیء ربانی لاتے تھے۔اس طرح کی باتیں شعراء بہت کرتے ہیں جن سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔

سلطانِ دو جہاں کی یہ عظمت تو دیکھیے
نعلین سر پہ جبریلؑ سا درباں لیے ہوئے(۳۰)

اس شعر کا دوسرا مصرع بحر سے خارج ہے۔لیکن اس مصرعے میں جبریلؑ کی دربانی کے اعلان کے ساتھ ہی ان کے سر پر حضورِ اکرم ﷺ کے نعلینِ مبارک رکھوادیئے گئے ہیں۔یہ صریحاً حضرت جبرائیل علیہ السلام کی شان کا استخفاف ہے۔ابوالفضل قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الشفاء بتعریفِ حقوق المصطفیٰ ﷺ'' میں ''انبیاء اور فرشتوں کی تنقیص کرنے والے کا حکم'' کے عنوان سے ایک پورا باب باندھا ہے۔من گھڑت باتیں کذب کے درجے میں آتی ہیں۔ایسی باتوں سے نعت گو شاعر کو بھی گریز لازم ہے اور نقاد کی ذمہ داری ہے کہ اس پر گرفت کرے۔محقق بھی ان باتوں کا خیال رکھے!

☆حدیثِ قدسی سے انحراف کی مثال:

حدیثِ قدسی وہ حدیث کہلاتی ہے جو قرآنِ کریم کا حصہ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی تلاوت قرآنِ پاک کی طرح کی جاتی ہے۔لیکن اس حدیث کا ’’متن‘‘ اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔یعنی:

’’حدیثِ قدسی وہ کلام ہے جس کے الفاظ تو رسولِ اکرم ﷺ کے ہوں اور اس کے معانی الہام یا خواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتلائے ہوئے ہوں‘‘۔(۳۱)

اس وضاحت کے بعد یہاں ایک حدیثِ قدسی نقل کی جاتی ہے:

’’کُنتُ کَنزًا مَخفِیًّا فَا حبَبتُ عَنْ اُعْرِفَ فَخَلَقْتُ ا لْخَلق‘‘

(میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو خلق کو پیدا کیا میں نے)‘‘۔(۳۲)

یہاں اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کے لیے ’’چھپا ہوا خزانہ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں۔اس حدیث کا علم ہمارے شعراء کو بھی ہے۔لیکن بعض شعراء ،حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کو درجہء الوہیت پر فائز دیکھنے اور دکھانے کی آرزو رکھتے ہیں۔اسی لیے وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جس سے ان کی تمنا بھی پوری ہوجائے اور نبی علیہ السلام کو ،براہِ راست ’’الہٰ‘‘ کہنے کی تہمت سے بھی بچ سکیں۔ایسی ہی ایک کوشش ملاحظہ ہو:

’’آپؐ سے ظاہر ہوا ہے حسنِ ربِ ذوالجلال
کنت کنزاً کا خزانہ آپؐ ہیں بس آپؐ ہیں‘‘ (۳۳)

اس شعر میں شاعر نے ’’کنت کنزاً کا خزانہ‘‘ کہہ کر ’’اللہ رب العزت‘‘ کے بجائے نبیِ کریم ﷺ کی ذاتِ والا صفات کو مخاطب کیا ہے۔نعتیہ شاعری میں اس طرح کے مضامین باندھنا کوئی مستحسن عمل نہیں ہوسکتا۔اس سے اجتناب ضروری ہے۔

☆حدیثوں کی صحیح روایت کے بجائے خیالی مضمون باندھنے کی مثال:

بخاری، مسلم ،بیہقی ،ترمذی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے کچھ روایات نقل کی ہیں

جن کی رو سے آپ ﷺ کے ’’دونوں شانوں کے درمیان بلند گوشت تھا‘‘، یہ مہرِ نبوت تھی۔(۳۴)

ان روایتوں کے برعکس شاعر نے مہرِ نبوت کا مضمون اس طرح باندھا ہے:

سرکارؐ کی جبیں پہ رسالت کی مہر تھی
سینے پہ ثبت ختم نبوت کی مہر تھی(۳۵)

ظاہر ہے یہ تخیلاتی شعر ہے اور حقیقت سے بہت دور جا پڑا ہے۔

☆خیال کو واقعہ بنا کر پیش کرنے کی مثال:

ایسے اشعار پیش کرنے سے پیشتر ڈاکٹر عندلیب شادانی کا عام شاعری پر تبصرہ ملاحظہ ہو۔وہ لکھتے ہیں:

’’معاد کا عقیدہ تو اکثر مذاہب میں پایا جاتا ہے لیکن قیامت کب آئے گی اس کی تعیین کسی نے نہیں کی......ہمارے شعراء خصوصاً چوٹی کے غزل گو جس درجہ حساس واقع ہوئے ہیں ، وہ ظاہر ہے۔بھلا ان سے اس غیر معین حالت کی برداشت کہاں ممکن تھی اور وہ کب تک انتظار کر سکتے تھے۔اس لیے انھوں نے اپنی خیالی دنیا بنائی اور اس دنیا میں پہنچنے کے لیے فرضی طور پر یا تو جلاد محبوب کی چھری سے ہلاک ہوئے یا پھر اس کے جوروستم کے باعث ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دیدی۔پھر قیامت قائم کی۔حشر ونشر کے سامان ہوئے ۔خدائی دربار سجایا اور داورِ محشر کے سامنے فریاد لے کر پہنچے۔چوں کہ یہ حضرات شاعر ہونے کی حیثیت سے گویا ایک ہی ’’امت‘‘ کے افراد ہیں۔اسی لیے حشر میں سب کو تقریباً ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں‘‘۔(۳۶)

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے غزل کے ایسے اشعار پر طنز کیا ہے، جو حشر میں عاشق

کی فریاد پیش ہونے پر محبوب کے خجل ہونے کے تخیلاتی مضامین کے حامل تھے۔ایسے مضامین باندھنا روایتی غزل گوؤں کا بھی شعار رہا ہے اور جدید دور میں بھی کہیں کہیں یہ مضامین نظر آجاتے ہیں۔اس کے باوجود غزل میں تخیلاتی شاعری کرنا ، واقعاتی حوالے سے کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو، بہت زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔لیکن نعت ایک مقدس صنفِ سخن ہے۔یہاں بیان کی صداقت لازمی ہے۔چاہے وہ لمحاتی صداقت ہی کیوں نہ ہو۔شعر گوئی کے وقت جو کیفیت شاعر پر غلبۂ عشقِ رسولﷺ کی طاری ہوجائے وہ بھی لمحاتی صداقت کے ذیل میں آتی ہے۔چنانچہ اس خاص کیفیت کے اظہار کو بھی صداقت ہی کے طور پر قبول کیا جانا چاہیے۔تاہم اس لمحاتی کیفیت کو اسی دنیاوی زندگی کا عکاس ہونا چاہیے۔حشر ونشر کے تخیلاتی بیان کو واقعاتی سطح پر بیان کرنے سے گریز لازم ہے۔ورنہ شاعر خواہ مخواہ دروغ گو قرار پائے گا۔ایسی باتوں پر عاقبت میں گرفت بھی ہوسکتی ہے۔درجِ ذیل اشعار پر ذرا غور فرمایئے:

”دفن کرکے جب مرے احباب آقاﷺ چل دیئے
آکے جلوؤں سے لحد کو جگمگایا شکریہ
پیاس ابھی بڑھنے بھی پائی تھی نہ میری حشر میں
جام کوثر تم نے خود آکر پلایا شکریہ
عیب محشر میں کھلا ہی چاہتے تھے میں نثار
ڈھک کے پردہ اپنے دامن میں چھپایا شکریہ
سوئے دوزخ جب ملائک مجھ کو لے کر چل دیئے
میں ترے صدقے مجھے آکر چھڑا یا شکریہ
شکریہ کیوں کر ادا ہو آپ کا یا مصطفیﷺ
کہ پڑوسی خلد میں اپنا بنایا شکریہ (۳۷)

درجِ بالا اشعار شعری جمالیات سے تو دور ہیں ہی، خالصتاً تصوراتی واقعات پر بھی

مبنی ہیں۔شاعر کا اس دنیا سے رخصت ہوکر لحد میں چلا جانا اور وہاں حضورﷺ کا جلوہ افروز ہونا۔شاعر کا یومِ حشر حضورِ اکرمﷺ کے دستِ مبارک سے کوثر کا پیالہ پینا۔شاعر کے عیبوں کی حضورﷺ کے ہاتھوں ستر پوشی ہونا۔شاعر کے بارے میں دوزخ کا فیصلہ ہوجانا اور حضورِ اکرمﷺ کا شاعر کو فرشتوں کے چنگل سے چھڑانا۔حضورِ اکرمﷺ کا شاعر کو اس سخت گھڑی میں سہارا دینا اور جنت میں لے جاکر اپنے پڑوس میں جگہ عطا کرنا......کیا یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوچکا ہے؟......جواب نفی میں ہی ہوگا!......پھر ان احوال کو اس طرح بیان کیوں کیا گیا کہ ایسا معلوم ہو جیسے یہ تمام واقعات شاعر کے ساتھ پیش آچکے ہیں؟...... اس کی وجہ شاعر کی نفسی کیفیت ہے اور کچھ نہیں۔ہوسکتا ہے شاعر نے کوئی خواب دیکھا ہو۔یہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ شاعر نے اپنے احوال کا تصوراتی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہو!......بہر کیف ، کچھ بھی ہو، بیان میں صداقت کا عنصر قطعی نہیں ہے۔شاعر ابھی اسی دنیائے آب وگل میں ہے تب ہی تو شاعری کررہا ہے......اور اس دنیا میں یہ تمام احوال پیش آنا ممکن نہیں ......ان تمام اشعار میں نہ تو کوئی قرینہ‘خواب کا ہے اور نہ ہی شاعر کی تمنا کا اظہار ہوا ہے۔اگر شاعر اپنی تمنا کا اظہار کرتا تو صیغۂ مستقبل میں بات کرتا اوردرخواست کرتا ہوا نظر آتا کہ آقاﷺ! مجھے آپ کی ذاتِ والا صفات سے ایسی ایسی عنایات کی توقع ہے!اے کاش ایسا ہوجائے!......اس کے برعکس تمام اشعار میں شاعر حضورﷺ سے براہِ راست مخاطب ہے اور عنایاتِ خسروانہ پر آپﷺ کا ”شکریہ“ ادا کررہا ہے۔شکریہ نعمتیں حاصل ہوجانے کے بعد ادا کیا جاتا ہے......اور یہاں یہ تمام نعمتیں ابھی شاعر کو حاصل ہی نہیں ہوئی ہیں......ایسی صورت میں شاعر نے غیر ارادی طور پر حضورِ اکرمﷺ کا شکریہ ادا کرکے اپنے لہجے کو [نعوذ باللہ]طنزیہ بنالیا۔کیوں عام طور پر اپنی توقعات پوری نہ ہونے پر طنزاً کسی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔نیتوں کا حال تو اللہ جانتا ہے ۔ہم تو صرف ظاہر پر حکم لگا سکتے ہیں۔حدیث شریف ہے ”نحن نحکم بالظاھر واللہ یتولی السرائر“(ہم ظاہر پر حکم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سرائر کا ذمے دار ہے، یعنی باطن سے اللہ واقف ہے)۔

اس موقع پر ایک بات اور صاف کرتا چلوں۔بعض لوگ صوفیانہ شطحیات کے اظہار میں بے باک ہوتے ہیں۔شطحیات کیا ہیں ؟ یہ جاننے کے لیے ہم نے سرِ دلبراں دیکھی تو وہاں لکھا ہے:

''شطحیات:جمع ہے شطح کی۔یہ وہ کلمات ہیں جو صوفیائے کرام کی زبان سے مستی و شوق و غلبہء حال میں بے اختیار صادر ہوجاتے ہیں۔جو بظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مگر باطناً کسی سرّ کی جانب ان میں اشارہ ہوتا ہے۔گو ہر شخص ان اشارات کو صحیح طور پر سمجھ نہ سکے۔اس قسم کے کلمات کے متعلق مشائخین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی روش یہ ہے کہ انھیں نہ رد کرتے ہیں نہ قبول، تاوقتیکہ سمجھ نہ لیں''۔(۳۸)

شاہ سید محمد ذوقیؒ کی درج بالا عبارت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم شاعر کے اشعار کو نہ تو قبول کرتے اور نہ ہی رد کرنے کی جسارت کرتے......لیکن یہ معاملہ کائنات کی سب سے سچی اور بعد از خدا بزرگ ہستی جنابِ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حوالے سے نہ صرف بیان ہوا تھا بلکہ مشتہر بھی ہوا (کسی کتاب کی طباعت کا مرحلہ بقائمِ ہوش وحواس ،ہی پیش آتا ہے)اس لیے ہم پر لازم ہوگیا کہ اس کی طرف کچھ تنقیدی اشارے کردیں تاکہ کتاب پڑھنے والوں اورعوامی سطح پر ان اشعار کو دہرانے والوں پر حقیقتِ حال کھل جائے۔شعراء بھی اپنی شاعری میں ایسی باتوں کے اظہار سے گریز کریں‘نقادانِ فن بھی ایسے معاملات میں چوکنے رہیں اور محققین بھی بیدار مغزی کا ثبوت دیں۔

ایک شاعر نے حضورِ اکرمﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہ کے غم کی کیفیت کا خیالی بیان شعروں میں ڈھالا ہے اور ان کو دلاسہ دینے کے لیے حضورﷺ کی صداؤں کا بار بار آنا ذکر کیا ہے۔ان صداؤں کا سنا جانا ممکن تو تھا لیکن یہ کسی مستند حدیث میں مذکور نہیں۔ثانیاً ان صداؤں میں جو تمنائیں اظہار پذیر ہوئی ہیں وہ مزاجِ

نبوت سے متصادم ہیں۔عجیب بات کہ شاعر نے تخیلات کی دنیا سجاتے ہوئے اپنی عاقبت کا بھی خیال نہیں رکھا۔وہ لکھتا ہے:

''کھا کر پچھاڑیں روتی تھیں زہرا جو زارزار
آتی تھیں مصطفیٰؐ کی صدائیں یہ باربار
بیٹی!مرے کلیجے کے ٹکڑے، ترے نثار
نورِ نگاہ میرے نواسوں سے ہوشیار
مہلت ملے تو دونوں کی شادی رچائیو
دولھا دلھن کو میری لحد پر بھی لائیو(۳۹)

افسوس !حضورِ اکرمﷺ کی امت کے شاعر ،مزاجِ رسالت سے آگاہ نہیں ہوسکے!انھیں نہیں معلوم کہ حضورﷺ کی زبانِ حق ترجمان سے ناممکن الوقوع باتوں کا صدور نہیں ہوتا۔نبیﷺ کا یہ مقام بھی قطعی نہیں ہے کہ وہ بہت چھوٹی چھوٹی خواہشات کا اظہار فرمائیں اور وہ بھی کب، جب اس دنیا سے پردہ فرماجائیں!بھلا ننھے معصوم بچوں کی شادی کا خیال قرینِ قیاس ہوسکتا ہے؟لاریب ہٰذا بہتان العظیم!

اصل حقیقت کیا تھی؟ ....حضورِ اکرمﷺ نے پردہ فرمانے سے چند یوم قبل حضرت بی بی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو یہ خبر دیدی تھی کہ آپﷺ کی رحلت کے بعد سب سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی آپﷺ سے ملیں گی!الخصائص الکبریٰ میں امام جلال الدین سیوطی نے حدیث بیان کی ہے:

''طبرانی وبیہقی رحمہما اللہ نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے مرض میں بلایا اور ان سے راز کی کچھ دیر باتیں فرمائیں اور وہ رونے لگیں اس کے بعد ان سے کچھ دیر اور راز میں باتیں فرمائیں اور وہ ہنسنے لگیں پھر میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا مجھے پہلی مرتبہ تو یہ خبر دی کہ

جبریل علیہ السلام ہر سال ہر رمضان میں ایک مرتبہ قرآن کا دور کراتے تھے اور اس سال انہوں نے دو مرتبہ قرآن کا دور کرایا ہے اور مجھے خبر دی کہ کوئی نبی نہیں ہوا مگر اس کے بعد نبی آیا اور اس نے نصف عمر اس کے ساتھ گزاری اور نصف عمر اس کے بعد گزاری اور فرمایا: اے بیٹی! مسلمان عورتوں میں سے کوئی عورت مصیبت میں تم سے اعظم نہیں ہے تو تم صبر میں ادنیٰ عورت نہ ہونا......اور دوسری مرتبہ جو مجھ سے راز میں گفتگو کی تو اس میں مجھے خبر دی کہ میں آپ کی اہل بیت میں سے سب سے پہلے آپ سے ملوں گی اور فرمایا تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو بجز اس کے جو مریم بنتِ عمران رضی اللہ عنہا سے تعلق رکھتی ہو، اس بنا پر میں ہنس پڑی‘‘۔(۴۰)

اس مستند روایت کی موجودگی میں نہ تو یہ ممکن ہے کہ حضرتِ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ایسے بین کیا ہو جیسے شاعر نے لکھا ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی پیاری بیٹی کو اس کے بچوں کی شادی کرنے اور ان کی دلہنوں کو اپنی لحدِ مبارک پر لانے کی تلقین فرمائی ہو!

بچوں کی شادی کا شوشہ تو خود شاعر نے اپنی ذہنی اختراع سے چھوڑا ہے۔ورنہ حضورﷺ نے تو پہلے ہی بتادیا تھا کہ اولاد کے سنِ بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دنیا چھوڑ دیں گی اور یقیناً ایسا ہی ہوا۔حضرت فاطمہ کا وصال ۱۱ھجری میں ہوگیا۔پھر ایسی خواہشات[بچوں کی شادی] کا اظہار زبانِ نبوت سے کروانا کس قدر قبیح اور لائق گرفت فعل ہے اس کا اندازہ راسخون فی العلم ہی کو ہوسکتا ہے۔

☆مسئلہ امتناعِ نظیر:

امام جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب میں ایک عنوان قائم کیا ہے ’’ملأ اعلیٰ پر حضورﷺ کا اسم مبارک‘‘۔ اس عنوان کے تحت ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ہم وہ حدیث

من وعن یہاں پیش کرتے ہیں:

’’حاکم ، بیہقی اور طبرانی رحمہم اللہ نے ’’صغیر‘‘ میں اور ابونعیم اور ابنِ عساکر رحمہم اللہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جب خطا سرزد ہوگئی تو انہوں نے التجا کی ’’اے رب! بہ حقِ محمدﷺ مجھے بخش دے‘‘۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:’’تم نے محمدﷺ کو کس طرح جانا؟‘‘ عرض کیا: ’’جب تونے میرے پتلے کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور جان آفرینی کی، میں نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ عرشِ اعلیٰ کے ستونوں پر **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** لکھا ہوا ہے۔تو میں نے جان لیا کہ جس ذاتِ اقدس کا نام نامی تیرے اسم گرامی کے ساتھ مکتوب ہے یقیناً وہ تیری بارگاہ میں دیگر ساری مخلوق سے اعلیٰ و محترم ہوگا‘‘۔ربِّ عظیم نے فرمایا:’’اے آدم!تم نے ٹھیک سمجھا۔اگر محمدﷺ نہ ہوتے تو میں نہ تم کو پیدا کرتا نہ کائنات کو‘‘۔حدیثِ قدسی ہے۔اللہ عزَّ وجل فرماتا ہے ’’لو لاك لما خلقت الافلاك‘‘۔
اس حدیثِ قدسی کے یہی معنی ہیں یعنی یہ تمام کائنات اور عالم اجساد صدقہ ہے وجودِ باجود جنابِ محمد رسول اللہﷺ کا‘‘۔(۴۱)

گو بعض علماء نے اس ’’لولاک‘‘ والی حدیثِ قدسی پر کلام بھی کیا ہے تاہم نفسِ مضمون پر بیشتر کا اتفاق ہے..........راقم الحروف نے پندرہ سو سال کے شعری سرمائے سے کچھ اشعار منتخب کرکے اپنے ایک مضمون میں یکجا کردیئے ہیں جن میں بالکل درست طریقے سے صحیح روایتوں کا لحاظ کرکے شعراء نے حصر کے ساتھ حضورِ اکرمﷺ ہی کی ذاتِ پاک کو ’’مقصودِ کائنات‘‘ کہاہے۔(’’ہنر نازک ہے‘‘ کےصفحات ۹۶ تا ۱۱۸ ملاحظہ ہوں)۔

شعراء ، ادباء، مغازی نویسوں، سیرت نگاروں اورتاریخ دانوں کے اجماعی مسئلے کو

اردو کے ایک شاعر، بیدمؔ وارثی نے صوفیانہ شطحؔ کے تحت ایک شعر لکھ کر متنازعہ بنانے کی ناکام کوشش کی۔قوالوں نے اس شعر کی تشہیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔میں نے وہ شعر بیدمؔ وارثی کے دیوان میں نہیں پایا۔ہوسکتا ہے کسی اور شاعر کا ہو اور بیدم وارثی سے منسوب کردیا گیاہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شعر کہہ کر شاعر نے اسے قابلِ اشاعت نہیں جانا ہو۔بہر حال وہ شعر منسوب بیدمؔ وارثی ہی سے ہے۔رشید وارثی نے وہ شعر اپنے مضامین میں نقل کیا ہے۔ شعر ہے:

بیدمؔ یہی تو پانچ ہیں مقصودِ کائنات
خیرالنساءؓ، حسینؓ و حسنؓ، مصطفیٰؐ علیؓ (۴۲)

اس شعر میں حدیثِ قدسی کے برعکس حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کے علاوہ چار اور مقدس ہستیوں کو ''مقصودِ کائنات'' قرار دیا گیا ہے۔گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پانچ مقدس ہستیوں میں سے ایک تھے اور شعر میں مذکور مقدس ہستیوں میں بھی چوتھے نمبر پر!..........میرے نزدیک یہ صریح ''شرک فی النبوت'' ہے۔

عقیدت بھی عجیب ہوتی ہے'جب انسان پر اس کا غلبہ ہوجائے تو یہ نبی کو خدا کے درجے تک پہنچانے کی سعی کرتی ہے اور جب کسی بزرگ سے عقیدت ہوجائے تو ان بزرگ کو نبی کا درجہ دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی۔اہلِ تصوف اور شعراء میں بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو نبی علیہ السلام کو خدا کے مرتبے سے چھوٹا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ''احمدؐ'' کا ''میم'' حذف کردیں اور ''احد'' پکاریں۔اسی طرح اپنے اپنے بزرگوں کو نبی اور خضر سے بھی بلند مقام پر دیکھنے اور دکھانے کے آرزومند حضرات کی بھی کمی نہیں ہے......دور کیوں جائیں، علامہ اقبال بھی جب حضرت محبوبِ الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت کہتے ہیں تو فرماتے ہیں:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا(۴۳)

لیکن اس کے باوجود اقبال کی دینی بصیرت نے حضورِ اکرم ﷺ کے مرتبے کا استخفاف کبھی گوارا نہیں کیا۔ بلکہ شرک فی النبوت کی جڑ کاٹنے کے لیے انہوں نے برملا یہ کہہ دیا:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ ایماں کردہ ای(۴۴)

(اے [نبیءمکرم ﷺ] آپ کی ذات وہ ذات ہے جس کے آنے کے بعد نبوت کا دروازہ اس طور بند ہوا کہ اب ہر مفہوم میں نبوت شرک ٹھہری۔آپ ﷺ نے محفلِ کائنات کو شمعِ ایمان کے نور سے روشن فرمادیا)۔

بیدم وارثی کا شعر تو ان لوگوں کے لیے جو حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم اور ان کے جانوادے سے محبت کرتے ہیں (نعوذ باللہ) حدیث اور قرآن کے احکامات کے مساوی ہے۔اس لیے جب میں نے اپنے مضامین میں اس شعر کی طرف توجہ دلائی تو رشید وارثی نے مجھے بلا تاخیر ناصبیت زدہ ذہنیت کا مالک قرار دیدیا(۴۵)

رشید وارثی کے مزاج کی جھنجھلاہٹ کا یہ حال تھا کہ جب ان کے اشعار میں عروضی اسقام کی نشاندہی کی گئی تو کوئی علمی دلیل دینے کے بجائے انہوں نے یہ لکھ کر جان چھڑانے کی کوشش کی کہ

''ہمارے نعتیہ ادب کے بعض تنقید نگاروں میں یہ لائق توجہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ فنِ عروض میں کسی حد تک شد بد حاصل کرلینے کے بعد اسی کو نعتیہ تنقید نگاری کی اساس سمجھ کر اس پر انحصار کربیٹھتے ہیں۔علمِ عروض کی کوئی شرعی اہمیت تو خیر ہے ہی نہیں''(۴۶)

............اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو آدمی اپنی ذرا سی غلطی ماننے کے لیے تیار نہ ہو اور اپنا موقف منوانے کے لیے علم کی کسی بھی شاخ(Discipline) کو رد کرنے پر آمادہ ہوجائے' بھلا وہ اپنے گروہ کے کسی شخص کی بڑی غلطی کس طرح تسلیم کرسکتا ہے؟......چنانچہ

یہی ہوا کہ رشید وارثی نے میرے موقف کو رد کرنے کی کوشش کی اور جب انہیں کوئی ایسی حدیث نہیں ملی جس میں حضورِ اکرم ﷺ کے علاوہ بھی کچھ بزرگوں کو ’’مقصودِ کائنات‘‘ قرار دیا گیا ہو‘ تو انہوں نے تاویلات کا سہارا لیا۔ظاہر ہے سند نہ ملنے پر تاویلات ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے......انہوں نے اپنی کتاب ’’اردونعت کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ‘‘ کے صفحات ۳۴ سے ۳۹ تک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے کے لیے کچھ ایسی احادیث پیش کردیں‘ جن سے ان حضرات کے فضائل کا اظہار ہوتا ہے۔حالآنکہ سب جانتے ہیں کہ مناقب کی بہت ساری احادیث دیگر اصحاب رضوان اللہ علیہم اور ازواجِ مطہرات سلام اللہ علیھن کے لیے بھی موجود ہیں۔ایسی صورت میں تو کوئی بھی ان احادیث کا سہارا لے کرکسی بھی شخصیت کومقصودِ کائنات ٹھہرا سکتا ہے۔

بیدم وارثی کے مذکورہ شعرکی وکالت کرتے ہوئے رشید وارثی نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن اپنی دلیل منوانے کے لیے انہیں کوئی حدیث تو کیا ملتی‘ چودہ سو سال کے شعری سرمائے سے‘مذکورہ شعر کے قریب المفہوم کوئی شعربھی نہیں ملا۔حد ہے کہ انہوں نے اپنا بھی کوئی شعر نقل نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کی کتاب میں جا بجا اس حقیقت کا اظہار ہوا ہے کہ ’’مقصودِ کائنات‘‘ صرف اور صرف حضورِ اکرم ﷺ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔انہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۴۹ پرلکھا ہے:

> ’’**باعثِ تخلیقِ کائنات**، فخرِ موجودات، مظہرِ شان کبریا، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ اقدس میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے ’’**انک لعلیٰ خلق عظیم**‘‘۔(۴۷)

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوگیا کہ رشید وارثی نے بیدمؔ وارثی کے شعرکی تعریف و توصیف میں اور اس کےنفسِ مضمون کی صحت ظاہر کرنے میں زورقلم تو صرف کردیا لیکن خود ان کے تحت الشعور میں حقیقتِ محمدیہ ﷺ ٹھیک ٹھیک بیٹھی ہوئی تھی اسی لیے انہوں نے اپنی کتاب میں ’’**باعثِ تخلیقِ کائنات**‘‘ صرف حضور علیہ السلام کو جانا اور لکھا ہے۔لیکن

گروہی عصبیت ان پر اتنی غالب آئی کہ بیدم وارثی کی وکالت میں بیجا دلائل دینے کی کوشش میں وہ قطعی پیچھے نہیں رہے۔اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطائیں معاف فرمائے (آمین!)﴿☆﴾

راقم الحروف کو اس شعر پر گفتگو کرتے ہوئے ۱۸۲۰ء میں مولوی اسماعیل دہلوی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آرہی ہے ڈاکٹر الف۔د۔نسیم نے علامہ اقبال کی کتاب ’’جاوید نامہ‘‘ کی شرح میں لکھا ہے:

> ’’برصغیر میں انگریزی دور کی چھتری کے تحت بعض ہندوستانی مسلمانوں نے جوطرح طرح کے اختلافی مسائل کھڑے کردیئے تھے ان میں سے ایک یہ مسئلہ رحمۃ للعالمین بھی تھا اور ایک عالم جن کا نام محمد اسمٰعیل تھا اس مسئلے پر خاص طور پر بحثیں کررہے تھے وہ چاہتے تھے جس طرح اللہ نئے جہان پیدا کرسکتا ہے نئے رحمتِ عالم بھی پیدا کرسکتا ہے۔یہ اس کے لیے مشکل نہیں ۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرح کا اور پیغمبر پیدا کرنا اس کی قدرت میں ہے اس طرح ہر جہان کے لیے ایک الگ رحمتِ عالم ہوسکتا ہے۔جبکہ قرآن نبیء کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہی جملہ عالموں کی رحمت قرار دیتا ہے۔اس لیے کسی اور جہان میں کسی نئے رحمتِ عالم کے وجود کا ہونا ممکن نہیں۔جہان چاہے لاکھوں ہوں رحمتِ عالم سب کے لیے صرف ایک ہی ہے جس کو خود خالقِ کائنات نے رحمۃ للعالمین یعنی جملہ جہانوں کے لیے رحمت قراردیا ہے اور وہ ہیں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم‘‘۔(۴۸)

غالبؔ نے بھی مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے اصرار پر ایک مثنوی ’’امتناعِ نظیر‘‘ لکھی تھی۔حالی نے یادگارِ غالب میں یہ پورا واقعہ بھی درج کیاہے۔وہیں غالبؔ کا یہ شعربھی درج ہے:

''منشاءِ ایجادِ ہر عالم یکیست
گردو صد عالم بود خاتم یکیست'' (۴۹)

(ہر عالم کی پیدائش کا منشا صرف ایک ہے۔اگر دو صد[سینکڑوں] عوالم بھی ہوں تب بھی ''خاتم'' ایک ہی ہوگا۔)

راقم الحروف نے بیدم وارثی کے مذکورہ شعر کو مسئلۂ امکانِ نظیر سے جوڑا تو روح کانپ گئی۔حضورﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اس لیے ''خاتم النبیین'' کا منصب حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ والا صفات کی یکتائی کا مظہر ہے۔محولہ حدیثِ قدسی بھی حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات ہی کو مقصودِ کائنات ٹھہراتی ہے۔ان شواہد اور اجماعِ امت کے تناظر میں بیدم وارثی کا شعر عقیدے کے طور پر قبول کرلینا حضورِ اکرمﷺ کی یکتائی کے تصور کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔اس لیے اس طرح کے خیالات سے شعراء،نقاد اور محققین کو اجتناب کرنا چاہیے۔

حضورِ اکرمﷺ کے اصحاب یا ان کے قرابت داروں کی محبت لاکھ ابھارے ، عقیدہ درست رہنا ضروری ہے۔حضور نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مقام کو بڑھا کر اللہ کے مرتبے پر پہنچانا بھی گمراہی ہے اور حضورِ اکرمﷺ کے مرتبے کے برابر کسی اور کا مرتبہ ماننا بھی گمراہی ہے۔نبیِ کریم کی شانِ یکتائی پر جس بات سے بھی حرف آتا ہو ، وہ مرتبۂ رسالت کے استخفاف کا باعث ہوگی۔اس لیے ہر نعت گو شاعر کا فرض ہے کہ ایسے خیالات منظوم کرنے سے اجتناب کرے اور ہر نقاد کا فرض ہے کہ ایسے خیالات جس بیت یا نظم میں نظر آئیں ان پر قرینے سے تنقید کرے۔یہی فریضہ محقق کا بھی ہے۔

☆الفاظ کے استعمال میں احتیاط کے تقاضے:

الفاظ کے استعمال کے ضمن میں عام بول چال کے مواقع پر بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری تو کام ہی الفاظ کے استعمال کا ہے۔اس لیے اس فن کی آبیاری کے لیے شاعر میں الفاظ کو پرکھنے کی صلاحیت ہونا چاہیے۔الفاظ تو الفاظ ان کی شعر

میں بُنت بھی درست ہونا ضروری ہے ورنہ بات کچھ کی کچھ ہونے کا خدشہ پیدا ہوجاتا ہے۔مولوی نجم الغنی رامپوری نے بحرالفصاحت میں لکھا ہے:

''ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا اور اس نے پڑھنا شروع کیا۔جیسے ہی کہ پیش مصرع مطلع کا پڑھا:

ع اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

فرمایا کہ تو عروض جانتا ہے؟ اور شعر کے وزن و تقطیع سے باخبر ہے؟عرض کیا کہ مجھے یہ چیزیں معلوم نہیں۔فرمایا کہ اگر عروض دان ہوتا تو تیری گردن مروادیتا۔ شاعر بیچارہ گھبرا گیا کہ کیا خطا واقع ہوئی۔ مہربانی سے آگے طلب کرکے فرمایا کہ جب اس مصرع کی تقطیع کریں تو اس طرح وزن ہوگا:

اے تاجِ دو ''مستفعلن'' لت بر سر ت ''مستفعلن'' از ابتدا ''مستفعلن'' تا انتہا ''مستفعلن''۔''لت بر سرت'' بدیُمن اور بد فال ہے۔شاعر کو ایسی چیزوں سے خبردار رہنا چاہیے''۔(۵۰)

جہانگیر بادشاہ کے لیے جو قصیدہ پڑھا گیا تھا اس میں لفظ غلط نہیں تھا صرف یہ عیب تھا کہ تقطیع میں ''لت برسرت'' آتا تھا جس کا مطلب ہے ''تیرے سر پر لات''۔اس مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعری میں نہ صرف لفظوں کا درست استعمال بڑا ضروری ہے بلکہ لفظوں کی ایسی تشکیل سے بھی بچنا ضروری ہے جن کی تقطیع کی جائے تو بات کچھ کی کچھ بن جائے۔

مجھے لفظوں کے غلط استعمال کی بہت سی مثالیں ملی ہیں لیکن طوالت سے بچنے کے لیے صرف چندایک پیش کردیتا ہوں۔

☆اللہ کے ذاتی نام کے غلط تلفظ کی مثال:

قمر رعینی لکھتے ہیں:

''[میں نے]لفظ اللہ کو فعلن کے وزن پر ا لَّا نہیں لکھا بلکہ اس میں اللہ کی ہائے ہوز کو

واضح طور پر مفعول کے وزن پر باندھا ہے یعنی

ع اللہ کو ا لَاَّ نہیں اللہ کہا(۵۱)

مجھے بھی اس بات پر اصرار کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام کو مخفف نہیں کرنا چاہیے، چاہے شعری ضرورت کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس فعلِ قبیح سے بچنا لازمی ہے۔اللہ کا لفظ پانچ حرفی ہے(بروزن مفعول) اور اس کا ہر لفظ پورا پڑھا جاتا ہے۔اس لیے اسے کسی طور چارحرفی (بروزن فعلن) بنا کر نہیں لکھنا چاہیے۔

☆''کبریا'' کا بے محل استعمال:

کبریا کا لفظ ہمارے ہاں بڑے بڑوں نے ''اللہ'' کے صفاتی نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔شعراء نے کبھی اس طرف دھیان نہیں دیا کہ ''کبریا'' کو پہلے پہل جس نے بھی اللہ کے صفاتی نام کے طور پر استعمال کیا ہوگا اس نے عربی قاعدے سے ناواقفیت کی بنا پر یا اپنے غلط اجتہاد کی بنا پر ایسا کیا ہوگا۔حالانکہ یہ صرف صفت ہے اسمِ صفت نہیں ہے۔قرآنِ کریم میں یہ لفظ صرف دو بار آیا ہے۔سورۂ یونس اور الجاثیہ میں:

ا۔وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط ......

اور حاصل ہوجائے تم دونوں کو سرداری اس ملک میں۔(۵۲)......

۲۔وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ص ......

اور اسی کو سزاوار ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں۔(۵۳)

قرآن کریم کی درجِ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ کبریا بڑائی کو کہتے ہیں ''بڑے'' کو نہیں۔اللہ کے لیے ''اکبر'' بھی اسمِ ذات (اللہ) کے ساتھ بولا اور لکھا جاتا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ یہ غلطی اتنی عام ہوئی کہ اردو لغت بورڈ، کراچی، میں بھی ''کبریا'' کے معنی خدا تعالیٰ کے صفاتی نام کے ہی دیئے ہیں۔حالانکہ اسی لغت میں اس لفظ کے معنی بزرگی، عظمت، شان وشوکت، جاہ وجلال، قدرت اور فضیلت بھی رقم ہیں اور میر کا یہ شعر بھی درج ہے جو اس لفظ کے بالکل درست استعمال کی طرف اشارہ کررہا ہے:

''میرؔ ناچیز مشتِ خاک اللہ
ان نے یہ کبریا کہاں پائی''(۵۴)

ان حقائق کی روشنی میں ''کبریا'' کو اللہ کے صفاتی نام کے طور پر برتنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

☆میٹھے نبی ﷺ:

ایک صاحب نے بلا سوچے سمجھے حضورِ اکرم کے لیے میٹھے نبی ﷺ کی ترکیب استعمال کی۔میٹھا، اشیاء کی شیرینی کے لیے تو استعمال ہوتا ہے۔افراد کے لیے اس کے استعمال میں خوبی کے بجائے ذم کا پہلو ہے۔اللہ رب العزت نے قرآنِ کریم میں لفظ ''راعنا'' کے استعمال کی ممانعت کے ذریعے واضح فرمان جاری کردیا ہے کہ نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کیا جائے جو ''ذومعنی'' ہو اور جس میں اچھائی اور برائی کے دونوں معنی پائے جاتے ہوں۔اس لیے میٹھے نبی ﷺ کہنا بھی حضورِ اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کے مترادف ہے۔پہلے مطلع ملاحظہ فرمائیں:

''عرشِ علیٰ سے اعلیٰ میٹھے نبی ﷺ کا روضہ
ہے ہر مکاں سے بالا میٹھے نبی ﷺ کا روضہ''(۵۵)

جس نعتیہ غزل کا مطلع اوپر درج کیا گیا ہے اس کے بارہ اشعار ہیں۔اس طرح ''میٹھے نبی ﷺ'' کی ترکیب تیرہ مرتبہ دہرائی گئی ہے۔اب لفظ ''میٹھے'' کے وہ استعمالات ملاحظہ فرمایئے جو افراد کے لیے ہوں تو کیا معانی دیتے ہیں:

میٹھا: ا۔(کنایۃً) وہ شخص جس کی باتیں اور حرکتیں عورتوں کی سی ہوں،زنان منتری، زنانہ، زنخا، ہیجڑا(فرہنگِ آصفیہ)......۲۔میٹھا ٹھگ: میٹھی میٹھی باتیں بنا کر ٹھگنے والا یار، دغا باز، بددیانت، جھوٹا دوست، بے ایمان دوست؛ ٹھگوں کے اس فرقے کا آدمی جو میٹھا تیلیا(ایک زہر) کھلا کر مسافروں کو ہلاک کرتا اور لوٹ لیتا ہے، میٹھے والا(پلیٹس ؛فرہنگِ آصفیہ؛مخزن المحاورات)۔۳۔میٹھی چھری: ا۔(مجازاً) دشمن نما دوست، وہ شخص جو دوستی کے پیرائے میں

دشمنی کرے، وہ شخص جو بظاہر دوست اور بباطن دشمن ہو، ظاہر میں خوشنما اور اصل میں مضرت رساں۔(۵۶)

اس میں کچھ شک نہیں کہ ''میٹھا'' اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو حلیم الطبع، بردبار، دھیمے مزاج کا آدمی ہو اور جسے غصہ نہ آئے ......لیکن یہ بات طے ہے کہ جس لفظ میں برائی کا کوئی پہلو پوشیدہ ہو وہ خیرالبشر جنابِ رسول اللہ، علیہ الصلوٰ ۃ والسلام کے لیے استعمال کرنا بے ادبی اور روحِ قرآن کے منافی ہے۔چنانچہ اس لفظ کے استعمال سے ازحد گریز کی ضرورت ہے۔

☆مدینہ منورہ کے لیے یثرب کا استعمال:

حضورِ اکرمﷺ کے ورودِمسعود سے قبل جوشہر''یثرب'' کہلاتا تھا وہ آپﷺ کی آمد کے بعد''مدینۃ النبیﷺ'' ہوگیا۔اس لیے نعت گوشعراء کے لیے یثرب کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں۔پھر اس لفظ کے معانی بھی اچھے نہیں ہیں۔بعض احادیث میں بھی مدینہ منورہ کو''یثرب'' کہنے کی ممانعت آئی ہے۔اس موضوع پررشید وارثی کی کتاب میں ایک تفصیلی مضمون بعنوان''مدینہ منورہ کو یثرب کہنے کی ممانعت'' ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔(۵۷)

قرآن کریم میں سورۂ احزاب [۳۳] کی آیت نمبر۱۳ میں لفظ یثرب ، منافقین کے قول کے طور پرآیا ہے:

وَاِذْقَالَتْ طَّآ ئِفَةٌ مِّنْھُمْ یٰٓاَھْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمْ

(اور جب کہ ان (منافقوں) کی ایک پارٹی (یعنی اوس بن قبطی اور اس کے ساتھیوں) نے کہا۔اے یثرب والو!(یہاں) تمہارے قیام کا کوئی موقع نہیں۔(۵۸)

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیری حاشیے میں اطلاع دی ہے:

''بغوی نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے مدینہ کو یثرب کہنے کی ممانعت فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا : یہ طابہ ہے۔حضورﷺ نے مدینہ کو یثرب کہنا اس لیے پسند نہیں فرمایا کیوں

کہ یثرب کا لفظ ثَرَبَۃٌ ، یَثْرِبُہٗاور ثَرَّ بَہٗ اور ثَرَّبَ عَلَیْہِ اور اَثْرَبَہٗ سے مشتق ہے(یعنی مادہ سب کا ایک ہے لیکن استعمال فَعَلَ یَفْعَلُ اور تَفْعِیْل اور افعال سے ہوتا ہے)اور ثرب ہو یااثراب یاتثریب سب کا معنی ہے ملامت کرنا، عاردلانا،کسی جرم پر ذلیل کرنا اورمُثْرِبْ اس شخص کو کہتے ہیں جوبخشش میں دراز دست نہ ہو۔قاموس''۔(۵۹)

☆نبیِ اکرمﷺ کوشہنشاہ کہنا:

بخاری شریف میں ''باب ابغض الاسماء الی اللہ تبارک و تعالیٰ'' کے تحت ایک حدیث آئی ہے:

''قال قال رسول اللہ ﷺ اخنی الاسماء یوم القیٰمۃ رجل تسمی ملک الاملاک'' (حضورِ اکرمﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ نام اس شخص کا ہوگا جو''ملک الاملاک'' کہلاتا ہوگا۔ ملک الاملاک کے معنی ''شاھانِ شاہ'' لکھے ہیں۔(۶۰)

☆روزِ جزا کی پرسش سے بے خوفی:

نبیِ اکرمﷺ کی طرف سے''روزِ جزا'' اپنے امتی کی شفاعت کرنے کا معاملہ صد فی صد اللہ کے''اذن'' پرمنحصر ہے۔اللہ رب العزت نے خودفرمادیا ہے :

''مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ م بَعْدِ اِذْنِہٖ ط'' (۶۱)

''نہیں ہے کوئی شفاعت کرنے والامگر بعد اس (اللہ) کی اجازت کے''

ایسی صورت میں کسی شاعر کا یہ کہنا کہ میری شفاعت تو ہو ہی جائے گی اس لیے مجھے روزِ جزا کی پرسش کا کوئی خوف نہیں ہے، بہت بڑی جسارت ہے۔امید بڑی اچھی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ نے نا امیدی سے منع بھی فرمایا ہے۔لیکن کسی تصور کو قطعیت کے ساتھ اس طرح شعری بنت میں لانا کہ امت کے گناہگار'قیامت سے بے خوف ہوجائیں، قطعی

مناسب نہیں ہے۔مثال کے طور پر ایک شعر کی تضمین کے تین مصرعے اور وہ شعر ،یعنی خمسے کا ایک بند پیشِ خدمت ہے:

''گنہ کا غم نہیں حافظ، خطا کا غم نہیں حافظ
ہلالِ اعمالِ بد کی انتہا کا غم نہیں حافظ
یہ دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو سزا کا غم نہیں حافظ
مجھے کچھ پرسشِ روزِ جزا کا غم نہیں حافظ
کرم سرکار کا غالب ہے میرے بارِ عصیاں پر''(۶۲)

☆شاعرانہ تعلی:

شعری ادب میں شاعرانہ تعلی کا پایا جانا ایک معمول کی بات ہے۔لیکن نعت میں تعلی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔اس وادی میں داخل ہونے والوں کو یہاں کے تقدس کا احساس ہوتا ہے یا ہونا چاہیے اس لیے یہاں بڑے بڑے شعراء اپنے اشعار میں عجز کا اظہار کرتے ہیں۔ البتہ بعض نعت نگاروں نے اس مقدس صنف سخن کی تخلیق کے حوالے سے بھی تعلی کے مضامین باندھنے کی جسارت کی ہے۔اس سلسلے میں اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو توفیقِ مدح مصطفےٰ ﷺ حاصل ہونے پر کچھ فخر کیا جاسکتا ہے ، لیکن بعض شعراء کے یہاں تعلی کا ویسا ہی شاعرانہ غرّا پایاجاتا ہے جیسا کہ غالب کے درجِ ذیل شعر سے مترشح :

''ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما''

(اے غالب ، ہم تو اس مقام و مرتبے (شاعر ہونے) پر راضی نہ تھے۔خود شاعری نے یہ خواہش کی کہ وہ ہمارا فن بن جائے)۔(۶۳)

رشید وارثی کی کتاب میں ''اردو نعت اور شاعرانہ تعلی'' کے عنوان سے ایک بھر پور مضمون موجود ہے۔لیکن اس میں انہوں نے شعری مثالیں دیتے ہوئے شعراء کے نام حذف کردیے ہیں۔بہر حال اس موضوع پر ان کی تحریر لائق مطالعہ ہے۔رشید وارثی نے تخلص

حذف کرکے ایک شعر نقل کیا ہے، جسے یہاں مثال کے طور پر مع ان کے تبصرے کے پیش کیا جاتا ہے:

''خود بینی وخود ستائشی انسان کو کس قدر خود فریبی میں مبتلا کردیتی ہے،
اس کا اندازہ تعلی پر مبنی اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے:

(تخلص)شرف ملا ہے یہ نعتِ رسول ؐ سے
جس جا ہے ان کا نام، وہیں تیرا نام ہے''(۶۴)

اسی طرح 'اعجاز رحمانی کا ایک شعر ہے:

''کوئی حسانؓ ہے کوئی اعجاؔز ہے
کیسے کیسے ہیں مدحت سرا آپؐ کے''(۶۵)

اس شعر پر ذرا غور فرمایئے کہ شاعر موصوف نے خود کو صحابی اور شاعرِ رسول ﷺ ، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے برابر ظاہر کرکے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ کیسے کیسے اچھے ،معتبر، بڑے،قادرالکلام اور عظیم شعراء، آپ ﷺ کی مدحت میں مصروف ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کی مدح سرائی کی توفیق مل جانا 'بہت بڑی سعادت ہے لیکن کسی شاعر کو اس دربار میں اس طرح کی تعلی کی جسارت قطعی نہیں کرنی چاہیے۔شاعر نعتیہ شاعری کرکے پیروِ حسانؓ ضرور ہوگیا ہے لیکن حضرت حسانؓ کا ہم مرتبہ نہ ہوا ہے ، نہ ہوسکتا ہے ۔ اس شعر میں ''آپ ﷺ'' کی ضمیر کو ''تخاطب'' سمجھا جائے تو بات انتہائی درجہ گستاخی آمیز ہوجاتی ہے۔ کیا حضورِ اکرم اپنی مدح کے سلسلے میں کسی شاعر کے محتاج ہیں؟......کیا خالقِ کائنات نے ان کی توصیف قرآن میں کچھ کم بیان کی ہے؟......کیا حضرتِ حسانؓ نے کبھی کوئی تعلی آمیز شعر کہا تھا؟......سارے سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ پھر ایک ادنیٰ شاعر کو ایک عجمی زبان میں کچھ نعتیہ اشعار کہہ لینے پر ایسے ہی بغلیں بجانی چاہئیں؟......بہر حال دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ رب العزت شاعر کو توبہ کی توفیق بخشے(آمین)۔

چلتے چلتے لفظوں کی جستجو اور تلاش کی پُر خلوص اور قابلِ تحسین کوشش کا ایک واقعہ

بھی سن لیجیے:

کلیاتِ حفیظ تائب میں خورشید رضوی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے حفیظ تائبؔ کے شعورِ نقد پر روشنی پڑتی ہے۔حافظ افضل فقیر نے تائبؔ کے ایک شعر میں لفظ ''حاصل'' سے بے اطمینانی ظاہر کی تھی ۔کچھ عرصے بعد تائبؔ نے ''حاصل'' کو''غایت'' سے بدل کر انہیں سنایا او رانہوں نے اتفاق فرمایا کہ واقعی لفظ ''غایت'' ہی وہ غایت تھی جس تک طائر خیال رسائی چاہتا تھا اور پھر کہا:

''مولانا ! تمہاری جستجو کی بھی داد دینی پڑتی ہے''

اس واقعے سے لفظوں کے استعمال میں احتیاط اورمشورہ قبول کرنے میں انا کی سپر اندازی کی قابلِ تحسین اور لائقِ تقلید مثال سامنے آتی ہے۔لفظ کی تبدیلی کے بعد شعری حسن میں اضافے کی صورت بھی بڑی واضح ہے:

وہ کہ ہے سوز و ساز نبض حیات
وہ کہ ہے حاصلِ سنین و شہور
وہ کہ ہے سوزوسازِ نبضِ حیات
وہ کہ ہے غایتِ سنین و شہور(٦٦)

غور فرمایئے۔ حاصل کے لغوی معنی کھیتی کی پیداوار کے ہیں جبکہ لفظ'' غایت'' غرض، مقصد اور مطلب کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات ،کائنات کی تخلیق کا سبب ہے' حاصل نہیں!

نعتیہ ادب میں تخلیقی ،تنقیدی اور تحقیقی کام کرنے کے لیے جس آ گاہی کی ضرورت ہے وہ صرف چند نکات ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتیں بے کنار ہیں۔لیکن امید کی جاتی ہے کہ ان چند نکات کی روشنی میں قارئین مزید نکات خود تلاش کرلیں گے کیوں کہ ہر تخلیق اپنے اندر ہی تنقیدی اور تحقیقی جہتیں بھی رکھتی ہے۔

اختتام پر' اہم ترین نکتہ یہ پیش کرنا ہے کہ شاعری کرتے ہوئے ،اسے پرکھتے

ہوئے اور اس پر تحقیق کرتے ہوئے انتہائی معروضیت (Objectivity) کا مظاہرہ کرنا لازمی ہے۔

مآخذ ومنابع:

۱۔ Kalim-ud-din Ahmad,The Meaning of Criticism,(National Book Foundation, Islamabad,First Edition 198,) page 21.

۲۔ Ibid page 11

۳۔وقارصدیقی اجمیری، حرف حرف خوشبو، فرید پبلیشرز، اردوبازار،کراچی،۱۹۹۸ء،ص ۱۸

۴۔ماجد خلیل، روشنی ہی روشنی،دبستانِ وارثیہ، اورنگی ٹاؤن،کراچی،۲۰۰۱ء،ص ۲۳

۵۔کلیاتِ میرتقی میرؔ،مجلسِ ادب،لاہور،طبع دوم جون ۱۹۸۶ء

۶۔عابد حسین عابدؔ، زمزمہء نور، رشید پرنٹنگ 76 پوش آرکیڈ پلازہ، جی نائن مرکز، اسلام آباد، جنوری۲۰۱۴ء، ص14۔ص43

۷۔منظر پھلوری، ماہِ حراﷺ، احسن پبلی کیشنز، فیصل آباد،۲۰۱۴ء ،ص25

۸۔عکّاس،اسلام آباد، جلد 15 شمارہ ۴ تا ۱۲ ، اپریل تا دسمبر۲۰۰۸ء، مدیر: طارق نعیم،ص ۴۵

۹۔فرقان ادریسی،نعمتِ عظمٰی، حلقہءفکرودانش، کراچی، ۲۰۱۳ء،ص ۶۴

۱۰۔عارفہ خان عظیمی عارفہؔ،محبوبِ کبریا محمدﷺ، عثمان عمر باسط پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۴۹

۱۱۔ریاض مجید، ڈاکٹر، نعت...... ''موضوعِ محض'' سے ''معجزہءفن'' تک، مشمولہ نعت رنگ ۲۲، کراچی،ستمبر ۲۰۱۱۔ص ۱۱

۱۲۔نعت رنگ شمارہ ۲۰ ص ۱۲۸

۱۳۔ایضاً ص ۱۲۵

۱۴۔ایضاً ص۱۲۲

۱۵۔امام حاکم ،المستدرک، ج اول،ص ۱۱۵......ابنِ ماجہ حدیث نمبر:۳۹۳۹، ج ۲،ص ۵۶۰

۱۶۔رزی جے پوری، جواہرالنعت ،(فیڈریل بی ایریا، کراچی) ۱۹۸۱ء،ص ۶۲

۱۷۔ماہِ حراص......ص ۷۶

۱۸۔ایضاً......ص ۸۶

۱۹۔ایضاً ص......۶۳ ،۶۷، ۶۹

۲۰۔حبیب الرحمٰن صدیقی، علامہ، کاندھلوی،''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت''، حصہ اول، (الرحمٰن پبلشنگ

ٹرسٹ، مکان نمبر۳۔ ۷۔اے، بلاک نمبر ا، ناظم آباد، کراچی) س۔ن۔، ص ۲۲۳

۲۱۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ، ج دوم، (مکتبہء اسلامیہ، لاہور) جون ۲۰۰۶ء، ص ۹۵

۲۲۔القرآن : الاسرٰی، آیت ا ۲۳۔القرآن: النجم، آیات ۱۶ تا ۱۸

۲۴۔پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، جلد پنجم، ۲۵

۲۵۔ہلال جعفری، کشکولِ ہلال، (بزم شعرو ادب ، اسلام آباد)، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۰

۲۶۔ایضاً ص ۲۳۸

۲۷۔قمر رعینی، ولائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ، (کتاب ساز پبلی کیشنز، راولپنڈی کینٹ)اشاعت اول رجب ۱۴۲۳ھ، ص ۸۹

۲۸۔زمزمہء نور، ص 43

۲۹۔توفیق الحکیم، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، ترجمہ: عطیہ خلیل عرب، شاہکار بک کلب، بارسوم: ۱۹۷۵ء، ص ۴۲۸

۳۰۔زمزمہء نور، ص 71

۳۱۔احادیثِ قدسیہ، مکتبہ رحمانیہ (اردو بازار، لاہور) س۔ن۔ص ۱۴

۳۲۔ظہور الحسنین شاہ، سید، ظاہر یوسفی تاجی، (ناشر محمد سعید خاں نور بھائی جعفر بھائی، مشن روڈ، کراچی) ۱۹۶۲ء، ص ۵۱......ذوقیؒ، سرِ دلبراں، (نارتھ ناظم آباد، کراچی) ص ۴۶۰

۳۳۔شہپرِ جبرئیل، ص ۸۴

۳۴۔جلال الدین سیوطی، امام، الخصائص الکبریٰ فی معجزات الوریٰ، ج اول (مکتبہ اعلیٰ حضرت، دربار مارکیٹ، لاہور) ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۰

۳۵۔غوث متھراوی، بلاوہ، (ڈیفینس اتھارٹی فیز فائیو، ایکس ٹینشن، کراچی) نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۵

۳۶۔عندلیب شادانی، ڈاکٹر، دورِ حاضر اور غزل گوئی، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور) ۱۹۵۱ء، ص ۷۹

۳۷۔عطار، محمد الیاس، مغیلانِ مدینہ، (مکتبہ المدینہ ،شہید مسجد، کھارادر، کراچی) س۔ن۔، ص ۴۱

۳۸۔شاہ محمد ذوقی، سرِّ دلبراں، (محفل ذوقیہ، نارتھ کراچی) طبع پنجم ۱۴۱۸ھ، ص ۲۳۲

۳۹نسیم امروہوی، مسدس نسیم مشتمل بر نعت و رحلت رسولِ کریمؐ، (ناشر: سید علی امروہوی، فیڈرل بی ایریا کراچی) س۔ن۔، ص ۸۷

۴۰۔الخصائص الکبریٰ، ج دوم، ص ۵۸۶

۴۱۔ایضاً ج اول ص ۵۱

۴۲۔رشید وارثی، اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، شریعت اسلامیہ کے تناظر میں، (نعت ریسرچ سینٹر، کراچی) اپریل ۲۰۱۰ء، ص ۳۱۱

۴۳۔اقبال ،کلیاتِ اقبال، اردو، سروسز بک کلب، ۱۹۹۵ء، ص ۹۶

۴۴۔کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، مرتبہ: ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول: ۲۰۰۴ء، ص ۹۹

۴۵۔اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ، ص ۲۳

۴۶۔ایضاً ص ۱۹ ۴۷۔ایضاً ص ۴۹

۴۸۔ا۔د۔نسیم ، ڈاکٹر، شرح جاوید نامہ، (شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور)، س۔ن۔، ص ۱۷۷

۴۹۔حالی، مولانا الطاف حسین، یادگارِ غالب، (خزینہء علم و ادب، اردو بازار، لاہور) ۲۰۰۲ء، ص ۸۰

۵۰۔نجم الغنی رامپوری، مولوی، بحر الفصاحت، حصہ دوم، (مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور) طبع دوم دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۸۵

۵۱۔قمر رعینی، ولائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ، ص ۲۴

۵۲۔القرآن ۷۸:۱۰ ۵۳۔القرآن ۳۷:۴۵

۵۴۔اردو لغت، (اردو لغت بورڈ، کراچی)

۵۵۔مغیلانِ مدینہ، ص ۳۵ ۵۶۔اردو لغت

۵۷۔اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۱۷

۵۸۔القرآن ۱۳:۳۳

۵۹۔تفسیر مظہری، جلد نہم، ص ۲۲۵

۶۰۔صحیح بخاری

۶۱۔القرآن ۳:۱۰

۶۲۔کشکولِ ہلال، ص ۲۳۱

۶۳۔غالب، کلیاتِ غالب (فارسی) مع شرح، (مکتبہ دانیال، لاہور) ۲۰۰۴ء، ص ۲۳

۶۴۔اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۵۶

۶۵۔اعجاز رحمانی، چراغِ مدحت، (قومی ادبی سوسائٹی پاکستان، کراچی، نارتھ کراچی) ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۸

۶۶۔کلیاتِ حفیظ تائب، القمر انٹر پرائزز، لاہور، طبع دوم، ص ۲۷

....

﴿☆﴾ تفصیلات کے لیے دو ماہی سربکف ،کراچی کا مئی تا اگست ۲۰۰۸ء کا شمارہ دیکھا جاسکتا ہے جس کا عنوان ہی زیرِ تبصرہ موضوع ہے یعنی ’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقصودِ کائنات ہیں‘‘۔مدیرِ اعلیٰ :منظر عارفی، صدرِ مجلس: ڈاکٹر نظر کامرانی اور مدیر: شبیر احمد انصاری ، دو ماہی سربکف، سیرت شمارہ نمبر ۲، مئی تا اگست ۲۰۰۸ء، حرا فاؤنڈیشن پاکستان (رجسٹرڈ) کراچی۔

نعت نگار شعراء کا اظہارِ عجز

ایک محفل میں اجمل سراج سے میرے مضمون ’’تخلیقی ادب اور نعتیہ ادب کی موجودہ صورتِ حال‘‘ کے حوالے سے گفتگو چلی تو انہوں نے ڈاکٹر خورشید رضوی کا یہ شعر سنایا:

شان ان کی سوچئے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

وہ محفل تو برہم ہوگئی لیکن اجمل سراج کے سنائے ہوئے شعر نے مجھے فکر و خیال کے نئے سفر پر روانہ کردیا۔

اس شعر میں رضوی صاحب نے کہنا یہ چاہا ہے کہ نعت کہتے ہوئے اپنی محدودات، زبان کی بے بضاعتی، مقامِ رسالت کا عدم عرفان اور آپ ﷺ کے شایانِ شان الفاظ رقم کرنے کی صلاحیت کا فقدان، یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ اس منزل پر خاموشی ہی بہتر ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ نعت کہنا ہی نہیں چاہیے۔ جیسا کہ ہمارے کرم فرما احمد صغیر صدیقی نے اپنے طنزیہ لہجے میں ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ’’شاعر کیا یہ کہنا چاہتا ہے کہ نعتیہ شاعری مت کرو؟‘‘

’’چپ ہو جایئے‘‘ میں جو بات کی گئی ہے اس کا اصل مقصد سوچ میں کھو جانا ہے۔

کارل پوپر نے کہا تھا ’’معنی اور صداقت کے مابین ایک گہری مماثلت ہے‘‘۔ (فلسفہ، سائنس اور تہذیب ص ۷۵)

یہاں ہمیں ’’چپ ہو جایئے‘‘ کے مشورے کا ماخذ صوفیانہ روایت کے اندر تلاش کرنا ہوگا۔ انتظار حسین نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ’’خاموشی کی واردات تصوف میں اپنی منزل آپ ہے۔خاموشی کی واردات ادب میں ایک نئے کلام کا پیش خیمہ ہوتی ہے‘‘..........(علامتوں کا زوال)

چنانچہ رضوی صاحب کے مشورے کو تخلیقی ادب میں نئے کلام کا خیمہ سمجھنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے حوالے سے جو بات بھی کی جاتی ہے اس کو سند کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے یا ایسا کرنا چاہیے۔ جبکہ شاعر صرف اپنے لمحاتی رجحان یا موڈ کو شعری جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ اس وقت اس کے سامنے نہ تو مذہبی روایات ہوتی ہیں اور نہ ہی تاریخ و سیَر کی کتب کے اسباق اسے ازبر ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم کا مطالعہ بھی ہر شاعر کا علماء کی سطح کا نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے بیشتر شعراء نے نعتیہ ادب تخلیق کرتے ہوئے اظہارِ عجز کا نقش بھی شعری صورت میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ وہ اہلِ علم کے سامنے اپنی کسی نادانستہ لغزشِ بیاں کا جواز پیش کرسکیں اور حشر میں بھی اپنی قلم کاری کی بے احتیاطیوں کے معاملے میں کچھ رعایت حاصل کرسکیں۔

ڈاکٹر خورشید رضوی تو ما شاء اللہ دینی اسکالر ہیں۔ انہیں تو عربی زبان و بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ عربی کے توسط سے قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مضامین کی آگاہی اور مدحِ مصطفےٰ ﷺ کے ضمن میں انہیں خاص بصیرت بھی حاصل ہے۔ اس لیے وہ اپنے ’’تنقیدی شعور‘‘ کا بھرپور اظہار کرنے کے لیے یہ فرما رہے ہیں کہ:

ع　نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

یعنی ذرا سوچئے کہ آپ کو کیا لکھنا ہے اور کیسے لکھنا ہے؟

یہ مصرع اگر خود کلامی کے انداز میں پڑھا جائے تو شاعر کی خود احتسابی یا خود ترغیبی (self suggestion) کا غماز ہے اور اگر شاعر کی طرف سے مشورہ تصور کیا جائے تو یہ

ایسے قارئین کے لیے قولِ زریں ہے جو شعر کہنے کی صلاحیت کو کافی سمجھ کر نعتیہ ادب تخلیق کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ گویا خورشید رضوی کے اس مصرعے میں ادب کی سماجی حیثیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے کیوں کہ ادب ''روحِ عصر'' کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔آج نعتیہ ادب کی تخلیق ، تخلیقی ادب کی نمایاں صفت ہے اور اسی لیے اس کی تخلیق میں تربیت کا عنصر داخل کرنے کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔

چنانچہ ان کے مشورے سے جو نعتیہ ادب تخلیق ہوگا وہ حقیقی معانی میں نیا کلام ہوگا۔جدید ذہنوں کو حبِ رسول اکرم ﷺ کی روایت سے جوڑنے والا کلام!

ڈاکٹر خورشید رضوی کے ایک شعر سے گفتگو آگے بڑھی تو مجھے خیال آیا کہ میں ان کی مذکورہ نعت کے اشعار بھی نقل کردوں اور اپنے پچھلے مضمون کی فکری رو کو آگے بڑھاتے ہوئے ایسے کچھ اشعار بھی پیش کردوں جن میں شعراء نے اپنے عجزِ بیاں کا اظہار کیا ہے ۔

مطلعے کے بعد خورشید رضوی کہتے ہیں:

سونپ دیجے دیدہء تر کو زباں کی حسرتیں
اور اس عالم میں جتنا بن پڑے رو جایئے
یا حصارِ لفظ سے باہر زمینِ شعر میں
ہوسکے تو سرد آہوں کے شجر بو جایئے
اے زہے قسمت کسی دن خواب میں پیشِ حضورؐ
فرطِ شادی سے ہمیشہ کے لیے سو جایئے
اے زہے قسمت اگر دشتِ جہاں میں آپؐ کے
نقشِ پا پر چلتے چلتے نقشِ پا ہوجایئے

پچھلے مضمون میں میرا روئے سخن ان شعراء یا تک بند مدح گزاروں کی طرف تھا جو صرف اپنے جذبات کو رہنما بنا کر شعر گوئی کرتے رہتے ہیں اور زبان، بیان اور موضوع کی جان کاری کی بالکل پروا نہیں کرتے......آج میرا ارادہ ہے کہ کچھ شعراء کا تنقیدی شعور ان

کے شعروں کی روشنی میں پیش کروں تاکہ میرے مخاطَب کچھ فنی بصیرت حاصل کرنے کی طرف بھی دھیان دے سکیں۔ چنانچہ اب ایسے اشعار کا انتخاب پیشِ خدمت ہے جن میں شعراء نے عجزِ بیاں کا پیرایہ اپنایا ہے۔

نزاکتِ خیال اور لفظوں میں شبیہ تراشی (imagery) کا عمل دیکھنا ہو تو ذرا صبیح رحمانی کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے جس میں ثنائے رسولِ اکرم ﷺ کے خیال نے شاعر کے آبگینہء فکر کو پگھلا کے رکھ دیا ہے :

صبیح ان کی ثنا اور تو کہ جیسے برف کی کشتی
کرے سورج کی جانب طے سفر آہستہ آہستہ(۱)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے منسوب یہ مشہور شعر تو آپ نے سنا ہی ہوگا:

لا یمکن الثناء کما کانہ حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر(۲)

اس شعر کے پہلے مصرعے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ حضورِ اکرم کی ثناء و توصیف کا حق ادا کرنا ممکن ہی نہیں ہے......دوسرے مصرعے میں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ کریم کی ذات کے بعد کائنات کی سب سے بزرگ ہستی صرف حضورِ اکرم ﷺ کی ہی کی ذاتِ والا صفات ہے۔

آج کے موضوع کے حوالے سے درجِ بالا شعر کا صرف پہلا مصرع ہی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کیوں دوسرے مصرعے کی شعری تمثیلات پیش کرنے کے لیے تو دفتر درکار ہیں۔تو آیئے نعتیہ ادب کے خزانے سے اظہارِ عجز کے چند موتیوں کی تاب وتب دیکھتے ہیں:

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست
محمدؐ چشم بر راہِ ثنا نیست
خدا مدح آفرینِ مصطفیٰؐ بس
محمد حامدِ حمدِ خدا بس

مناجاتے اگر باید بیاں کرد
بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمد از تو می خواہم خدا را
الٰہی از تو حبِّ مصطفےٰ را
دگر لب وا مکن مظہر فضولیست
سخن از حاجت افزوں تر فضولیست (۳)

حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں کے درجِ بالا اشعار کا منظوم ترجمہ پروفیسر سحر انصاری نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ دل چاہتا ہے وہ بھی آپ ملاحظہ فرمالیں:

ہماری حمد کا طالب خدا نئیں
محمد چشم بر راہِ ثنا نئیں
خدا ہے محوِ حمدِ مصطفےٰ بس
محمد حامدِ حمدِ خدا بس
دعا کی ہو اگر خواہش ہی ایسی
قناعت چاہیے اس شعر پر ہی
رہوں خواہاں محمد سے خدا کا
خدا سے وصف حب مصطفےٰ کا
نہیں مظہر مناسب بالارادہ
سخن کرنا ضرورت سے زیادہ(۴)

میرزا مظہر جان جاناں، تصوف کی روایت کے علم بردار تھے اس لیے وہ بھی نعتیہ شعر کہنے کے لیے کچھ پابندیاں لگانے کے حق میں تھے۔ امت کا زوال اسی طرح شروع ہوا تھا کہ دعوے بہت تھے لیکن عمل ناپید تھا اور مظہر جان جاناں باتوں کے آدمی نہیں تھے۔ وہ حقیقی معانی میں رسول اللہ ﷺ سے یہی استدعا کرتے تھے کہ حضور! مجھے اللہ تک پہنچا دیجیے!

...... اور اللہ تعالیٰ سے ان کی دعا یہی ہوا کرتی تھی کہ ’’میرے دل کو حبِ رسول ﷺ سے بھر دے!‘‘۔ یہ بھی خیال رہے کہ ان کے ہاں حبِ رسول ﷺ سے مراد قلب و روح میں بس جانے والی خوشبو کے ساتھ ساتھ اپنے اعمال کی وہ شکل بھی تھی جو ’’حبِ رسول ﷺ‘‘ کا خود اظہار ہوا کرتی ہے۔ ان کی فکر عملی جامہ پہن کر ان کی ذات اور ان کے حلقے کے لوگوں کے لیے تحریک (movement) بن چکی تھی۔ وہ صرف نظری طور پر حبِ رسول ﷺ کے خواہاں اور پرچارک یا مُبَلِّغ نہیں تھے۔ ان کی مثال اقبال کے اس شعر سے دی جاسکتی ہے:

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نَم (۵)

بہرحال نعتیہ شاعری میں عجزِ بیاں کے مظاہر دیکھیے!

لکھوں نعت اس کی میں کس طرح ساری
براق ایک ادنیٰ تھا جس کی سواری

(سعادت یار خاں رنگین دہلوی)(۶)

خدا تیرا معرف ہے ملک تیرے موصف ہیں
نہیں حد بشر کہنا ترے اوصاف بے حد کا

(شیخ امام بخش، ناسخ لکھنوی)(۷)

غالبؔ ثنائے خواجہ بیزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است (۸)

ترجمہ:

غالب، خدا پہ چھوڑ دی مدحت رسول کی
آگاہ بس وہی تو ہے شانِ حضور سے

(اسلم انصاری)(۹)

حریف نعت پیمبر نہیں سخن حالی

کہاں سے لایئے اعجاز اس بیاں کے لیے

(الطاف حسین حالی)(۱۰)

حق گزار مدح او کس نیست جز یزدان پاک
رائے من ایں شد و شد روح الامیں ہم رائے من
کارِ نعت مصطفیٰؐ را بر خدا بگزاشتم
نعت شہؐ او خوب کردن میتواند جائے من(۱۱)

(میرا خیال تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی مدحت کا حق سوائے اللہ کے کوئی ادا نہیں کرسکتا۔ تو جبریلِ امین نے بھی میری رائے کی تائید فرمائی۔ مصطفیٰ ﷺ کی نعت کا کام اللہ پر چھوڑا، کیوں کہ وہی حضورِ اکرم ﷺ کی نعت خوب بیان فرماتا ہے ......میں نہیں......

مولٰنا احمد حسن محدث بچھرایونی نیازی)

ارادہ جب کروں اے ہم نشیں مدح پیمبر کا
قلم لے آؤں پہلے عرش سے جبریل کے پر کا

(آغا شاعر قزلباش دہلوی)(۱۲)

مدحت شاہ دو سرا مجھ سے بیاں ہو کس طرح
تنگ مرے تصورات پست مرے تخیلات

(نواب بہادر یار جنگ،خلق)(۱۳)

ہفت افلاک سے یا کاہکشاں سے لاؤں
نعت کہنے کے لیے لفظ کہاں سے لاؤں
دل میں ہے مدحتِ حضرتؐ کی تمنا لیکن
روئے قرطاس پہ کیا عجزِ بیاں سے لاؤں

(رفعت سلطان)(۱۴)

ثنا تیری بیاں کیا ہو، صفت تیری رقم کیا ہو
نہ اس قابل زباں نکلی، نہ اس لائق قلم نکلا

(آزاد بیکانیری)(۱۵)

مرے بیان و زباں کی بساط ہی کیا ہے
ترے جمال کی تعریف خود خدا نے کی

(ازہر درانی)(۱۶)

عجز ادراک سے ہے تیری ثنا کا آغاز
کس کو دعویٰ ہے کہ سمجھا ہے وہ رتبہ تیرا
کس عبارت سے کریں تیرے شمائل کا بیاں
کون لکھ سکتا ہے لفظوں میں سراپا تیرا

(اسلم انصاری)(۱۷)

مجھ کو اس بزم میں کیا جرأت گویائی ہو
جس میں حسانؓ کی گفتار بھی شرمائی ہو

(محمد افضل کوٹلوی)(۱۸)

شرط لازم ہے جو اوصاف نبیؐ کی خاطر
وہ جزالت نہ فصاحت نہ بلاغت اپنی
ہاتھ آیا کوئی پیرایۂ اظہار کہاں
ہوسکی قید نہ الفاظ میں چاہت اپنی

(سید انور ظہوری)(۱۹)

نعت کہنے کو جب بھی اٹھایا قلم
میرے جذبات کو جانے کیا ہوگیا
خامشی لب پہ مدحت سرا ہوگئی
اشک آنکھوں میں حرفِ دعا ہوگیا

(انور جمال)(۲۰)

یہاں پھر ذرا ''خاموشی'' کا ادراک کیجیے اور اس بنیادی نکتے کو ذہن میں لایئے کہ

''خاموشی کی واردات، ادب میں ایک نئے کلام کا پیش خیمہ ہوتی ہے''۔

ثنا خواں کس طرح ہو کوئی اس محبوبؐ یکتا کا
زباں میں یہ کہاں قدرت، قلم کو یہ کہاں یارا

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم) (۲۱)

ورائے فکر و نظر اس کی رفعتوں کے مقام
جو ایک گام میں طے کرگیا نظر کی حدود
ثنائے خواجہؐ کروں یہ کہاں بساط مری
کہ میرا فکر بھی عاجز، خیال بھی محدود

(حافظ لدھیانوی)(۲۲)

کیوں کر حیات اس کی تعریف کوئی لکھے
خلاق ہر دو عالم خود جس کا مدح خواں ہے

(حیات وارثی لکھنوی)(۲۳)

میری کہاں بساط، کہوں نعت مصطفےٰؐ
جو شعر بھی ہوا ہے، ہوا آپ کے طفیل

(خالد شفیق) (۲۴)

کس رخ سے تیری مدح ترے مدح جو کریں
کس تار سے حروف کے دامن رفو کریں

(خالد احمد) (۲۵)

ان کا کرم نہ کرتا اگر رہبری خلیل
مقدور کب تھا مجھ کو ثنائے حضورؐ کا

(مفتی خلیل خاں برکاتی) (۲۶)

ثنا کس منہ سے ہو خورشید ان کی
خدائے پاک جن کا مدح خواں ہے

(خورشید ایلچ پوری) (۲۷)

کہاں سے لاؤں زبان و قلم کے پیمانے
ہے بیکراں تری عظمت، مری نظر محدود

(احسان دانش) (۲۸)

تری نعت اور روحی تہی فکر
تری محفل میں کیا بندہ چلے گا

(روحی کنجاہی) (۲۹)

نعت اس کی کہاں، کہاں یہ زباں
ہاں نکلتی ہے صرف دل کی بھڑاس

(صبا اکبر آبادی) (۳۰)

تیری توصیف کہاں اور کہاں میرا قلم
فکر ناقص مرا، تو مظہر اسرار قدم

(طاہر شادانی) (۳۱)

یوں تو کہنے کو کہیں سینکڑوں نعتیں طاہرؔ
کونسی نعت کہی آپ نے شایان رسول

(طاہر سردھنوی) (۳۲)

ذکر پاک ان کا اور تو فضلی
بے ادب سیکھ عشق کے آداب

(فضل احمد کریم فضلی)(۳۳)

دامن نعت کے قابل کوئی گوہر لائے
کون ایسا ہے جو مٹھی میں سمندر لائے

(قیصر بارہوی)(۳۴)

تصویر تحیر ہے عالم یارائے بیاں زیبا ہی نہیں

امکان ثنائے ختم رسلؐ لفظوں میں سما سکتا ہی نہیں
(ہوش ترمذی)(۳۵)

دل نعت رسول عربی کہنے کو بے چین
عالم ہے تحیر کا زباں ہے نہ قلم ہے
(مولانا مفتی محمد شفیع)(۳۶)

بندہء عاجز، فقیرِ کج بیاں
کیا کرے گا مدح ممدوح خدا
(ڈاکٹر سید انعام احسن، فقیر) (۳۷)

صفات بو قلموں لا تعد و لا تحصیٰ
ثنائے خواجہ میں معذور ہیں زبان و قلم
(عبدالعزیز خالد)(۳۸)

منزل نعت نبی افسر نہ ہم سے طے ہوئی
پاؤں رکھتے ہی یہاں ہوش اڑ گئے ادراک کے
(منظور احمد صدیقی، افسر امروہوی)(۳۹)

مدح سرکارؐ ہے کس کے امکان میں
آپ کی مدحتیں تو ہیں قرآن میں
(محشر بدایونی)(۴۰)

نعت سرکار دو عالم کی میں لکھوں کیونکر
میں گنہگار، وہ معصوم، میں عامی وہ رسول
(راغب مرادآبادی)(۴۱)

ان کی مدحت کا جریدہ نہ مکمل ہوگا
جتنے ممکن ہیں شماروں پہ شمارے لکھنا
(رازؔ کاشمیری)(۴۲)

جب ان کی ثنا کا وقت آیا
لفظوں کا وجود ڈگمگایا
(شمس قادری)(۴۳)

تیری توصیف کو تحریر میں لاؤں کیسے
حسن خورشید کو آئینہ دکھاؤں کیسے
(صفدر صدیق رضیؔ) (۴۴)

مجال انسان کی کیا ہے کہ ہو مداح حضرت کا
کلام اللہ جب ناطق ہوا خوئے محمدؐ کا
(شیخ امیر الدین آزاد) (۴۵)

لکھوں کس طرح نعتِ مصطفیٰؐ کیا میرا رتبہ ہے
خدا قرآن میں تعریف ان کی آپ کرتا ہے
(محمد اشفاق علی اشفاق)(۴۶)

جز خدا وند دو عالم کس سے مدحت ہوسکے
وصف میں ان کے سبھی جن و بشر ناچار ہیں
(خواجہ احمد شمسؔ)(۴۷)

رفعت کو دیکھتے ہوئے اٹھتی نہیں نگاہ
کیا وصفِ حدِ عظمتِ آقاؐ کریں گے ہم
(محمد سعادت حسین، شیداؔ)(۴۸)

یہ نام وہ ہے کہ جس کی ثنا نہیں ممکن
کہ آپ کہتا ہے سبحان، یارسول اللہ
(مرزا عباس بیگ، عباس)(۴۹)

نور ہے خالق کا اور ممدوح خالق کا ہے وہ
خلق کا منہ مدح کہنے کے بھی کب قابل ہوا

(محمد حسن علمی)(۵۰)

صفت لکھنے کو نور مصطفیٰ کی
زباں لاؤں کہاں سے میں خدا کی

(سید محسن علی، محسن) (۵۱)

جو ان کا حق تعالیٰ مدح خواں ہے
لکھوں میں نعت، کیا تاب و تواں ہے؟

(سید سلطان احمد، نامی) (۵۲)

نعتیہ ادب کی تخلیق کے اس میدان میں شاعرات بھی پیش پیش رہی ہیں اس لیے ان کے بھی کچھ اشعار ملاحظہ فرمالیجیے:

میں کس طرح سے نام شہ دو سرا کا لوں
بہر کلام لفظ نہ طاقت سخن میں ہے

(بیگم سلطانہ ذاکر، ادا)(۵۳)

بشر کیا خدا بھی ہے جس کا ثنا خواں
کروں اس کی توصیف میں کس زباں سے

(قمر سلطانہ سید)(۵۴)

ہو بشر سے کس طرح وصف محمد کا بیاں
کس طرح سے بند کوزے میں ہو بحر بے کراں

(نور بدایونی)(۵۵)

ادا حق مدحت خیرالبشر ہو کس طرح نوری
تو حافظ ہے نہ رومی ہے نہ سعدی ہے نہ جامی ہے

(مسرت جہاں نوری) (۵۶)

اوصاف بیاں آپ کے کس طرح ہوں مجھ سے
کیا منہ جو کروں مدحت سردار دو عالم

(شاہد سلطانہ، ناز) (۵۷)

نعتیہ شاعری میں عجزِ بیاں کے بے شمار اشعار ملے۔تقریباً ہر شاعر نے نعت کہنے میں اپنی بے بضاعتی کا اظہار کیا ہے۔لیکن عاصی کرنالی نے ایک جدا انداز اور منفرد آہنگ میں اپنی بے بضاعتی کو فکری اور تخلیقی سطح پر اجاگر کیا ہے۔ اردو نعتیہ شعری سرمائے میں اس سے بہتر عجزِ بیاں کی مثال ملنا مشکل ہے۔وہ کہتے ہیں:

ثنائے خواجہ میں اے ذہن! کوئی مضموں سوچ
جناب! وادیٔ حیرت میں گم ہوں ، کیا سوچوں!
زبان! مرحلۂ مدح پیش ہے، کچھ بول
مجالِ حرف زدن ہی نہیں ہے کیا بولوں؟
قلم! بیاضِ عقیدت میں کوئی مصرع لکھ
بجا کہا، سر تسلیم خم ہے کیا لکھوں؟
شعور! ان کے مقامِ پیمبری کو سمجھ
میں قید حد میں ہوں وہ بے کراں میں کیا سمجھوں؟
خرد! بقدرِ رسائی تو ان کے علم کو جان
میں نا رسائی کا نقطہ ہوں ان کو کیا جانوں؟
خیال! گنبدِ خضریٰ کی سمت اُڑ پر کھول
یہ میں ہوں اور یہ مرے بال و پر ہیں، کیا کھولوں؟
طلب مدینے چلیں نیکیوں کے دفتر باندھ
یہاں یہ رختِ سفر ہی نہیں ہے کیا باندھوں؟
نگاہ دیکھ! کہ ہے روبرو دیارِ جمال
ہے ذرہ ذرہ یہاں آفتاب، کیا دیکھوں؟
دل! ان سے حرفِ دعا، شیوۂ تمنا مانگ

بِلا سوال وہ دامن بھریں تو کیا مانگوں؟
حضورؐ! عجزِ بیاں کو بیاں سمجھ لیجے
تہی ہے دامنِ فن، آستاں پہ کیا لاؤں؟

(ڈاکٹر عاصی کرنالی)(۵۸)

عجزِ بیاں کی شعری بنت میں ہر شاعر کے ہاں ایک ہی خیال الفاظ کا جامہ پہن کر نمودار ہوتا ہے یعنی ''میں اس قابل نہیں ہوں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی نعت کہہ سکوں''۔

درجِ بالا اشعار میں چونکہ ایک ہی خیال کی تکرار ہے اس لیے یاس یگانہ چنگیزی جیسے مزاج کے ناقدینِ فن فوراً تاریخِ ادب کی ورق گردانی پر توجہ دیں گے اور پھر متقدمین کی شعری نظیریں ملاحظہ فرما کر متاخرین پر سرقے کا الزام لگا دیں گے۔ لیکن آج کے شعری ذوق اور تنقیدی رجحان سے آگاہ اہلِ نظر اس شعری سرمائے کو متنی ہم رشتگی یا بین متنیت (intertextuality) کے تناظر میں دیکھیں گے۔

اظہارِ عجز کے اتنے مظاہر دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارا اجتماعی لاشعور تقریباً ہر شاعر کو نعتیہ ادب تخلیق کرنے کے مرحلے پر متنبہ کرتا ہے کہ ''نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے''......اور جو لوگ اس روایت سے انحراف کرتے ہیں وہ ادبی روایت سے عدم آگاہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ خود ان کے لیے باعث خسران اور نعتیہ ادب کی تخلیق کے لیے انتہائی غیر مناسب ہے۔

....

مآخذ و منابع:

۱۔صبیح رحمانی، جادہء رحمت، ممتاز پبلشرز، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۴۵
۲۔فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، اردو کی نعتیہ شاعری، آئینہء ادب چوک، انارکلی، لاہور، ۱۹۷۴ء۔
۳۔میرزا مظہر جانِ جاناں، نعت رنگ ۳، ص ۲۸۹
۴۔سحر انصاری......نعت رنگ ۳، ص ۲۸۹
۵۔کلیاتِ اقبال، اردو، ص 324/32

۶۔شفیق بریلوی، ارمغانِ نعت، مرکز علومِ اسلامیہ، گارڈن، کراچی، ۱۹۷۶ء، ایضاً ص ۱۱۷
۷۔ ارمغانِ نعت، ص ۱۱۸
۸۔ صبیح رحمانی، نعت رنگ شمارہ ۱۲، کراچی، ص ۳۵۵
۹۔نعت رنگ شمارہ ۱۲، ص ۳۵۴
۱۰۔راجا رشید محمود، نعت کائنات، جنگ ببلیشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۷
۱۱۔ارمغانِ نعت، ص ۱۵۳
۱۲۔ارمغانِ نعت، ص ۱۷۹
۱۳۔ارمغانِ نعت، ص ۱۸۲
۱۴۔ نعت کائنات، ص ۲۰۰
۱۵۔نعت کائنات، ص ۱۰۰
۱۶۔ایضاً ص ۱۲۲
۱۷۔ ایضاً ص ۱۲۴
۱۸۔ایضاً ص ۱۲۷
۱۹۔ ایضاً ص ۱۳۷
۲۰۔نعت کائنات، ص ۱۳۷
۲۱۔ایضاً، ص ۱۵۰
۲۲۔ایضاً، ص ۱۶۶
۲۳۔ایضاً، ص ۱۷۶
۲۴۔ایضاً، ص ۱۸۱
۲۵۔ایضاً، ص ۱۸۱
۲۶۔ایضاً، ص ۱۸۸
۲۷۔ایضاً، ص ۱۸۸
۲۸۔نعت کائنات، ص ۱۸۸
۲۹۔نعت کائنات، ص ۲۰۰
۳۰۔ایضاً، ص ۲۳۰
۳۱۔ایضاً، ص ۲۳۵
۳۲۔ایضاً، ص ۲۳۵
۳۳۔ایضاً، ص ۲۶۰
۳۴۔نعت کائنات، ص ۲۷۰
۳۵۔ایضاً، ص ۳۱۷
۳۶۔ارمغانِ نعت، ص ۲۸۹
۳۷۔ارمغانِ نعت، ص ۲۹۳
۳۸۔ایضاً ص ۳۱۷
۳۹۔عزیز (صابری) احسن، جواہرالنعت، بزمِ یوسفی، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۶
۴۰۔آفتاب نقوی، اوج نعت نمبر۲، گورنمنٹ کالج، شاہدرہ، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۳
۴۱۔جواہرالنعت، ص ۵۴
۴۲۔ایضاً، ص ۱۵۴
۴۳۔ایضاً، ص ۱۵۹
۴۴۔ایضاً، ص ۲۰۹
۴۵۔تذکرۂ نعت گویانِ بریلی، ص ۲۱
۴۶۔ایضاً، ص ۲۸
۴۷۔ایضاً، ص ۸۰
۴۸۔ایضاً، ص ۸۵
۴۹۔ایضاً، ص ۹۸
۵۰۔ایضاً، ص ۱۰۰
۵۱۔ایضاً، ص ۱۱۶
۵۲۔ایضاً، ص ۱۲۴
۵۳۔غوث میاں، خواتین کی نعتیہ شاعری، حضرت حسان حمد و نعت بک بینک پاکستان، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷
۵۴۔ایضاً، ص ۳۴۷
۵۵۔ایضاً، ص ۴۲۴
۵۶۔ایضاً، ص ۴۴۶
۵۷۔ایضاً، ص ۴۷۹
۵۸۔عاصی کرنالی، تمام ناتمام، سید قمر زیدی، ملتان، ۱۹۹۴ء، ص ۳۹۳

....

[مطبوعہ: جسارت، سنڈے میگزین، کراچی، بابت: 28 جولائی تا 4 اگست، 2013ء، ص 10۔11]

''اردو نعت کا ہیئتی مطالعہ''
......ایک لائقِ تحسین تحقیقی کاوش

ڈاکٹر افضال احمد انور کا تحقیقی مقالہ ''اردو نعت کا ہیئتی مطالعہ'' اردو نعتیہ ادب کی تحقیقی سرگرمیوں میں ایک سنجیدہ اور انتھک محنت کی واضح مثال ہے۔ نعت ایک موضوعاتی صنف سخن ہے جو ہیئتی اعتبار سے پہچانی جانے والی ہر صنفِ سخن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اصنافِ سخن کی شکل و شباہت کے اعتبار سے جتنی شعری صورتیں رائج ہیں اور وقتاً فوقتاً بعض شعراء کی اختراعات کی شکل میں سامنے آتی رہی ہیں۔ نعتیہ شاعری کا متن ان تمام اصنافِ سخن کے ظرف میں سما جاتا ہے۔ حمد و نعت کے علاوہ کسی اور موضوعاتی صنف کو یہ درجہ حاصل نہیں ہے کہ شعری پیمانوں کی تمام ہیئتی اشکال نے کسی موضوع کا رنگ اپنا لیا ہو۔ ظاہر ہے اللہ کی ذات بے کراں ہے اور اس کے محبوب کی ذات کا دائرۂ رسالت بھی بے کراں ہے اس لیے اللہ رب العزت نے ''رفعنالک ذکرک'' کہہ کر جس حقیقت کو آشکار فرمایا ہے اس کے مظاہر شعریات میں اس طرح سامنے آئے کہ کوئی دوسری صنف اس موضوع کی وسعتوں کے متوازی نہ آسکی۔ اللہ کی ذات بے مثال ہے ۔ لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ (نہیں ہے اس سے مشابہ [کائنات کی] کوئی شے) (الشوریٰ، آیت ۱۱) ۔ اس لیے اس کی حمد کے لیے کسی خاص لہجے، کسی خاص انداز اور کسی خاص ہیئتی صنف کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات کو عالمین کی رحمت بنایا ہے اور ان کے ذکر کو ان کی خاطر بلند کرنے کا اعلان فرمایا ہے تو یہ اہتمام بھی فرمایا ہے کہ ان کے ذکر میں کسی لہجے، کسی انداز اور کسی ہیئتی صنفِ سخن کا دائرہ محدود نہ رہے بلکہ ان ﷺ کی تعریف و توصیف کے اسلوب و انداز میں بھی سمندر کی طرح بے کرانی کا عنصر قائم رہے۔

نعتیہ ادب کی تحقیق و تنقیح کا کام تو بہت بعد میں شروع ہوا لیکن نعتیہ ادب کی تخلیق اردو زبان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی۔ نویں صدی ہجری کی ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' میں حمد کے بعد نعت ہی ہے۔ بعد کی مثنویوں میں بھی نعت مثنوی کی ہیئت ہی میں لکھی ہوئی ملتی ہے۔ قصیدے نے رواج پایا تو نعتیہ قصائد کا دفتر بھی کھل گیا۔ غزل نے قصیدے کی ہیئت اپناتے ہوئے اپنا الگ وجود منوایا تو نعتیہ ادب اس میں بھی تخلیق کیا جانے لگا۔ غزل کی حد تک تو یہ بات مسلم ہوگئی کہ نعتیہ شاعری کے لیے سب سے زیادہ موزوں یہ صنفِ سخن ہے۔ پھر رباعی، دوبیتی اور قطعے وغیرہ میں بھی نعت کہی گئی۔ شعراء نے اپنے وجدانی علم، فطری میلان اور صنفِ سخن کے ہیئتی ڈھانچے کی طرف میلانِ طبع کی روشنی میں جس شکل کو منتخب کیا اسی کالبد میں نعتیہ اشعار کہہ دیئے۔ اس طرح صدیوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔

لیکن نعتیہ ادب کے تخلیق کاروں نے بر بنائے خلوص کبھی اپنی کاوشِ نعت گوئی کو ادبی تخلیق کے دعوے کے طور پر پیش نہیں کیا اور یہی وجہ تھی کہ شعراء کے خلوص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ادب کے ملحد تخلیق کاروں نے نعت کو ''صنفِ سخن'' کے طور پر قبول کرنے سے انکار کردیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حمد و نعت کہنے والے لوگوں کو شعراء کی فہرست میں جگہ دینے سے بھی گریز کیا جانے لگا۔ اسی ملکِ پاکستان میں جس کی تخلیق اللہ کا نام بلند کرنے اور رسول اللہ کے نظام کے نفاذ کے لیے ہوئی تھی، نعت گو شعراء کو اچھوت بنا دیا گیا۔ لیکن آخر یہ عمل کب تک جاری رہتا۔ تارِ عنکبوت بہت بودا ہوتا ہے۔ بے دین شعراء کا یہ پراپیگنڈہ آخر دم توڑ گیا اور نعتیہ ادب کی تخلیق کا غیبی اشارہ ایسا ملا کہ ملحدوں نے بھی توبہ کی اور اسی

صنف کے طفیل اپنی تخلیقی دانش کا اظہار کرنے لگے۔

بات ذرا لمبی ہوگئی، لیکن اختصاراً اس تلخ حقیقت کا ذکر ضروری تھا کہ بعض لوگوں نے شعوری طور پر اور بعض لوگوں نے بر بنائے خلوص نعت کو' ایک عرصے تک ''صنفِ سخن'' کے دائرے سے باہر رکھا۔ اب جب کہ اللہ رب العزت کے اعلانِ ''رفعنالک ذکرک'' کے مظاہر عام ہوئے تو اہلِ علم کو اس تقدس مآب صنفِ سخن کی آبیاری کا خیال آیا اور تخلیق کے ساتھ ساتھ اس موضوع کی تحقیق اور پھر تنقید کی طرف پیش رفت ہونے لگی۔

ڈاکٹر افضال احمد انور کو اللہ رب العزت نے اس کام کے لیے چنا کہ وہ، اللہ کے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے وقف صنفِ سخن کے دائرے کی وسعتوں کا ذکر اس طور کریں کہ سائنٹیفک انداز میں یہ بات ثابت ہوجائے کہ جس طرح حضورِ اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت لا متناہی ہے اسی طرح آپ ﷺ کی توصیف و ثنا کے انداز و اسالیب بھی لا متناہی ہیں۔نعت کسی ایک صنفی کالبد کی پابند صنفِ سخن نہیں ہے۔ اس کا نفسِ مضمون، مافیہ (CONTENT) یا متن (Text) ہر شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر افضال احمد انور کی تحقیقی کاوش نے یہ بات بھی ثابت کردی کہ نعت کہنے والے شعراء نے اس صنفِ سخن کی آبیاری کرتے ہوئے حسنِ اظہار اور موضوع کی عظمت دونوں پہلوؤں کا خیال رکھا ہے یعنی انہوں نے نعت کہتے ہوئے شعری ضرورتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے موضوع کے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔مذکورہ مقالہ اس اعتبار سے بھی اختصاصی شان رکھتا ہے کہ اس میں ''نعت پر تنقید'' کے زیرِ عنوان اس میدان میں ہونے والی ادبی کاوشوں کا مختصر احوال بھی لکھا ہے اور نعتیہ ادب میں تنقیدی سرگرمیوں کی تحسین بھی کی ہے۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ مقالہ نگار، نعتیہ شاعری کو کلیتاً ادبی شان کے ساتھ جلوہ گر دیکھنے کے متمنی ہیں۔

یہ مقالہ اس اعتبار سے بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں ہیئتی اصنافِ سخن کا مطالعہ ان اصناف کے مزاج اور مادی شکلوں کی تعین کے ساتھ کیا گیا ہے۔نعت شریف کا

یہ فیضان ہے کہ اس ایک ہی مقالے میں ان تمام اصناف کے ہیئتی کالبد کا ذکر آگیا ہے جن کو علاحدہ علاحدہ مطالعات کا حصہ بنایا جاتا رہا ہے۔ مثلاً غزل کا مطالعہ علاحدہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ مقالوں میں کیا گیا ہے اور قصیدے کا مطالعہ بھی اسی طرح وحدانی دائرے میں رہتے ہوئے سامنے لایا گیا ہے۔ علیٰ ہٰذ القیاس ہر صنفِ سخن کو الگ الگ مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے لیکن ڈاکٹر افضال احمد انور نے ایک ہی مقالے میں ہر صنفی ھیئت کے مطالعے کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اس طرح شاعری کے عام قاری کو تمام اصنافِ سخن کے مزاج اور ان کی ھیئتی شکلوں سے بھی آگاہی ہوجاتی ہے اور نعتیہ موضوع کو ان اصناف کے پیکر میں برتنے کے انداز و اسالیب بھی معلوم ہوجاتے ہیں۔ اس طرح یہ مقالہ محققین، ناقدین اور شعراء کے لیے یکساں مفید ہے۔

نعتیہ شاعری کی انفرادی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں بیشتر تخلیقی جذبہ سچا ہوتا ہے اور اس شاعری میں بیان کردہ زیادہ تر حقائق مستند ہوتے ہیں۔ مستند حقائق کو شعری پیکر میں ظاہر کرنے کے لیے موضوع کی نزاکت کے ساتھ ساتھ شعری مقتضیات کا خیال رکھنے والے شعراء کی بیشتر تخلیقات مقالے میں حوالے کے طور پر نمونۃً پیش کردی گئی ہیں جو مستقبل میں اس وادی میں داخل ہونے والے شعراء کے لیے مشعلِ راہ بنیں گی۔

یوں تو نعتیہ ادب میں بہت سا تحقیقی کام ہوا ہے لیکن تنقیدی جہت ذرا کمزور رہی ہے۔ ڈاکٹر افضال احمد انور کے مقالے میں تنقید کا حوالہ بھی آگیا ہے اور اصنافِ سخن کی ہیئت اور ان کے مزاج کے حوالے سے مطالعے کا جو طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے وہ ہر اعتبار سے تنقیدی نوعیت کا ہے۔ اس سے قبل ایک تحقیقی مقالہ ''اردو نعت کے جدید رجحانات'' کے عنوان سے سندھ یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا جس پر ڈاکٹر شوکت زرین چغتائی کو ۱۹۹۰ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند عطا کی گئی تھی۔ اس مقالے میں بھی تمام تر گفتگو ''کلام'' پر تھی ''کلیم'' پر نہیں۔ تنقیدی تحریروں کا خاصہ ہی یہ ہے کہ کلام پر گفتگو کی جائے، کلیم کے کوائف کی جمع آوری کا کام تذکرہ نگاری کے ذیل میں آتا ہے۔ ڈاکٹر افضال احمد انور کا کام بھی تنقیدی

اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس میں بھی موضوعِ گفتگو کلام کو بنایا گیا ہے کلیم کو نہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تنقید کے ضمن میں ڈاکٹر افضال احمد انور کے مقالے سے کچھ حوالے دے کر ان کا تنقیدی منہاج واضح کرنے کی کوشش کی جائے۔ مقالہ نگار نے ع۔س۔مسلم کے مثمن کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صفت و ثنا لکھتے ہوئے شاعر کا قلم اس سرشاری والہانہ پن اور تیز روی سے چلتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔اصول ہے مذکور غیر فانی ہو تو ذاکر بھی غیر فانی ہوجایا کرتا ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے ذکر پاک نے شاعر کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ شاعر کا سینہ ایسا چشمہ ہے جہاں سے مضامین مدحت جاری رہتے ہیں۔

وہ مصدوق ہے اور صادق وہی
بظاہر مؤخر پہ سابق وہی
رضائے خدا کے مطابق وہی
ہے طوفاں میں بادِ موافق وہی
حقیقت میں قرآنِ ناطق وہی
وہی حق ہے، شرحِ حقائق وہی
وہی مبتدیٰ، منتہیٰ، مدعا
وہی مرتضیٰ، مجتبیٰ، مصطفیٰ

شاعر کو قادرالکلامی کا ملکہ حاصل ہے۔الفاظ کا چناؤ، تراکیب سازی، تشبیہات و استعارات کا فنکارانہ استعمال غرض بہترین شعری خوبیوں سے مالا مال یہ مثمن نعتیہ ادب کی جھولی میں ایک قیمتی ہیرے سے کم نہیں۔۔۔یہ حقیقت ہے کہ ع۔س۔مسلم کا تمام کلام گویا انتخاب

ہے۔آخر میں درودوسلام سے متعلق بھی ایک بند درج کیا جاتا ہے۔
یہاں شاعر نے مثمن، ترکیب بند کو ترجیع بند سے ہمکنار کردیا ہے۔کیونکہ متعدد بندوں کا آخری مصرع ''محمد پہ لاکھوں درودوسلام'' ہے:

محمد سزاوار مدح و صلوٰۃ
وہی زینتِ محفلِ ممکنات
محمد سے قائم دم کائنات
خدا کا ہے جو ہے محمد کا ہات
محبت محمد کی راہِ نجات
اسی سے ہے ہم غم کے ماروں کی بات
وہی جامع قلب جملہ انام
محمد پہ لاکھوں درود و سلام''

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، ڈاکٹر اِفضال احمد انور نے اپنے مقالے میں ''نعت کے انداز و اسالیب'' پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے جس سے نعت پارے کی تخلیقی جمالیات کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سیف نے کہا تھا کہ انداز بیاں بات بدل دیتا ہے، ورنہ ہر بات نئی بات نہیں ہوتی۔اردو نثر میں میر امن، رجب علی بیگ سرور مولانا محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد۔۔۔سب کا بات کرنے کا ڈھنگ جدا جدا ہے۔یہ ان کے اسالیب کی انفرادیت ہے۔نثر کی طرح شاعری میں بھی ہر ایک کا انداز جدا ہے۔میر تقی میر، مرزا غالب، نظیر اکبرآبادی کا اسلوب سخن ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔نعت کے اسالیب بھی مختلف شاعروں کے ہاں مختلف دکھائی دیتے ہیں......نعتیہ اسلوب

کے تعین میں بہت سے عوامل کارفرما ہوسکتے ہیں جیسے نعت گو کی علمیت ، اس کا انتخاب لفظیات، ترکیب سازی کی مہارت، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے ساتھ محبت کی سطح اور اس کے پیش کردہ نعتیہ مضامین کے پیچھے کارفرما اس کا مسلک وعقیدہ نیز وسعت مطالعہ اور فن عروض کے علاوہ شعر کی مختلف ہیئتوں سے آگاہی وغیرہ وغیرہ۔ضروری نہیں کہ ہر نعت گو ایک ایسے اسلوب کا بھی حامل ہو جو دوسروں کے لیے باعثِ رشک بن کر اسلوب کی کسی عظیم روایت کا نقیب ٹھہرے، البتہ ضرور[ی] ہے کہ نعت گو جس انداز میں نعت کہے اس کا تجزیہ کرکے ناقد نعت، اس کے اسلوب کی خصوصیات سامنے لاسکتا ہے۔ یہ اسلوب سادہ بھی ہوسکتا ہے اور پیچدار بھی، سہل بھی ہوسکتا ہے اور ادق بھی، عاشقانہ بھی ہوسکتا ہے اور فلسفیانہ بھی۔کسی کے اسلوب کی نقل بھی ہوسکتا ہے اور ذاتی بھی''۔

اسلوب کے ضمن میں کی جانے والی بحث کے درجِ بالا اقتباس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مقالہ نگار کا تنقیدی وژن نہ صرف خارجی ہیئتوں کا ادراک سمیٹے ہوئے ہے بلکہ فن پارے کی داخلی اختصاصی نوعیت کی پرکھ کی بصیرت کا بھی حامل ہے۔نعت کا موضوع اپنی تمام تر بوقلمونی کے ساتھ کائنات کی ایک ہی بڑی ہستی یعنی حضور رحمتِ عالمین ﷺ کے تذکار کا ہالہ بناتا ہے، اس لیے اس صنف میں فکرو خیال کی تکرار وتوارد کے امکانات زیادہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نعتیہ شاعری کی پرکھ کے مرحلے پر ناقد ،شاعر کے اسلوب کی انفرادیت یا عدم انفرادیت کا ذکر کرتا ہے۔اسی لیے ڈاکٹر افضال احمد انور نے اپنے مقالے میں انداز و اسلوب کی بات کی ہے۔

ڈاکٹر افضال احمد انور نے تنقیدِ نعت کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(الف) نعتیہ شناخت

نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے
عزیز احسن

(ب) آدابِ شریعت کا لحاظ

(ج) جذبہءِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(د) لسانی وشعری تقاضوں کی ہم آہنگی

ڈاکٹر موصوف، مواد، مفہوم اور ہیئت کے اچھے برے پہلوؤں کی جانچ کے تناظر میں نعت کے مقام ومرتبہ کے تعین کے عمل کو تنقیدِ نعت کا نام دیتے ہیں۔ ادبی تنقید کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''ادبی تنقید کا عمل جہاں فن پارے کے مواد کو جانچتا ہے، وہاں ہیئت کے حوالوں سے بھی اس کے معیار کا تعین کرتا ہے، ادب پاروں کو جانچنے کے لیے تنقید کی مختلف اقسام رو بہ عمل ہیں جیسے تاثراتی تنقید، مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، جمالیاتی تنقید، تقابلی تنقید اور ساختیاتی تنقید وغیرہ۔تنقید کے یہ تمام طریقے جزوی طور پر تنقیدِ نعت میں کام آسکتے ہیں لیکن نعت کا موضوع ایک ایسی الگ شناخت رکھتا ہے کہ اس کا تنقیدی نظام بھی الگ ہی ہونا چاہیئے۔جیسے ہر عظیم ادب پارے کی جانچ کا معیار اس کے بطن سے نمودار ہوتا ہے اسی طرح اردو نعت کی تنقید بھی اپنے داخلی تقاضوں کے تحت ہی اپنا کام سرانجام دیتی ہے''۔

تنقید کے منصب کو جس خوبصورتی سے ڈاکٹر افضال احمد انور نے اجاگر کیا ہے اور جس طرح نعت کی تنقید کے لیے ایک جداگانہ منہاج کی ضرورت پر زور دیا ہے وہ ان کی ادب آگاہی اور نعت شناسی پر دال ہے۔

دراصل نعتیہ ادب میں تنقیدی سرگرمیاں اسی وقت پنپ سکتی ہیں جب نعت کے تخلیق کاروں میں اپنے موضوع سے خلوص کے ساتھ تداخل(Personal Invovement) کا عنصر مشہود ہوگا۔ فی زمانہ تو نعت نگاروں میں اپنی کتابوں کی تعداد بڑھانے کا رجحان زیادہ

ہے، کلام کے معیار کی طرف دھیان ذرا کم ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ جو لوگ عام شاعری میں کوئی نام پیدا کر چکے ہیں ان کے کلام میں فنی خوبیاں تو ہوتی ہیں لیکن شرعی پہلوؤں کی جانکاری کا فقدان جھلکتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ شرعی پہلوؤں کی نگہداشت کے ساتھ شاعری کرتے ہیں ان کے ہاں شاعری کے اصول ڈھیلے پڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مستثنیات ہر دو طبقات میں پائی جاتی ہیں جو الشاذ کالمعدوم کے زُمرے میں آتی ہیں۔

الحاصل، ڈاکٹر افضال احمد انور صاحب نے اپنے موضوع سے بھر پور انصاف کیا ہے ۔ وہ نعتیہ شاعری کے ہیئتی منظر نامے کو بڑی خوبصورتی سے منصۂ شہود پر لائے ہیں۔ اس مقالے میں تحقیقی دیانت، تنقیدی بصیرت اور موضوع کی عظمت کے حوالے سے حزم و احتیاط کے نشانات بڑے واضح ہیں۔

....

ہماری ملّی شاعری میں نعتیہ عناصر
......ایک گراں قدر تحقیقی مقالہ!

الحمدللہ ! آج کل نعت کے حوالے سے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی مساعی عروج پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اعلان ”رفعنا لك ذكرك“ کے مظاہر جا بہ جا دیکھے جارہے ہیں۔ پاکستان میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے مقالات بھی مسلسل لکھے جارہے ہیں اور کئی ایک مقالوں پر مختلف جامعات سے مقالہ نگاروں کو سندیں بھی عطا کی جاچکی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر اسحاق قریشی، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر افضال احمد انور، ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی ، ڈاکٹر طاہر قریشی کے مقالے کی نگراں محترمہ ڈاکٹر تنظیم الفردوس، ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی، ڈاکٹر شہزاد احمد اور راقم الحروف عزیز احسن ...... پی ایچ۔ ڈی کی سندیں پانے والے ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں جن کا تحقیقی کام نعتیہ ادب کی مختلف جہتوں ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

بیشتر تحقیقی مقالوں کی خواندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت کے حوالے سے کام کرنے والوں نے موضوعات کا چناؤ بھی بڑی ذہانت اور اپنے موضوع کی وسعتوں کے ادراک کے ساتھ کیا ہے۔ تحقیقی کام اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر قریشی بھی ان خوش بختوں میں شامل ہیں جن کی توجہ نعتیہ ادب پر

مرکوز رہی ۔ان کا مقالہ ’’ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر‘‘ ، پی ایچ۔ ڈی کی سند کے لیے لکھا گیا اور ۲۰۱۳ء میں جامعہ کراچی کے شعبہء اردو سے انہیں سند مل بھی گئی۔

مقالے کا عنوان ہی یہ ظاہر کررہا ہے کہ ’’ملت‘‘ کے احوال کے تذکروں میں ’’بانیء ملت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ‘‘ کا ذکر لازمی ہے۔ جب بھی ملت کے عروج و زوال کی کہانی بیان کرنے کا احساس تخلیقی ذہن کو اپنی گرفت میں لے گا، بانیء ملت علیہ السلام کا براہِ راست یا بالواسطہ حوالہ ضرور بالضرور آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر طاہر قریشی کو اپنے موضوع کے حوالے سے بہت سارا لوازمہ matter مل گیا۔ طاہر قریشی نے بھی تلاش وجستجو میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انہوں نے شعراء کے دواوین، شاعری کے مجموعے، شعری انتخاب، مختلف ادبی رسائل، اخبارات اور تواریخ کی ورق گردانی کرکے مفید مطلب لوازمہ جمع کیا اور اس پر بڑی خوبصورتی سے تبصرہ کرکے ظاہر کیا کہ وہ نہ صرف موضوع پر گرفت رکھتے ہیں بلکہ تایخی شعور اور ادبی پرکھ کی بصیرت کے ساتھ ساتھ حبِ رسول ﷺ کی کسک بھی دل میں محسوس کرتے ہیں۔ڈاکٹر طاہر قریشی کا یہ مقالہ ایسے ماحول میں لکھا گیا ہے جب پاکستان کے ایک طبقے نے یہ طے کرلیا ہے کہ پاکستان کے وجود میں لانے کی تمام مساعی کو سیکولر نظام کی خواہش کے تابع کردے اور اللہ سے کیا ہوا وعدہ فراموش کرادے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے، ادبی محاذ پر پاکستان بننے کے فوراً بعد فکری یلغار کی ایسی کوشش پہلے بھی ہوچکی ہے جس کے نتیجے میں حمد و نعت کی شاعری کے دروازے بند کرنے کے لیے مذہبی شاعری کو نا شاعری non poetry کہہ کر شعراء کو اس قسم کی شاعری سے دور رکھنے کی مذموم کوشش کی۔ بہت عرصے تک ایسا ہی ہوا بھی۔لیکن اللہ تعالیٰ نے کچھ مجاہدینِ ادب کے ذریعے نعتیہ ادب کے فروغ کے لیے فضا ہموار فرمادی ۔اسی لیے آج شعری تخلیقات میں نعتیہ تخلیقات کا حصہ تمام شعری سرمائے پر بھاری ہے۔

نعتیہ شاعری کا مقصد حبِ رسول ﷺ عام کرنا تو ہے ہی لیکن قوم کے فکری افق پر آفتابِ رسالت ﷺ کی کرنیں بکھیر کر دینی لمعات سے معاشرے کی فضا کو بقعہء نور بنانا

اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لانے کی کوشش کرنا بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ شعری نمونوں میں حبِ رسول ﷺ کے عناصر کے ساتھ ساتھ دینی پیغام اور دین پر عمل کرنے کی غیرمحسوس تبلیغی رَو بھی ہوتی ہے۔حضور رسالت مآب ﷺ نے شاعری کی ترغیبی قوت کا اندازہ لگا کر ہی شعراء کو قلمی جہاد کی طرف مائل کرنے کے لیے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو وہ اعزاز بخشا تھا جو کسی اور کو کبھی نصیب نہیں ہوسکا......یعنی آپ ﷺ نے حضرتِ حسان رضی اللہ عنہ کے لیے مسجدِ نبوی میں منبر رکھوایا جس پر کھڑے ہوکر وہ حضورِ اکرم کی شان میں اشعار پڑھتے تھے اور کفار ومشرکین کی ہجویات کا جواب دیتے تھے۔حضورِ اکرم ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے دعافرماتے ’’اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ‘‘(اے اللہ ! روح القدس کے ساتھ اس کی مدد فرما!...........مشکوٰۃ شریف جلد دوم ،صفحہ ۴۱۳)۔

ڈاکٹر طاہر قریشی کا موضوع غیرمحسوس طور پر اس احساس کی بنیاد پر متعین کیا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہء پاکستان کے لوگوں کو تاریخ کے آئینے کے سامنے لاکر کھڑا کردیا جائے ۔ علاوہ ازیں جو لوگ پاکستانی قوم کو تحریکِ پاکستان کے مقاصد سے انحراف پر اکسا رہے ہیں اور اللہ سے کیے ہوئے وعدے کے ایفا کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کررہے ہیں ان کے سامنے تاریخی حقائق رکھ دیے جائیں۔اس مقالے میں’شاعری کے متعدد ایسے نمونے پیش کیے گئے ہیں جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل کی تخلیقات سے اخذ کیے گئے ہیں۔یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ پاکستان کا مطالبہ‘ جدوجہدِ آزادی کے دوران میں صرف اور صرف اسلامی تشخص برقرار رکھنے کی خواہشات اورعزائم پر مبنی تھا۔

پیشِ نظر مقالے کے تیرہ ابواب ہیں۔ ان ابواب کی ترتیب بھی موضوع کی وضاحت در وضاحت کے اصول پر کی گئی ہے۔ ہر باب میں کوشش کی گئی ہے کہ موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ لوازمہ پیش کرکے ثابت کیا جائے کہ ہماری ملی تاریخ میں دو نازک ادوار یعنی سقوطِ دلی اور سقوطِ ڈھاکہ نے ملت کے حساس ترین طبقے یعنی طبقہء شعراء پر کیا اثرات مرتب کیے؟

مقالے کے ابواب کا تعارف کروانے سے قبل میری خواہش ہے کہ شعری تخلیقات میں موجود آفاقی عناصر کے حوالے سے کچھ معروضات پیش کردوں......ورڈز ورتھ نے کہا تھا:

All good poetry is the spontaneous overflow of powerful feelings

’’تمام اچھی شاعری شدید احساسات کا برجستہ اظہار ہے‘‘ ......اور احساسات کی شدت کے حوالے سے جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کے اجتماعی شعور میں پیدا ہونے والی اتھل پتھل سے بحرِ اذہان میں جو جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی احساسات کی شدت کا مقابلہ کسی انفرادی حادثے سے پیداہونے والی شدت سے نہیں کیاجاسکتا۔ اجتماعی احساسات کی شدت ہمیشہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ہاں ادب میں اس شدت کو وقتی ابال کے طور پر اظہار میں لایا جائے تو وہ صحافت بن جاتی ہے لیکن جب اظہار میں شدتِ احساس بھی ہو اور تخلیقی سچائی بھی تو وہ اظہار نثری سطح پر ہو یا شعری صورت میں......اس میں آفاقیت کا عنصر پیدا ہوجاتا ہے اور وہ مخصوص تاریخی صورتِ حال کی عکاس ہونے کے باوجود ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ آزادی سے سقوطِ دہلی اور سقوطِ ڈھاکہ تک جتنی شاعری محض وقتی جذباتی ابال کے اثر سے وجود میں آئی وہ بہت حد تک نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوچکی ہے۔لیکن جس شاعری میں مذہبی عنصر بالخصوص نعتیہ آہنگ پیدا ہوا وہ پہلے بھی زندہ تھی‘ اب بھی زندہ ہے اور آئندہ بھی زندہ رہے گی۔ڈاکٹر طاہر قریشی نے اسی آفاقی شاعری کے حوالے سے مسلمانانِ ہند و پاک کے احساساتی دائرے کے تخلیقی نقوش کااحاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

بابِ اول میں تصورِ ملت پر روشنی ڈال کر مغربی اور اسلامی تصورات کے فرق کی وضاحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام کا تصورِ ملت نہ تو زبان کی بنیاد پر قائم ہے نہ کسی خاص خطے اورنسل کی بنیا د پر اس کی بِنا ہے بلکہ ایک نبی (علیہ السلام) کے پیروکار چاہے جس قبیلے،نسل، خطے‘ طبقے اورلسانی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں وہ سب کے سب ایک ملت یا ایک امت ہیں کیوں کہ بقول مقالہ نگار’’قدیم اور جدید اردو کے بیشتر شاعروں نے ملت اور

امت کو عموماً ایک ہی مفہوم میں سمجھا ہے۔خواہ یہ الفاظ مفرد استعمال ہوئے ہوں یا تراکیب میں، دونوں صورتوں میں ملت اور امت کو ہم معنی الفاظ گردانا گیا ہے‘‘(صفحہ ۷)۔اسی طریقے پر’’قوم‘‘ کی تعریف کے لیے مقالہ نگار نے مختلف لغات کھنگالی ہیں اور بتایا ہے کہ مولوی عبدالحق کی مرتبہ لغت میں nation کے لیےصرف’’قوم اور ملت‘‘ کےمعنی اختیار کیے گئے ہیں۔ اوکسفر ڈانگلش اردو ڈکشنری میں nation کا مطلب’’قوم ،ملت جو عموماً ایک نسل، مشترک تاریخ، زبان وغیرہ کی حامل ہوتی ہے اور ایک ملک یا ریاست میں بستی ہے‘‘ درج ہے۔(ص۸)

اسی باب میں ملی شاعری کی تعریف بھی کی گئی ہے اور ملی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک ہر وہ شاعری جس کا تعلق ملتِ اسلامیہ سے ہو ملی شاعری ہے۔اس کے بعد ذیلی عنوانات کے تحت بتایا گیا ہے کہ’’ملت کی زبوں حالی‘‘،’’ملی مسائل کے حل کی تجاویز‘‘، ملت کی عظمتِ رفتہ پر احساسِ تفاخر‘‘، ملت کے روشن مستقبل کی نوید‘‘، فردِ واحد کی ملت کے نمائندے کی حیثیت سے تعریف وتحسین یا توہین و تذلیل‘‘، ملی تشخص کی علامات و آثار کا فخریہ یا متاسفانہ ذکر‘‘،تحفظِ ملت کے عزائم‘‘، ملتِ اسلامیہ کے دشمنوں کو للکار‘‘،تبلیغ وتلقین یا دعوتِ جہاد‘ وغیرہ کے عنوانات سے کی جانے والی شاعری ملی شاعری کے ذیل میں آتی ہے۔

اسی باب میں ملی ،قومی اور وطنی شاعری کا فرق‘ بتانے کے لیے اقبال کی شاعری کے دونمونے پیش کیے ہیں:

قومی شاعری کا نمونہ:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ملی شاعری کا نمونہ:

چین و عرب ہمارا‘ ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

دوسرے باب میں ''نعت اور نعتیہ عناصر'' کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا گیا ہے اور لفظِ نعت کا مفہوم بتا کر اس لفظ کے توصیفِ نبی ﷺ کے معنوں میں استعمال کیے جانے کا اصطلاحی مفہوم ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر بلاواسطہ نعتیہ عناصر اور بالواسطہ نعتیہ عناصر کے عنوانات کے تحت تفصیل دی گئی ہے۔

بلا واسطہ نعتیہ عناصر میں مقالہ نگار نے شمائل،خصائل اور فضائل کے ذکر کو محسوب کیا ہے...... جبکہ استغاثہ و استمداد، خطاب و سلام ،عشقِ نبی ﷺ، نذرانہء درود و سلام ، عجز و انکسار، ارضِ نبی ﷺ میں موت کی آرزو، احساسِ عصیاں، ادب، امیدِ شفاعت ، غلامیء رسول ﷺ پر احساسِ تفاخر، مدینے کی حاضری اور وارفتگیء شوق کے اظہاری سانچوں کو بالواسطہ نعتیہ عناصر کے ذیل میں رکھا ہے۔

بلا واسطہ اور بالواسطہ نعتیہ عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے مقالے میں مختلف شعراء کی نعتوں کے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم مقالہ نگار نے لکھا ہے :

''واضح رہے کہ نعتیہ عناصر کی مندرجہ بالا دو حصوں میں تقسیم کی بعض مقامات پر کوئی واضح اور حتمی حد بندی ممکن نہیں ہے۔بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ جن میں بلا واسطہ اور بالواسطہ' دونوں عناصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں''۔ مقالہ نگار نے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے درجِ ذیل الفاظ پر یہ باب مکمل کیا ہے:

''نعت کے عناصر کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اگر کوئی نقاد تمام عناصر کی نشاندہی کرنا چاہے یا عناصر کی کوئی فہرست ترتیب دینا چاہے تو یہ کارِ محال ہے''۔(ص۳۴)

تیسرا باب ، جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) سے پہلے ملی شاعری میں نعتیہ موضوعات کی نشاندہی کے لیے وقف ہے۔ اردو کی ابتدائی شاعری میں ملی عناصر کی موجودگی کی نشاندہی کرتے ہوئے مقالہ نگار نے دکن کی مشہور جنگ ''تالیکوٹ[تلی کوٹہ]'' (جو۹۷۲ھ مطابق

۱۵۶۴ءلڑی گئی تھی) کے حوالے سے لکھی جانے والی حسن شوقی کی مثنوی ''فتح نامہء نظام شاہ'' کا ذکر کیا ہے جس جنگ کو بقول مقالہ نگار، حسن شوقی نے ''کفرو اسلام کی جنگ قرار دیا''(ص۳۹)۔''شہر آشوب میں نعتیہ عناصر' تلاش کرتے ہوئے مقالہ نگار نے اورنگزیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) تک کئی شعراء کے شہر آشوب کھنگالے ہیں جن میں نعتیہ عناصر کے نقوش واضح ہیں۔ اسی طرح ''ٹیپو سلطان پر لکھی گئی منظومات'' میں بھی نعتیہ شعری آہنگ کی نشاندہی کی ہے۔ پھر''تحریکِ مجاہدین'' کے حوالے سے لکھی جانے والی شاعری میں نعتیہ عناصر کی نشاندہی کی ہے اور مومن خاں مومن کی شاعری میں سید احمد شہید کے جہاد کے ذکر پر مبنی اشعار نقل کیے ہیں اور آخر میں ''واقعہ ہنومان گڑھی'' کے زیرِ عنوان مسلمانون کے ملی جذبات سے مملو اشعار نقل کیے ہیں۔

چوتھا باب ، ''جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے ملی شاعری پر اثرات'' کی نشاندہی کے لیے وقف ہے۔مقالہ نگار نے بڑی ناقدانہ بصیرت کے ساتھ اس جنگ کے مختلف مراحل میں احساسات کے اظہار کی صورت میں سامنے آنے والے شعری لوازمے (matter) کو کھنگال کر ذیلی عنوانات ترتیب دیئے ہیں مثلاً ''ابتدائی کامیابیاں اور شعراء کی توقعات''، ''تباہی و بربادی کی عکاسی''،''انجمنِ پنجاب کے مشاعرے''،''علیحدہ ملی تشخص کا واضح شعور'' وغیرہ۔

مقالہ نگار نے لکھا ہے :

''غور طلب بات یہ ہے کہ جنگِ آزادی سے پہلے جتنی بھی ملی شاعری ہوئی ہے بالعموم کم معروف شعراء کی جانب سے ہوئی ہے لیکن جنگِ آزادی کے بعد تو [گو یا قومی شاعری کا بند کھل پڑا یہاں کون سا شاعر تھا جو قوم کے درد میں مبتلا نہ ہو]''۔ (بریکٹ میں شان الحق حقی کی کتاب نکتہء راز سے مقتبس الفاظ ہیں)۔

پانچویں باب میں ''دورِ جدید کی ملی شاعری میں نعتیہ عناصر'' تلاش کرتے ہوئے

ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں......مثلاً

''حالی' ملی شاعری کا معمارِ اول'، ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی دینی احساسات سے سرشار منظومات''، ''شبلی، انگریزی سیاست اور ملت کی محکومی کا نکتہ چین''، ''اکبر کی شاعری' مسلم قومیت کی پشتیبان''......اور ''ڈپٹی نذیر احمد''۔

اس باب میں حالؔی کے مسدس کا حوالہ لازمی طور پر آنا تھا جس میں ملی درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اسی مسدس میں نعتیہ عناصر بھی بڑی نرالی شان سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ مقالہ نگار نے حالی کے مسدس سے منتخب اشعار نقل کرکے ان کی ''نعت صفتی'' اجاگر کی ہے اور ملی درد کے اظہاری نقوش ابھارے ہیں۔ حالی کی عرضداشت ''اے خاصہء خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے'' کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ علاوہ ازیں ''شکوہء ہند''، ''فلسفہء ترقی''، ''انجمنِ حمایتِ اسلام اور اس کے کام'' اور ''ترغیبِ امدادِ یتیماں'' والی نظموں کے ذکر سے حالی کے ملی درد کی شعری قوت اور اظہاری اختصاص کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی طرح ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی دینی احساسات سے سرشار منظومات'' کے ذیلی عنوان کے تحت مختلف شعراء کی ان نظموں کے کچھ اشعار نقل کیے گئے ہیں جو مختلف اوقات میں کانفرنسوں میں پڑھی گئی تھیں۔

ذیلی عنوان ''شبلی' انگریزی سیاست اور ملت کی محکومی کا نکتہ چیں''، میں شبلی کی شاعرانہ خدمات پر بات کی گئی ہے جس کی بنا پر کلیم الدین احمد نے شبلی کو اکبر و اقبال کا پیش رو کہا تھا (ص۸۹) ۔مولانا شبلی کی کئی منظومات کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ اس باب میں مقالہ نگار کی تنقیدی بصیر کا ظہور ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہستیءمسلم کی رہائی'' کے عنوان سے نظم میں شبلی کے قلم نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور سرورِ عالمﷺ کے لیے سخت گستاخانہ طرزِ تخاطب اختیار کیا ہے''۔اس کے بعد انہوں نے شبلی کے درجِ ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ حضرائے یثرب میں

کہ جس کا بندہ ءفرماں زمیں سے آسماں تک ہے

کوئی جاکر یہ کہہ دے ہم گنہگاروں کی جانب سے

کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

مقالہ نگار نے لکھا:'' شبلی جیسا عظیم سیرت نگار ......''پڑا سوتا ہے کوئی'' جیسی زبان پیغمبرِ خاتمﷺ کے لیے استعمال کرے' ناقابلِ فہم اور قابلِ افسوس بات ہے''۔(ص۹۰)۔ یہاں احساس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے جہاں ملی شاعری کے خدو خال اجاگر کیے ہیں وہیں انہوں نے زبان و بیان کی بے احتیاطیوں پر گرفت کرکے اپنے تنقیدی شعور کا اظہار بھی کیا ہے۔شبلی کے ایک ہی مصرعے میں ''پڑا سوتا ہے'' تو گستاخانہ تھا ہی اسی مصرعے میں ''یثرب'' لکھنا بھی مناسب نہ تھا......لیکن مقالہ نگار نے صرف ایک غلطی کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھا۔

اس باب کے آخیر میں مقالہ نگار نے شبلی کی آواز کو حالی کی آواز سے زیادہ پر جوش کہاہے۔انہوں نے ماہرالقادری کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں :'' حالی نوحہ خواں اور شبلی رجز خواں'' (ص۹۰)......اس طرح مقالہ نگار نے' ملی شعری فضا میں شبلی کا مقام متعین کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔

ایک اور ذیلی عنوان ''اکبر کی شاعری' مسلم قومیت کی پشتیبان'' کے تحت ڈاکٹر طاہر قریشی نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریر سے اقتباس دے کر یہ بات ثابت کردی ہے کہ وہ اکبر کی شاعری کو ملی شاعری کے اعلیٰ مقام پر دیکھتے ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے لکھا تھا:

> ''سرسید ایک انقلاب لانا چاہتے تھے، لاکر رہے۔اکبر اس انقلاب کے زور کو کم کرنا چاہتے تھے۔کم کرکے رہے۔ بلکہ اگر برصغیر کی سیاسی و ملی تحریکوں اور تعلیمی و تہذیبی تنظیموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان پر جتنا گہرا اثر اکبر کے مسلک کا ہے سرسید کے مسلک کا نہیں ہے۔ مولانا شبلی، حالی، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور سلیمان ندوی' جنھوں نے

> مسلمانوں کے دینی و ملی شعور پر گہرا اثر ڈالا ہے سب کے سب سرسید سے کہیں زیادہ اکبر کے خیالات سے متاثر و متفق ہیں'' (ص۹۲)

اس کے بعد مقالے میں اکبر الہٰ آبادی کے کئی اشعار نقل کیے گئے ہیں جن میں ملی احساس کی زیریں لہریں ہیں اور بعض اشعار کی ''نعت صفتی'' بھی نمایاں ہے۔

اس باب کی آخری ذیلی سرخی ہے ''ڈپٹی نذیر احمد'' جس پر لکھتے ہوئے مقالہ نگار نے ابتداء ہی میں نورالحسن نقوی کی تحریر سے استشہاد کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے متعدد جلسوں میں ڈپٹی نذیر احمد ایک لیکچر دیا کرتے تھے اور لکچر سے پہلے اکثر ایک نظم پڑھتے تھے۔(ص۹۵) ۔ایک جلسے میں ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے اشعار پڑھے:

تصور میں پکڑ کر اپنے نانا جان کا دامن
خدا سے عرض کر یا قاضی الحاجات یاباقی
تباہی چھا رہی ہے تیرے پیغمبرؐ کی امت پر
بجز تیرے کرم کے اب نہیں کچھ آسرا باقی

(ص۹۷)

اسی طرح اور بھی اشعار نقل کیے ہیں جو مختلف مجالس اور کانفرنسوں میں پڑھے گئے تھے۔ یوں ڈپٹی نذیر احمد کی ملی احساس سے لبریز شاعری کے نمونے دے کر مقالہ نگار نے ڈپٹی نذیر احمد کی بہت معروف حیثیت ''نثر نگار'' کے علاوہ ان کی شاعرانہ حیثیت بھی اجاگر کردی ہے۔

مقالے کا چھٹا باب ''دورِ اضطراب کی ملی شاعری میں نعتیہ عناصر'' کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے۔ اس باب کو مقالہ نگار نے دس ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے: (الف) خطیبِ ملت مولانا ظفر علی خان (ب) مولانا محمد علی جوہر(ج) ز۔خ۔ش۔ (زاہدہ خاتون شروانیہ)(د)میر غلام بھیک نیرنگ(ہ)شاد عظیم آبادی(و)عبدالمجید سالک(ز)افق کاظمی

امروہوی(ح) خوشی محمد ناظر(ط)سیماب اکبر آبادی(ی)دیگر شعراء: حسرت موہانی'احمد علی شوق'احسن مارہروی' بیتاب عظیم آبادی' بشیر النساء بیگم' محمد اسمٰعیل ذبیح' وحید الدین سلیم' ظریف لکھنوی' مولانا سید اظہر حسن زاہدی' مبارک عظیم آبادی' پروفیسر اجتبٰی حسین رضوی' آغا حشر کاشمیری۔

اس پورے باب میں ملی احساس سے لبریز اشعار کے جواہر پارے بکھرے پڑے ہیں۔ مقالہ نگار نے ہر شاعر کے ایسے اشعار منتخب کیے ہیں جن میں ملی احساس کے ساتھ ساتھ نعتیہ عنصر بھی پایا جاتا ہو اور اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔تبصرے میں گنجائش نہیں ہے کہ ان تمام شعراء کے کلام کے نمونے یہاں پیش کیے جائیں۔

ساتواں باب :''اقبال، ملی شاعری اور نعت کا امتزاج'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس باب کے ذیلی عنوانات ہیں: ☆عالم گیر اسلامی ملت کا داعیِ اعظم ۔☆ذکرِ ملت' بحوالہ صاحبِ ملت علیہ الصلوٰۃ والسلام ۔

☆ کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر: وفورِ شوق......عظمتِ نبی ﷺ......عظمتِ اصحابِ نبیؐ بحوالہ سیدالانبیاء ﷺ......توصیفِ دیار و امصار بتوسط سیدالابرار ﷺ..... متفرقات۔

یہ باب اقبال کا شعری منظر نامہ پیش کرتا ہے۔اقبال کی شاعری میں براہِ راست یا بلاواسطہ نعتیہ اشعار کی تعداد بہت ہی کم ہے اس لیے مقالہ نگار نے نتائج کے زیرِ عنوان بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> ''اقبال کے کلام میں براہِ راست نعتیہ عناصر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔لیکن بالواسطہ نعتیہ عناصر ان کے کلام میں اس طرح آمیز ہوکر آئے ہیں کہ ایک نعتیہ لہر ان کے پورے کلام میں جاری و ساری نظر آتی ہے۔ گویا اقبال کے ہاں نعت بین السطور ملتی ہے ۔اسی لیے ان کے کئی اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی لفظ یا ترکیب ،کوئی تشبیہ یا استعارہ ایسا نہیں ہوتا جس کے باعث ان اشعار کو نعت کے زمرے

میں لا یا جاسکے۔لیکن شعر کی مجموعی فضا ایسی ہوتی ہے جو واضح طور پر نعتیہ تاثر کی حامل ہوتی ہے۔ مثال میں ان کی نظم ''بلال'' کا یہ شعر پیشِ خدمت ہے:

اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

شعر میں اگرچہ سرورِ کونینﷺ کا نام نامی نہیں لیا گیا لیکن مصرع اولیٰ ''کس کے'' کا مشارٌ الیہ سلطانِ مدینہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے''۔ (ص۱۸۷)

سچی بات یہ ہے کہ ہماری شاعری کی مجموعی فضا میں اقبال وہ واحد شاعر ہے جس کی پوری شاعری میں ملی احساس ایک زیریں لہر کی طرح موجزن ہے۔ ملی شاعری میں ترغیبِ عمل کے عنصر کی شمولیت کے لیے جس مرکزی نقطہء اتحاد کی ضرورت پیش آتی ہے وہ سوائے ''عشقِ رسولﷺ'' کے اور کوئی دوسرا نقطہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے اقبال نے براہِ راست نعت کہنے کے بجائے حضورِ اکرمﷺ کی ذات سے والہانہ عشق کا اظہار کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا واحد مرکزِ اتحاد صرف اور صرف حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

ڈاکٹر طاہر قریشی نے اقبال کی شاعری کے لیے ایک پورا باب مختص کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ ملی شاعری میں اقبال کی شاعری کوخصوصی توجہ درکار ہے۔ کیوں کہ بقول غالبؔ:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیء چشمِ حسود تھا

آٹھواں باب: ''دورِ تحریکِ پاکستان اور شعراء کا حبِ رسولﷺ''......کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے۔ اس باب میں ان چند شعراء کی تخلیقات کے حوالے دیئے گئے ہیں جن کا عمومی رجحان ''مذہبی'' تھا۔ گو ان شعراء نے نعت اور ملی شاعری کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن کو

بھی اپنایا لیکن ان کا تخلیقی رویّہ ملی احساسات کو نظمانے اور شمعِ حبِ رسولﷺ کے عشق کی لَو تیز کرنے کا غماز ہے۔

ڈاکٹر طاہر قریشی نے حفیظ جالندھری، صبا اکبرآبادی، ماہرالقادری، اسد ملتانی ، مامی بنگلوری، یحییٰ اعظمی اور نور بدایونی کے شعری خدو خال زیادہ اجاگر کیے ہیں اور''دیگر شعراء'' کی سرخی کے ذیل میں کرم حیدری'محمود اسرائیلی ، جگر مرادآبادی، بشیر فاروق، امین حزیں سیالکوٹی، محمد ظفر احمد انصاری، ڈاکٹر عنایت اللہ سلیمی، سکندرعلی وجد، بشیر النساء بیگم، اختر شیرانی اور شیخ محمد ایوب' وغیرہم کے اشعار کی مثالیں دی ہیں۔شعراء کی یہ فہرست اور بھی بڑھ سکتی تھی لیکن مقالہ نگار نے مقالے کے حجم کو معتدل رکھنے کے لیے چند شعراء ہی کا انتخاب کیا ہے۔ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے تذکرے کی ترتیب میں صباؔ اکبرآبادی کو ماہر القادری پر ترجیح کیوں دی؟......میرے خیال میں ماہرالقادری کی شاعرانہ حیثیت ، ملی احساس اجاگر کرنے کی ان تھک محنت، تنقیدی شعور اور نعتیہ شاعری سے وابستگی' اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کا ذکر پہلے آتا۔

بہرحال جو شعری نمونے پیش کیے گئے ہیں ان میں ملی احساس اور نعت صفتی ...... دونوں عناصر جمع ہیں۔

نواں باب''قیامِ پاکستان کے بعد ملی شاعری میں نعتیہ عناصر (۱۹۶۵ء تک)'' کی نشاندہی کے لیے وقف ہے۔ اس باب میں وہ شاعری پیش کی گئی ہے جس میں ملتِ اسلامیہ پاکستان کے اجتماعی شعور میں دینی عناصر اور حبِ رسولﷺ کے میلانات نے واضح نقوش اختیار کرلیے ہیں۔قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات قوم کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ شعراء نے اس سانحے کے حوالے سے جو نظمیں لکھیں ، ان میں بھی نعتیہ آہنگ موجود تھا۔ڈاکٹر طاہر قریشی نے بڑی محنت،جستجو اور تلاش سے ایسی شاعری کے چند نمونے جمع کیے ہیں جو قائدِ اعظمؒ کی رحلت پر لکھے گئے مرثیوں کی شکل میں تھی۔

اس باب کا ذیلی عنوان صرف ایک ہے یعنی''رحلتِ قائدِ اعظم اور شعراء کا اظہارِ

عقیدت‘‘۔ قائدِ اعظم کی رحلت پر یوں تو ہزاروں شعراء نے اظہارِعقیدت کیا تھا لیکن مقالہ نگار نے مقالے کے حجم کے پیشِ نظر صرف چند شعراء کے احساسات کو نمایاں کیا ہے، مثلاً حفیظ جالندھری ، شورش کاشمیری، ماہرالقادری، اسد ملتانی، یوسف ظفر، صبا اکبرآبادی، احسان دانش، امامی بنگلوری، کیف بنارسی، کرم حیدری وغیرہم۔علاوہ ازیں ’’چنددوسرے شعراء‘‘ کی سرخی کے تحت مقالہ نگار نے امین حزیں سیالکوٹی، ابوظفر نازش رضوی، عنایت اللہ مشرقی، نعیم صدیقی، بشیر فاروق، راغب مرادآبادی، سید مبارک شاہین اور سید سرفراز حسین جوہر کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔

نویں باب کی فہرست میں تو صرف اتنے ہی نام ہیں لیکن متن میں دوسرے شعراء کا کلام بھی نمونۃً پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً آرزو لکھنوی، حاجی لق لق، ش۔ضحیٰ، نہال سیوہاروی، قاضی فتح محمد فاتح اور سیماب اکبرآبادی۔ یہاں بھی مجھے محسوس ہوا کہ فہرست میں نمایاں لکھے گئے ناموں میں سیماب اکبرآبادی کا نام ضرور ہونا چاہیے تھا جسے کسی وجہ سے مقالہ نگار نے صرف متن میں دیدیا ہے۔ مقالہ نگار نے سیماب اکبرآبادی کے ایک مکمل مجموعے کا ذکر کیا ہے جس کا نام ہی ’’قائد کی خوشبو‘‘ ہے۔ اس مجموعے سے جو چندنمونے پیش کیے گئے ہیں وہ نہ صرف شعری محاسن کے لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں بلکہ قائدِ اعظم کی شخصیت میں اسوہء رسول کی جھلک دیکھنے دکھانے کے حوالے سے بھی اہم ہیں۔ مقالہ نگار نے سیماب اکبرآبادی کی ایک نظم ’’قائدِ اعظم کے مزار پر، ایک سال بعد‘‘ کے تین اشعارنقل کیے ہیں۔ تمہیداً انہوں نے بتایا ہے کہ اس نظم میں ہادیء عالمﷺ کا استفسار اور قائدِ اعظم کا [خیالی]مکالمہ نقل کیا گیا ہے:

جمع ہو گا زیرِ رایت کاروانِ پاکیاں
پھر میسر قوم کو ہوگی معیت آپ کی
کیا عمل لائے ہو جب پوچھیں گے ختم المرسلینﷺ
معرضِ اظہار میں ہوگی طبیعت آپ کی

ارضِ پاکستاں، بعنوانِ عمل لایا ہوں میں
قوم کی قربانیوں کا ماحصل لایا ہوں میں

(ص۲۴۸)

شورش کاشمیری کی ملی حمیت ان کی تقریباً ہرتحریر سے نمایاں ہوتی تھی۔ مقالہ نگار نے بجا طور پر لکھا ہے:

> جو ملک ’’پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الا اللہ‘‘ کے نعرے پر حاصل کیا گیا ہو۔ اسی میں اللہ و رسولﷺ کے احکامات سے اعراض پر شورش کی تنقید بے سبب نہیں۔ ’’اقبال سے ہم کلامی‘‘ میں اقبال کی زبانی اس رویے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بالکل درست کہا گیا ہے:
>
> سلطنت لے کر خدا اور مصطفٰی کے نام پر
> اب خدا اور مصطفٰی کی راہ پر کوئی نہیں

(ص۲۵۲)

پورے باب میں جن جن شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے اس میں ملی حمیت اورنعتیہ عناصر کی موجودگی اس بات کی ضمانت ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کو لادینی ڈگر پر ڈالنے والے حکمرانوں کے رویے کے برعکس ،شعراء کا بڑا طبقہ، ملکِ خداداد پاکستان کو اس کے معرضِ وجود میں آنے کے اصل مقصد کے تحت لانے کا متمنی تھا......اور یقیناً یہ ملتِ اسلامیہء پاکستان کے اجتماعی ضمیر کی آواز تھی۔

مقالے کے دسویں باب کو’’جنگِ ستمبر اور ملی شاعری میں نعتیہ عناصر کی جلوہ گری‘‘ کا عنوان دیا گیا ہے۔ جنگِ ستمبر میں پاکستانی قوم کا ضمیر جاگا اور ہر طرف قوم کا اسلامی تشخص اجاگر کرنے کی آواز بلند ہوئی۔ اس محاذ پر شعراء نے خاص کردار ادا کیا۔ مجاہدینِ پاکستان کے حوصلے بلند کرنے کے لیے جتنے ترانے لکھے گئے ان میں جذبہء حب الوطنی ابھارنے کے ساتھ ساتھ ہر مجاہدِ قوم کو نبیءکریمﷺ سے نسبت کا احساس دلایا گیا۔

مقالہ نگار نے ہزاروں ترانوں اور نغموں کو پڑھا اور ان میں سے چند کا انتخاب کر کے مقالے میں شامل کیا ہے۔ اس باب کے ذیلی عنوانات ہیں:

شعراء کا ملی شعور......مجاہدین اور شہداء کو خراجِ تحسین بحوالہء سید المرسلین ﷺ...... دامانِ نبی ﷺ سے وابستگی پر تفاخر کا احساس......سرفروشانِ ملت کی حوصلہ افزائی بنام احمدِ مختار......شہروں اور عسکری اداروں کو بوسیلہء ہادیء عالم ﷺ نذرانہء عقیدت......ختمی مرتبت آنحضرت ﷺ کے وسیلے سے دعائے فتح و نصرت......بارگاہِ رسالت ﷺ میں فریاد و استمداد......عزمِ فتح، حصولِ فتح اور اظہارِ تشکر میں تذکرۂ رسول ﷺ......اور......متفرقات۔

ان ذیلی عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مقالہ نگار نے کن کن زاویوں سے جنگِ ستمبر کے ترانوں اور نغمات کو دیکھا اور ان کے کس کس لونی عکس(shade) کو نمایاں کیا ہے۔ ہم یہاں صرف رحمان کیانی اور حافظ مظہرالدین کے چند اشعار نقل کریں گے تا کہ مقالے میں پیش کیے گئے نمونوں کی ہلکی سی جھلک دکھا سکیں۔

رحمان کیانی نے بحیثیت شاعر' ۱۹۶۵ء ہی میں شہرت حاصل کی تھی۔ وہ صاحبِ سیف وقلم تھے، یعنی وہ ایک سپاہی بھی تھے اور ایک قلم کار بھی۔ میری دانست میں پاکستان میں ''رزمیہ شاعری'' کا سب سے بہتر اور منفرد انداز انہی کا تھا۔ ملاحظہ ہوں ان کے طویل مسدس بعنوان ''معرکہء چھمب جوڑیاں'' کے دو بند:

توپیں بھی چند، ٹینک بھی کچھ ہمسفر لیے
سامانِ جنگ اور بہت معتبر لیے
یعنی خدا کی تیغ، نبیؐ کی سپر لیے
باندھے کفن سروں سے، ہتھیلی پہ سر لیے
کہنے کو سو پچاس تھے لیکن ہزار سے
لڑنے کو بڑھ رہے تھے یمین و یسار سے
سر پر لوائے پاک نشانِ ظفر لیے

سبز و سپید پرچمِ نجم و قمر لیے
یعنی دعائے حضرتِ خیرالبشرؐ لیے
یا تیرگی سب میں چراغِ سحر لیے
سنگین آبدار کے پھل چومتے ہوئے
پہنچے نئی سحر کی طرح جھومتے ہوئے

(ص۳۰۹)

اردو شاعری میں اصل جنگ کے تجربات کی روشنی میں لکھا جانے والا یہ رزمیہ اپنی آپ مثال ہے۔ اس مسدس میں ملی شعور، جہادی روح، شعری حسن اور دین و وطن پر فدا کاری کا جذبہ اس طرح ضوریز ہے کہ رشک آتا ہے۔ مسدس کی نعت صفتی بھی دیدنی ہے!

حافظ مظہرالدین نے ''جہادو جنگ'' کے زیرِ عنوان ایک مخمس لکھا تھا۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

اٹھے ہیں سرورِ کون و مکاں کے دیوانے
جہانِ کفر میں ایماں کا نور پھیلانے
شجاعتوں کے امیں، بجلیوں کے افسانے
ہوائے بدر کی پاکیزگی نگاہ میں ہے
حیات جلوہ در آغوشِ رزم گاہ میں ہے
یہ سرفروش فداکار مصطفیؐ کے ہیں
یہ جاں نثار، طلب گار مصطفیؐ کے ہیں
یہ جان و دل سے خریدار مصطفیؐ کے ہیں
انھیں نوازے گی اک روز گفتگوئے رسولؐ
انھی کا حصہ ہے تابندگیء روئے رسولؐ

(ص۳۱۴)

مقالے کے اس باب میں قوم کو دکھایا گیا ہے کہ بے راہروی اور دین بیزاری کے ماحول میں بھی جب قوم پر کوئی کڑا وقت آتا ہے تو نہ صرف یہ قوم اکھٹی ہوجاتی ہے بلکہ اس کی فکر کا رخ بھی سوئے حجاز ہی ہوتا ہے کیوں کہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے اورامتِ مسلمہ کی روح حجازی ہے۔غالبًا اسی احساس کے تحت اقبال نے کہا تھا

ع　ذرا نم ہوتو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مقالے کا گیارھواں باب ''ملی شاعری میں المیہء فلسطین اور نعتیہ عناصر'' کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے۔ یہ باب اس بات کا اشاریہ ہے کہ مقالہ نگار کے لیے ''ملت'' سے مراد پوری ملتِ اسلامیہ ہے نہ کہ صرف کسی ایک وطن میں بسنے والی قوم یا پاکستانی قوم۔مسلمانانِ پاکستان کا یہی ملی احساس ہے جو ہر اس موقع پر ظاہر ہوتا ہے جب کرہء ارض کے کسی خطے میں امتِ مسلمہ کا کوئی گروہ ، ابتلا کا شکار ہو۔ چنانچہ فلسطین کا مسئلہ بھی پاکستان کے شعراء نے ہمیشہ ،اپنا ہی مسئلہ سمجھا ہے اور اس پر بڑے ایمان افروز انداز میں نظمیں کہی ہیں۔

مقالہ نگارنے زیرِ تبصرہ باب کا متن' چارذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔

(الف)ملی شاعری میں تذکرہء فلسطین کی روایت......(ب)عرب اسرائیل جنگ ۱۹۶۷ء......(ج)سانحہء بیت المقدس......(د)مسجدِ اقصیٰ میں آتشزدگی۔

مقالہ نگار نے کئی شعری مثالیں دی ہیں اور متعدد شعراء کے ایمانی جذبات کا اظہاری رویہ اجاگر کیا ہے۔ مذاق العیشی کی نظم ''ارضِ مقدس'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جن کا مزاج رزمیہ بھی ہے اورجن میں نعتیہ عناصر بھی نمایاں ہیں:

مل بیٹھے ہیں آپس میں یہود اور نصاریٰ
پھر ارضِ مقدس نے مسلماں کو پکارا
اک سمت سے اس دور کے فرعونوں کی طاقت
اک سمت ''غلامانِ محمدؐ'' ہیں صف آرا
یہ معرکہ ہے اک حق و باطل کا تصادم

یہ معرکہ طوفان سے ساحل کا تصادم
اللہ نے چاہا تو یہ اللہ کے بندے
بن جائیں گے باطل کے لیے موت کے پھندے

(ص۳۶۹)

حفیظ تائبؔ نے استغاثہ بعنوان''یا رسول اللہ انظر حالنا'' پیش کیا ہے:

کب سے محرومِ اذاں ہے سرزمینِ مرسلیں
قبلہء اول ہے اہلِ جور کے زیرِ نگیں
اک نگاہِ خاص ہے درکار شاہِ انبیاءؐ
یا رسول اللہ انظر حالنا

(ص۳۷۷)

اس باب کی اختتامی سطور میں مقالہ نگار نے شعراء کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایسے شعائرِ ملی جن کا براہِ راست تعلق صاحبِ ملت، ختمی مرتبت، آفتابِ رسالت ﷺ سے ہو' ان کی حفاظت سے غفلت ملتِ اسلامیہ کی غیرت وحمیت پر زور دار طمانچے سے کم نہیں اور اس بے غیرتی و بے حمیتی کا سبب وہ [شعراء] بجار طور پر دینِ محمدﷺ سے دوری کو قرار دیتے ہیں جس کا اظہار جا بجا کیا گیا ہے اور ملتِ مسلمہ کو ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے لیے کٹ مرنے کی تلقین کی گئی ہے اور باور کرایا گیا ہے کہ جب تک مسلمان صاحبِ قاب قوسین، نبی الحرمین ﷺ کے نقشِ قدم پرنہیں چلیں گے انہیں دنیا میں سربلندی نصیب نہیں ہوسکتی''۔(ص۳۹۱)

مقالے کا بارہواں باب: ''ملی شاعری میں المیہء سقوطِ ڈھاکہ اور نعتیہ شاعری''

کے زیرِ عنوان رقم کیا گیا ہے۔ اس باب کو مقالہ نگار نے بڑی تنقیدی بصیرت سے ترتیب دیا ہے؛ جس کا احساس ذیلی عنوانات پر ایک نگاہ ڈالتے ہی ہوجاتا ہے۔ ذیلی عنوانات یہ ہیں: (الف) علیحدگی کے آثار: شعراء کی پیش بینی، تشویش و انتباہ......(ب)جنگِ دسمبر۱۹۷۱ء اور شعراء کا محاذِ سخن......(ج)سقوطِ ڈھاکہ اور شعراء کی اشک فشانی (د)مشتعل ومنفعل شعراء بحضور فاتحِ بدر وحنین ﷺ......(ہ)مابعدِ شکست شعراء کا طرزِ عمل۔

عبرت صدیقی اپنی نظم ''اے مسلمانو!'' میں جادہء حق سے بھٹکنے والوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بھٹک کر جادہء حق و صداقت سے کہاں گم ہو
تمھیں آواز فطرت دے رہی ہے اے مسلمانو!
کہاں تک تم کو سرکارِ دوعالم ؐ سے محبت ہے
کہاں تک تم کو حاصل خالقِ عالم کی قربت ہے
کہاں تک تم رسول اللہ کی تقلید کرتے ہو
خدا کا خوف ہے دل میں، کہاں تک اس سے ڈرتے ہو
بہت خوش ہو نظر انداز کرکے حکمِ ربی کو
یہ آخر ہوگیا کیا غیرتِ احساسِ ملی کو

(ص۴۰۳)

کرم حیدری کی نظم ''عزمِ اتحاد'' بھی اسی قسم کے احساسات کی عکاسی کررہی ہے:

کیا خبر تھی سیاست کے ملبوس میں ہوں گے ایسے سیہ کار انسان بھی
جن کی وحشت سے کانپیں گے حیوان بھی؛ جن کی سیرت سے لرزیں گے شیطان بھی
اپنی بنیاد ہے دینِ اسلام پر، جان دیتے ہیں ہم دین کے نام پر
ہم نگہباں محمدؐ کے آئین کے؛ خود محمدؐ ہمارے نگہبان بھی
اہلِ بنگال ہم، اہلِ پنجاب ہم، مشترک ہیں مگر سرحدیں قلب کی

ہم بلوچی بھی، سندھی بھی، افغان بھی سب سے پہلے مگر ہیں مسلمان بھی

(ص۴۰۴)

شعراء کی یہ تنبیہ آمیز آواز؛ صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ پھر جنگ چھڑگئی اور شعراء نے رزمیہ نظمیں لکھ لکھ کر مجاہدین کے حوصلے بلند کرنے کی سعی کی لیکن پاکستانی قیادت نے انتہائی بے غیرتی کا ثبوت دیا۔ بہر حال رجز کا ایک انداز عبدالعزیز خالد کی نظم ''ہم حزبِ محمدؐ ہیں'' کے چند اشعار میں ملاحظہ ہو:

ہم خرمنِ باطل کے لیے برقِ تپاں ہیں
ہم شیرِ ژیاں، سیلِ رواں، کوہِ گراں ہیں
بت خانہء ایام میں گلبانگِ اذاں ہیں
مردانِ خدا کے لیے پیغامِ محبت
ابلیس کی امت کے لیے قہرِ الٰہی
ہم حزبِ محمدؐ ہیں ہم اللہ کے سپاہی

(ص۴۰۶)

اسی طرح ''اے مجاہد'' کے زیرِ عنوان عبدالعزیز خالد نے لکھا:

اے مجاہد! ہے تجھے اپنی حقیقت کی خبر
تو ہے منجملہء آیاتِ خدائے اکبر
جھک کے کرتے ہیں مدام اختر و مہ تجھ کو سلام
آل و اصحابِ محمدؐ کا ہے سایہ تجھ پر
تیری جانب نگراں گنبدِ خضرا کا مکیںؐ
وہ کہ جو ساری خدائی کے خزانوں کا امیںؐ
دیکھنا جذبہء دل آنچ نہ کھا جائے کہیں
وہ خفا ہو تو مسلماں کی نہ دنیا ہے نہ دیں

(ص۴۰۶)

حسن احسانی مرادآبادی کی نظم ''قلعہء اسلام کے ان سب شہیدوں کو سلام'' بھی لائق توجہ ہے:

باغِ احمدؐ کے گلوں کی رنگ و بو کے واسطے
اے جیالو! دینِ حق کی آبرو کے واسطے
موت کا پیغام بن جاؤ عدو کے واسطے
ہو اگر بدر و احد کے سرفروشوں کے غلام
تم دفاعِ ملک و دیں کے واسطے آجاؤ کام!

(ص۴۱۵)

(ج) سقوطِ ڈھاکہ اور شعراء کی اشک فشانی: سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ شعراء نے بہت سے نوحے لکھے۔ عزیز لدھیانوی نے اسبابِ شکست بیان کرتے ہوئے احساس دلایا ہے کہ ہم فرامینِ محمدؐ سے غفلت برتنے کی پاداش میں شکست سے دوچار ہوئے ہیں:

ہے بجا ہم کو شکست اپنوں کی غفلت سے ہوئی
گھر کی غداری سے اغیار کی طاقت سے ہوئی
اپنی ناچاقی و احساسِ رقابت سے ہوئی
یہ گھڑی کم نہ ہمیں صبح قیامت سے ہوئی
حسرتا! کیسی یہ بد بخت گھڑی آئی ہے
گویا اپنے ہی گناہوں کی سزا پائی ہے
ہم نے احکامِ الٰہی سے جو سرتابی کی
جب فرامینِ محمدؐ سے بھی غفلت برتی
جب ہوئی جذبہء اخلاق و محبت میں کمی

نہ رہی اپنے فرائض سے ہمیں دلچسپی
پھر زمانے میں ہمارا نہ رہا عز وقار
پھر مقدر میں ہمارے نہ ہوا جشنِ بہار

(ص۴۲۸)

المیہء سقوطِ ڈھاکہ پر شعراء کی جو احساساتی شعری لہریں مقالے کے سمندر میں موجزن ہیں ان کے باعث پورا باب خوں رنگ ہوگیا ہے۔لیکن ان اشعار میں بیشتر نعتیہ آہنگ بالواسطہ ہے۔ تاہم مقالہ نگار نے بہت حد تک ایسے اشعار ہی منتخب کیے ہیں جن میں نعتیہ عنصر نمایاں ہے۔

(د) مشتعل اور منفعل شعراء بحضورِ فاتحِ بدر و حنینﷺ: یہ عنوان سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے رقم ہونے والے احساسات کی توسیع ہے۔ یہاں کچھ اور مسائل شعری زبان میں بیان ہوئے ہیں۔ اختر لکھنوی وہ زخم خوردہ پاکستانی تھے جن کو المیہء سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بمشکل موجودہ پاکستان میں قدم رکھنے کی توفیق ہوئی تھی۔انہوں نے دو ہجرتوں کا غم سہا تھا اور اس کو بھرپور طریقے سے اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا تھا۔ انہوں نے حضورِ اکرمﷺ سے اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے کہا:

عیاں ہے آپؐ پہ ہم بے گھروں کا افسانہ
قبول کیجیے دو ہجرتوں کا نذرانہ
بس اک نگاہ کے طالب ہیں آبلہ پا ہم
عذابِ در بدری بڑھ رہا ہے روزانہ

(ص۴۳۴)

جو لوگ پاکستان بنانے کے لیے جدوجہد کرنے اور اس کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ایک ہجرت کا عذاب جھیل کر مشرقی پاکستان پہنچے تھے اور پھر جب مشرقی پاکستان ، بنگلہ دیش بن گیا تو پاکستان کے بے رحم حکمرانوں نے ان سچے پاکستانیوں کو بنگالیوں کے

جذبہء انتقام کی بھینٹ چڑھانے کے لیے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ جو لوگ کسی نہ کسی طرح پاکستان آگئے انہیں وہ مقام بھی دینے پر راضی نہ ہوئے جو یہاں کی اقلیتی آبادی کو دے رکھے تھے۔اختر لکھنوی کی شاعری میں اس انسانی المیے کا کرب صاف محسوس ہوتا ہے۔

(ہ) مابعد شکست شعراء کا طرزِ عمل: اس عنوان کے تحت پاکستانی فوج کے سپاہیوں کی ذلت آمیز قید کا احوال ، شعراء کی تخلیقات کا حصہ بنا ہے۔کسی نے مجاہدین کو ڈھارس بندھائی ہے ۔کسی نے ان کے دکھ میں شرکت کا اعلان کیا ہے اور ان کی رہائی کی دعائیں کی ہیں۔کسی نے ان کی رہائی کے بعد خوشی کا اظہار کیا ہے۔ بچے کھچے پاکستان کے لیے سلامتی کی دعائیں بھی کی گئیں اور قوم کو مایوسی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے حوصلہ افزا نعرے بھی لگائے گئے۔عزیز لدھیانوی کی نظم ''تعمیرِ نو'' اسی قسم کے احساسات کی عکاس ہے:

ہم کو کرنی ہے نئی تعمیر پاکستان کی
خود بنانی ہے ہمیں تقدیر پاکستان کی
ظلمتوں سے اس کی اب پھوٹے گی نورانی کرن
ہوگی با اندازِ نو تعمیر پاکستان کی
دھوئیں گے اب اپنی پیشانی سے ہم داغِ شکست
خون سے لکھیں گے اب تحریر پاکستان کی
حق کے بندے اور بن جائیں محمدؐ کے غلام
خود بخود ہوجائے گی تطہیر پاکستان کی

(ص۴۴۴)

پاکستانی قوم اور لکھاریوں کا سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے کو جلد بھول جانا ایک بڑا سانحہ ہے۔اس لیے ڈاکٹر طاہر قریشی نے اس باب کا اختتام ان سطور پر کیا ہے:

''شعری تخلیقات میں یہ سانحہ ابتدائی چند برسوں تک تو تھوڑا بہت موضوع ضرور بنا لیکن آہستہ آہستہ مملکتِ سخن سے اس موضوع کو دیس نکالا دے دیا

گیا اور سقوطِ مشرقی پاکستان جو محض قومی اور ملی سانحہ ہی نہیں ایک عظیم انسانی المیہ بھی تھا، اسے (چند مستثنیات چھوڑ کر) ایک المیے کے طور بھی یاد نہیں رکھا گیا اور وہ تاریخ کے اوراق میں گم ہوگیا۔کارواں تو لٹا سو لٹا افسوس تو یہ ہے کہ......

ع کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا''

(ص۴۴۶)

مقالے کا تیرہواں باب ''ماحصل'' کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے جس میں پورے مقالے کے چیدہ چیدہ نکات دہرائے گئے ہیں۔مقالہ نگار نے اختتامی سطور میں یہ اہم نکتہ پیش کیا ہے کہ مسلمانوں کا تصورِ ملی صرف اور صرف صاحبِ ملت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی دین ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ملی شاعری کے مختلف ادوار کے مطالعے اور اس دوران میں پیش کی گئی مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی مخصوص ہیئتِ ترکیبی کے باعث مسلمان جدید تصوراتِ قومیت کے مطابق ایک قوم نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی ملت ہیں جس کا مرجع ومحور سرکارِ دوعالمﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔گویا مسلمانوں کا تصورِ ملی صرف اور صرف صاحبِ ملت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی دین ہے اور یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اردو کی ملی شاعری میں حوالہء ختم الرسلﷺ ایک ناگزیر عنصر کی صورت میں نظر آتا ہے''۔

مقالہ نگار نے ملی شعور میں نسبتِ رسولﷺ کے ادراک کا احساساتی دائرہ از ابتداء تا انتہا بڑی خوبصورتی سے مکمل کیا ہے۔ علاوہ ازیں سقوطِ دلی سے سقوطِ ڈھاکہ تک کے دورانیے میں تخلیق ہونے والا شعری سرمایہ کھنگال کر تحقیقی مقاصد کی تکمیل بھی کی ہے اور مقالہ نگاری کے تقاضے بھی پورے کیے ہیں۔

بڑے شعراء مثلاً شبلی نعمانی، ظفر علی خاں اور سیماب اکبرآبادی کے کلام میں بیان کی بے احتیاطیوں کی نشاندہی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے شاعری کو محض سراہا ہی نہیں ہے بلکہ اسے پرکھا بھی ہے۔ مثالیں دینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے اس لیے امید کی جاتی ہے کہ مقالے کا قاری میرے اشاروں کی روشنی میں متعلقہ ابواب میں تنقیدی شعور کی جھلکیاں بھی دیکھ لے گا۔

مقالہ نگار اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں واحد شاعر ہیں جن کی ملی شاعری میں نعتیہ عناصر، ہر شاعر سے زیادہ ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''اردو کی پوری ملی شاعری میں کوئی اور شاعر نعتیہ عناصر کی شمولیت کے لحاظ سے ان [مولانا ظفر علی خان] کے مقابل نہیں ہے۔ جس سے مولانا ظفر علی خان کے ملی شعور اور ان کی سید البشر ﷺ سے والہانہ شیفتگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے''۔

ابھی یہ مقالہ تشنۂ طباعت ہے اس لیے میری دعا ہے کہ یہ جلد از جلد شائع ہو ...... اس کے ذریعے اسلام کا تصورِ ملت بھی اجاگر ہو اور نظریۂ پاکستان کی دینی اساس بھی مضبوط ہو! (آمین)۔

....

[مطبوعہ: جسارت سنڈے میگزین، کراچی۔ اتوار ۴ مئی تا ۱۸ مئی ۲۰۱۴ء (تین اقساط)
نعت رنگ: 24، جولائی 2014ء]

اقبال کا سفرِ عشقِ رسول ﷺ اور اظہاری مراحل

اقبال کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ آدمی ''انسان'' بن جائے۔ انسان بننے کے لیے آدمی کو اپنے جیسے آدمیوں کے بتائے ہوئے راستوں سے نہیں بلکہ اپنے خالق کے بتائے ہوئے راستے کو اپنانا ہوگا اور اس کے لیے ایسے کردار کا نمونہ سامنے رکھنا ہوگا جس کو انسان کے خالق نے اپنی پسندیدگی کا تصدیق نامہ عطا کردیا ہو! یعنی وہ راستہ جو وحیء ربانی کے ذریعے صدق وامانت کے پیکر میں ڈھلی ہوئی کسی ہستی نے بنایااور بتایا ہو!

ایسا راستہ اپنانے اور ایسی ہستی کی پیروی کرنے کے معاملے میں انسان کو عقل سے آگے جانا ہوگا کیوں کہ بقول اقبال:

گزرجا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل سے آگے گزرنے کے لیے جو رہنما درکار ہوگا اسے اقبال نے ''عشق'' سے تعبیر کیا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہء تصورات

عشق کی رہنمائی میں عقل و دل و نگاہ اللہ کے فرستادے کی پہچان کرسکیں گے اور اس کی پیروی پر آمادہ ہوں گے۔ پھر جب انسان اللہ کے فرستادے کو(جس کو دینی اصطلاح میں نبی کہتے ہیں) اپنا رہبر مان کر اس کی ہر ادا کو اپنانے کا داعیہ پیدا کرلے گا تو سمجھا جائے گا کہ وہ ''آدمی'' سے ''انسان'' بننے کے لیے ذہنی و قلبی طور پر تیار ہوگیا ہے۔

آمدم بر سرِ مطلب ، اقبال نے اپنے فکری نظام کے ذریعے 'رہبرِ بے مثل ، دانائے سبل، مولائے کل جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات کے اوصاف بتانے، ان کی تعلیمات عام کرنے اور ان کے سیرت و کردار کی جزویات کی طرف عام انسانوں کی توجہ مبذول کروانے کا بیڑا اٹھایا۔

اس مرحلے پر خود اقبال نے روشِ عام سے متاثر ہوکر اپنے رہبر و رہنما حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور عام نعت گوشعراء کی طرح حضورِ اکرم ﷺ کی ہستی کو اپنے اشعار میں منعکس کیا۔ چنانچہ اول اول انہوں نے مقامِ رسالت کو سمجھنے اور ذاتِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اشعار کے آئینے میں سمونے کی اس طرح کوشش کی:

طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو
معنیءِ یٰسیں ہے تو مفہومِ اوادنیٰ ہے تو
اس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پر انوار کو
جو نہ سمجھا احمدِ بے میم کے اسرار کو

(کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال' مرتبہ: ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۴۱)

قابَ قوسین بھی، دعویٰ بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اٹھانا ، کبھی پنہاں ہونا

(ایضاً ص ۱۰۹)

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کا

(ایضاً ص ۳۳۲)

ہم جانتے ہیں میم کے پردے میں کون ہے
ہاں بھیدیوں سے منہ نہ چھپایا کرے کوئی

(ایضاً۔ص ۳۰۰)

ان تمام اشعار میں ''احمد'' کے ''میم'' کو ہٹا کر حضورِ اکرم کی ذاتِ والا صفات کو ''احد'' کے درجے پر فائز دیکھنے کی خواہش ہے جو معرفت کی زبان میں ''حقیقتِ محمدیہ ﷺ'' کے ظہور کا نقطہ ہے۔ ہماری شاعری میں اس طرح کے خیالات اقبال سے پہلے بھی گردش کررہے تھے۔ مثلاً محسن کاکوروی (المتوفی ۱۹۰۵ء) نے حضورِ اکرم کا سراپا لکھا ہے:

حقا کہ وہ جسم سر سے تا پا
ہے شاہدِ غیب کا سراپا
دیکھا ہے خدا نے اپنا عالم
آئینہ بنا کے قدِّ آدم
کھینچی بکمال حسنِ تدبیر
نقاشِ ازل نے اپنی تصویر

یا آسی غازی پوری(متوفی ۱۹۱۶ء) کا بڑا مشہور شعر ہے:

وہی جو مستویءِ عرش تھا خدا ہوکر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفےٰ ہوکر

علاوہ ازیں نعت گوشعراء میں ایک رجحان یہ پیدا ہوگیا تھا کہ وہ حضورِ اکرم ﷺ سے محبت کے اظہار میں آپ ﷺ کو اپنے قریب بلانے اور آپ ﷺ کے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کی آرزوئیں رقم کرنے لگے تھے۔ اقبال کے درجِ ذیل اشعار، اسی رجحان کی عکاسی کرتے ہیں:

تیرے قربان مرے گیسوؤں والے آجا
اب تو بردِ یمنی رخ سے ہٹالے آجا
ہاتھ میں تیغ بھی ہو ، رایتِ اسلام بھی ہو
جسم پر جامۂ نوری بھی ہو، احرام بھی ہو
تو بھی ہو ، ساتھ ترے حلقہء اصحاب بھی ہو
یعنی انجم بھی ہوں اور جلوۂ مہتاب بھی ہو

(کلیاتِ باقیاتِ اقبال، ص۳۶۵)

لیکن جب اقبال کی فکر اپنی بلوغت کو پہنچی تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ افکار اسلامی فکر سے متصادم ہیں۔ چنانچہ انہوں نے وہ تمام اشعار، اپنے حینِ حیات اپنی کسی کتاب میں شامل نہیں کیے۔ یہ اشعار تو بعد کے محققین نے جمع کیے ہیں۔

در اصل اقبال کا فکری ارتقاء ایک مستقل موضوع ہے جس پر بہت سی کتب بھی شائع ہوچکی ہیں۔لیکن میں صرف ''حقیقتِ محمدیﷺ'' کے حوالے سے اقبال کے فکری ارتقاء کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کررہاہوں۔ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں باقاعدہ کوئی نعت شامل نہیں ہوئی۔اس کے برعکس ان کے تمام کلام میں حضورِ اکرمﷺ کی سیرت، شخصیت اور آپﷺ کی تعلیمات کے آثار نمایاں ہیں۔ دراصل اقبال نے براہِ راست نعت کہنے سے گریز کرتے ہوئے فکرِ اسلامی کی ضوکو اپنے اشعار میں محفوظ کیا اور اپنے حینِ حیات جوشعری مجموعے شائع کئے ان میں اسی انداز کی شاعری کومحفوظ کرنے کی کوشش کی جو اسلامی فکر کی بلند سطح اور خیال کی راست بنت کے حامل بھی تھی اور انسانی کردار سازی میں معاون بھی۔

اب اس شاعری کا نقشہ دیکھیے :

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰے سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

امت کے احوال کے اظہار میں استغاثے کا یہ پہلو نکالا:

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!
وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے!
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے!

ساتھ ہی اقبال نے مسلمانوں کو حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ والا صفات سے سچی محبت اور آپﷺ کی مکمل پیروی کی ترغیب دی:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کردے
کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں
ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

استعماری قوتوں نے مسلمانوں کی ''یک قومیتی'' اور'' وحدتِ ملی'' والی فکر کو کچلنے کے لیے''اوطان'' تراشے اور بالآخر مسلمان اپنی وحدت کے پردے کو چاک کرکے''وطن پرست'' ہوگیا۔ اقبال نے اس روش کو بت پرستی قرار دیا اور کہا

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس بت یعنی ''وطن پرستی'' کی مضرتوں سے اقبال نے مسلمان کو خبردار کیا:

یہ بت کہ تراشیدہء تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانہء دینِ نبوی ؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھادے
اے مصطفویؐ ! خاک میں اس بت کو ملادے

وطن کے تصور سے جب انسانی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو اسلام کی جڑ کٹ جاتی ہے:

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ایک اور جگہ اقبال کہتے ہیں:

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

ان اشعار میں اقبال نے تعلیمِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کا خلاصہ پیش کرکے، حضورِ اکرم ﷺ کی توصیف و ثناء کی ایک اصلح جہت قائم کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں نعت کے عنوان سے کوئی الگ نظم نہیں رکھی گئی بلکہ ان کے فکری ارتعاشات ان کے شعری نگار خانے میں اسلامی رنگوں میں ظاہر ہوئے۔

کہنے کی باتیں بہت ہیں، لیکن دامانِ قرطاس تنگ ہے۔اس لیے آج صرف اتنا اورعرض کیے دیتا ہوں کہ اپنی فکری راست سمتی کا یقین ہی تھا کہ اقبال نے حضورِ اکرم ﷺ

سے اپنی عرض داشت میں یہ کہا کہ اگر میری فکر، اسلامی نظامِ فکر اور آپ ﷺ کی تعلیمات سے متصادم ہو تو آپ ﷺ حشر کے دن مجھے خوار و رسوا فرمادیجے!

مثنوی رموزِ بیخودی (اشاعت :اپریل ۱۹۱۸ء) میں بڑے پرسوز انداز میں حضورِ اکرم کی خدمتِ اقدس میں عرض کرتے ہیں:

گر دلم آئینہء بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور
چشم تو بینندہء ما فی الصدور
پردہء ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشت نا بسامانم مکن
بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہء پا کن مرا

''یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کرتے ہیں کہ اگر میری فکر کا آئینۂ جوہر (سچائی) سے خالی ہے اور میری شاعری میں قرآنِ کریم کی تعلیمات کے علاوہ کوئی تعلیم یا پیغام چھپا ہوا ہے، تو اے وہ ہستی! جس کے باعث تمام دنیا کے گوشے صبح کے مانند ضوریز ہیں اور آپ ﷺ کی نگاہ مبارک دلوں کے بھیدوں تک رسا ہے۔ آپ ﷺ!میری فکر کی آبرو کا پردہ

چاک فرما کر اس جہان کو میرے وجود کے کانٹے سے پاک فرما دیجیے! میرے جسم پر زندگی کا لباس تنگ فرما دیجیے! اور میری ملت کے لوگوں کو میرے شر سے محفوظ فرما دیجیے! میری کھیتی کو سرسبز نہ ہونے دیجیے!...... مجھے ابرِ نیساں کی بہار سامانی سے بے بہرہ رکھیے! میری شراب کو انگور ہی میں خشک فرما دیجیے!......اور میری کافوری شراب میں زہر ملا دیجیے! یعنی میرے اظہار میں آنے والے ہر خیال کو مٹا دیجیے! قیامت کے دن مجھے خوار و رسوا کیجیے اور اپنے پائے مبارک کے بوسے کی سعادت سے مجھے محروم فرما دیجیے!''

یہ ہے حضورِ اکرم ﷺ کی ذات سے سچا عشق کرنے والے اقبال کی فکری سر گزشت ، جس میں ان کی ابتدائی فکری کجی سے انحراف کی تصویر کشی بھی ہے۔ راست فکری سمت کی طرف پیش قدمی کے مظاہر بھی ہیں اور پھر اس راستیء فکر پر ان کے اعتماد کی اظہاری نمود بھی!

....

[مطبوعہ: جسارت کراچی، سنڈے میگزین، بابت 11 - 17 نومبر 2012 ء،
ترمیم وتصحیح کے ساتھ]

کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر

اللہ کی وحدانیت کا اعلان کرنے والے انسانی معاشرے میں اللہ کے قانون کے عملی نفاذ کا نمونہ دکھانے والے نفوسِ قدسیہ صرف انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں۔حضور اکرم ﷺ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر اللہ کا دین مکمل ہوگیا ہے اس لیے رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے کیوں کہ انسانی معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی عمل کی تمام حدود نبیء آخر الزمان حضرت محمد ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعے متعین فرمادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی فکری تحریروں اور تخلیقی نقوش میں توحید و رسالت پر ایمان ہی کو ملت اسلامیہ کی اساس قرار دیا ہے۔

اقبال کا عرفان رسالت شش ابعادی ہے:

(الف) منصب رسالت کی ایمانی سطح پر قبولیت

(ب) ذات رسالت مآب ﷺ سے عشق کی سطح کا تعلق

(ج) جذبہء خود سپردگی کے لحاظ سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے قلبی تعلق کا شعری اظہار

(د) پیغام رسالت کو عام کرنے کا جذبہ

(ہ) بھٹکے ہوئے (مسلمان) راہی کو سوئے حرم لیجانے کی آرزو کا مسلسل اظہار اور انتھک قلمی کاوش ......اور

(و) مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی سعی کہ اللہ کے بعد صرف اور صرف حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہی کائنات کی ''مرکزی مطاع ذات'' ہے۔ان ﷺ سے قبل [کیوں کہ سابق انبیائے کرام کا عہدِ نبوت گزر چکا ہے]اور نہ ان ﷺ کے بعد کوئی ایسی ہستی ہے جس کو ''مطاع'' [لائقِ اطاعت] تسلیم کرکے اس کی محبت اختیار کی جائے یا اس کی اتباع کی جائے۔ نبی علیہ السلام کے بعد آپ کی امت میں جو بھی تقویٰ اختیار کرے اور آپ ﷺ کی اتباع کرے وہ لائقِ تعظیم وتکریم ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است(۱)

(ترجمہ:حضورِ اکرم ﷺ کی ذات تک خود کو پہنچادو [تاکہ مسلمان بن سکو......کیوں کہ]اگر تم ان تک نہیں پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ باقی دنیا میں تو صرف کفر ہی ہے)

اقبال فرماتے ہیں:

می توانی منکر یزداں شدن
منکر از شان نبیؐ نتواں شدن(۲)

''تو(اے مخاطب) کسی نہ کسی طرح خدا کا تو منکر ہوسکتا ہے لیکن رسالت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کا منکر نہیں ہوسکتا''۔

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل نے Constance E. Padwick کی کتاب Muslim Devotions سے ایک اقتباس دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی مفکرین بھی جانتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی محبت ہی میں امتِ مسلمہ کی قوت کا راز پنہاں ہے:

''جس کسی کو مسلمانوں کی حُبِّ رسولؐ کی خبر نہ ہو، وہ اسلام کی قوت کا احساس کرہی نہیں سکتا......یہ جذبۂ حُب ایسا شدید ہے کہ اسے تصوف کی گرمیٔ نفس کے مماثل کہہ سکتے ہیں۔ذاتِ رسولؐ سے محبت

مسلمانوں کی وحدت اور اتحاد کا ایک بڑا موجب ہے''۔(۳)

حضور اکرم ﷺ کی ذات والا صفات سے اقبال کا عشق جدید و قدیم فکری زاویوں سے روشناس لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور مبنی بر اخلاص بھی۔شدتِ حُبِّ رسول ﷺ کا اظہار ان کے متعدد اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔مثلاً

تب و تابِ بتکدہء عجم نرسد بسوز وگدازِ من
کہ بیک نگاہِ محمدِ عربیؐ گرفت حجازِ من (۴)

''غیر عرب دنیا کی چمک دمک میرے قلبی سوزوگداز تک نہیں پہنچتی کیوں کہ میرے حجاز یعنی دل کو میرے آقا جنابِ محمد رسول اللہ (ﷺ) نے ایک ہی نگاہ میں اپنا کرلیا ہے۔ (اب مجھے آپ ﷺ کی تعلیمات کے سوا سب ہیچ نظر آتا ہے)۔

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسولؐ اللہ! او پنہاں وتو پیدائے من (۵)

''یا رسولؐ اللہ! میں تو اللہ سے بھی آپ ﷺ کے توسط سے بات کرتا ہوں اس لیے کہ وہ میری آنکھ سے پوشیدہ ہے اور آپ ﷺ میرے سامنے ظاہر ہیں''۔

غالباً اسی شعر کی وضاحت ان کے ایک مکتوب میں ملتی ہے جو انہوں نے خان نیاز الدین خان کو لکھا تھا:

''میرا عقیدہ ہے کہ نبیء کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہوسکتے ہیں جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے۔لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔اس واسطے خاموش رہتا ہوں''۔(۶)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کے وجود کا انکار ممکن ہے لیکن رسول ﷺ کی ذات کا انکار ممکن نہیں ہے۔

اقبال پوری قوم کو حب رسول ﷺ اور اتباع رسول کی دعوت دیتے ہیں۔اقبال

کے شعری سرمائے میں جہاں جہاں حضور نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ذکر مبارک آیا ہے اس میں عمومیت سے زیادہ محرکات عشق کا اختصاصی پہلو جھلکتا ہے۔ اقبال کی فکری دنیا میں جتنے نکات منصبِ رسالت کی تفہیم کے ضمن میں منصۂ شہود پر آئے وہ شاید ہی کسی اور شاعر یا مسلمان مفکر کی تحریروں میں آئے ہوں۔مثلاً اپنی کتاب جاوید نامہ میں وہ حضرت شیخ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ سے رسالت کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور پھر ان کے جوابات مثنوی کے اشعار میں موتیوں کی طرح پروتے ہیں:

گفت اقوام و ملل آیات اوست
عصر ہائے ماز مخلوقات اوست
از دم او ناطق آمد سنگ و خشت
ما ہمہ مانند حاصل او چو کشت
پاک سازد استخوان و ریشہ را
بالِ جبریلے دہد اندیشہ را
آفتابش را زوالے نیست نیست
منکرِ او را کمالے نیست نیست(۷)

''[ترجمہ](میں نے رومی سے درخواست کی کہ مجھے پیغمبری کے بارے میں آگاہ فرمایئے) تو انھوں نے فرمایا !قومیں اور ملتیں پیغمبری کی ہی نشانیاں ہیں۔یعنی پیغمبر اپنی تعلیمات کے ذریعے ایک پیغام رساں قوم تیار کرتا ہے۔ ہمارے زمانے بھی پیغمبر کے دیئے ہوئے پیغام کی پیداوار ہیں[کیوں کہ] پیغمبر،زمانے کو اپنی تعلیمات کے مطابق ڈھالتا ہے۔پیغمبر کے دم سے اینٹ،پتھر بھی گویائی حاصل کرلیتے ہیں۔پیغمبر کی حیثیت کھیت کی سی ہے اور ہم سب اس کا حاصل ہیں۔ پیغمبر،ہڈیوں اور ریشوں کو پاک کرکے ،فکرِانسانی کو شہپرِ جبریل کی قوت عطا کردیتاہے۔اس(پیغمبر) کی تعلیمات کے سورج کو زوال نہیں، [ہرگز] نہیں ہے۔ اس کی تعلیمات سے منہ موڑنے والے کو کبھی کمال حاصل نہیں ہوسکتا، ہرگز نہیں ہوسکتا''۔

پیامِ مشرق میں بھی اقبال نے حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کے فیضان سے آشنا کرنے کے لیے واشگاف الفاظ میں کہا:

امتے بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او
واقف از سِرِّ نہاں خانہء تقدیر شدیم(۸)

''[ہم مسلمان ایک امت تھے جو] حضورِ اکرم ﷺ کی حکمت آمیز تعلیمات کے نتیجے میں رازِ تقدیر سے آشنا ہوکر عمل کی وادیوں کو سر کرنے لگے تھے''۔

مقامِ رسالت،عظمتِ رسول ﷺ اور حُبِّ رسول ﷺ کے تقاضوں سے آشنا ہوکر ہی اقبال نے اپنی شاعری میں ''رسالت'' کے حوالے سے بڑے فکر انگیز نکات پیش کیے ہیں۔ مثلاً رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی معراج کا پیغام اور معراج کا منشاء جتنے بھرپور انداز میں اقبال کے درج ذیل شعر میں جلوہ آراہوا ہے وہ اسلامی ادب میں نایاب چیز ہے:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ ؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں (۹)

یا مقام رسالت مآب کے اظہار کی یہ کوشش:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیء سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں ، وہی فرقاں، وہی یٰسں وہی طٰہٰ (۱۰)

اقبال زندگی بھر بھٹکے ہوئے راہی کو سوئے حرم لیجانے کی آرزو کرتے رہے۔ درج ذیل قطعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے:

بمنزل کوش مانند مہ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر

بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو(۱۱)

''اے مسلمان تو منزل کی طرف اسی طرح بڑھتا رہ جس طرح نیا چاند اپنی تکمیل کے منازل بلا رکاوٹ طے کرتا رہتا ہے۔ تو بھی چاند کی طرح اس نیلی فضا میں ہر لحہ بڑھتا رہ۔اگر تو اس زمانے میں اپنا کوئی مقام چاہتا ہے تو اپنے دل کا تعلق حق سے جوڑ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے راستے پر چل پڑ''۔

مسلمانوں کو نبیء کریمﷺ کی اتباع کی ترغیب دیتے ہیں تو زور پیدا کرنے کے لیے انہیں تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ اگر یہ راہ اختیار کرنا تمہارے بس میں نہیں تو دین کے راستے سے ہٹ جاؤ اور کافر ہو کر مرجاؤ!

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نومید و راہِ مصطفیٰؐ گیر
اگر باور نہ داری آنچہ گفتم
زدیں بگریز و مرگِ کافرے میر(۱۲)

''[ترجمہ] میں نے تقدیر کے چہرے سے پردہ اٹھا دیا ہے(تقدیر عمل میں پوشیدہ ہے......اے مسلمان! تو زوال و ادبار کے تسلسل سے) مایوس نہ ہو، بس حضور اکرمﷺ کے راستے اور ان کی لائی ہوئی شریعت پر چلنا شروع کردے۔لیکن اگر تجھے میری بات (پُرخلوص نصیحت) پر یقین نہیں ہے، تو دین کی راہ سے ہٹ جا اور کافر کی موت مر''۔

ایک اور مقام پر حضور رسالت مآبﷺ کی محبت کے عملی تقاضوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدۂ آمد و لیکن
جہانِ عشق را پروردگار است(۱۳)

''حضور اکرمﷺ کی نگاہِ کرم ہوجائے (تیری محبت انﷺ کے دربار میں قبول ہوجائے) تو تیری محبت پائدار (تسلیم کی جا سکتی) ہے۔ انﷺ سے عشق کرنے کا معیار یہ ہے کہ انہیﷺ کا راستہ عملی زندگی میں اپنایا جائے۔ ان کا مقام ''عبدہٗ'' (اس [اللہ] کا بندہ) بتایا گیا ہے لیکن وہ بندہ عشق کے جہان کا پروردگار ہے۔ جہانِ عشق آپﷺ ہی کی وجہ سے زندہ ہے''۔

اقبال نے بحیثیت ''زندہ رودؔ'' حسین بن منصور حلاج سے سوال کیا:

از تو پرسم، گرچہ پرسیدن خطاست
سِرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰ ست !
آدمے یا جوہرے اندر وجود
آں کہ آید گاہے گاہے در وجود؟(۱۴)

(اے حلاج!) میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں' اگرچہ یہ بھی خطا ہے......کہ وہ جوہر جس کا نام مصطفیٰﷺ ہے، آخر اس کا بھید کیا ہے؟؟؟......کیا وہ آدم ہے یا اپنے وجود کے اندر کوئی جوہر۔جوہر بھی ایسا جو کبھی کبھی وجود میں آتا ہے[جو صرف ان کی ذات میں آشکار ہوا؟]''۔

اس سوال کے جواب میں حضور نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان کا اظہار حُسین بن منصور حلاج کی زبان میں اس طرح ہوا:

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدۂ فرمودہ است
عبدۂ از فہمِ تو بالا تر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدۂ صورت گرِ تقدیر ہا

اندرو ویرانہ ہا تعمیرہا
عبدۂ ہم جانفزا ہم جانستاں
عبدۂ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر، عبدۂ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدۂ دہر است و دہر از عبدۂ ست
ما ہمہ رنگیم، او بے رنگ و بوست
عبدۂ با ابتدا بے انتہا ست
عبدۂ را صبح و شامِ ما کجاست
کس ز سرِّ عبدۂ آگاہ نیست
عبدۂ جز سر الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دم او عبدۂ
فاش تر خواہی بگو ھو عبدۂ
عبدۂ چند و چگونِ کائنات
عبدۂ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ ما رمیت (۱۵)

''[ترجمہ]محمد مصطفیٰ ﷺ کے سامنے کائنات بھی پیشانی ٹیکے ہوئے ہے۔آپ ﷺ نے خود اپنا تعارف 'عبدۂ' کہکر کرایا ہے۔عبد ۂ تیری سمجھ سے بالا ترہے۔کیونکہ وہ آدم بھی ہے اور جوہر بھی۔اس کا جوہر (مقامی نہیں ہے) نہ عرب سے ہے نہ عجم سے۔وہ آدم ہونے کے باوجود آدم سے مقدم وجود رکھتا ہے۔عبدۂ تقدیروں کا صورت گر ہے(جو ان ﷺ کا ہوگیا اس کی تقدیر سنور گئی ورنہ تقدیر بگڑ جاتی ہے)۔اسی عبدۂ کے اندر انسانی تقدیر کے ویرانے اور

آبادیاں پوشیدہ ہیں۔عبدۂ روح کو خوشی دینے والا(مومنوں کو جنت کی خوشخبری) بھی ہے اور روح کو چھین لینے والا بھی ہے (کافروں کوعذاب کی وعیدسناکر)۔عبد اور چیز ہے اور 'عبدۂ' اور چیز ہے۔ہم مجسم انتظار ہیں وہ منتظر (جس کا انتظار ہے)۔عبدۂ زمانہ ہے اور زمانہ 'عبدۂ' ہے۔ہم سب رنگ ہیں وہ رنگ اور خوشبو کا محتاج نہیں ہے۔عبدۂ کی ابتداء تو اس کی تخلیق کے عمل سے ہوگئی لیکن اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔عبدۂ کا زمانہ ہمارے زمانے کی طرح روزوشب کے مرور سے وجود میں نہیں آتا۔کوئی بھی مخلوق 'عبدۂ' کے راز سے آگاہ نہیں ہے۔عبدۂ دراصل کلمہء طیب'لا الٰہ الا اللہ' کا ایک بھید ہے اور کچھ نہیں۔غیراللہ کی نفی کا کلمہ ایک تلوار ہے جس کی دھار'عبدۂ' ہے۔اگر تو زیادہ کھل کر بات سننا چاہتا ہے تو سن 'ھوٗ' (وہی عبدۂ) ہے۔(عبد اپنی نفلوں کی کثرت سے اللہ کی صفات کا حامل بن جاتا ہے۔یہ ہر بندۂ مومن کے ساتھ ہوسکتا ہے۔بندۂ مومن بننے کے لیے آقائے نامدار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع ضروری ہے، اسی بات سے عبدۂ کا مقام 'ھوٗ ہوگا')۔عبدۂ کائنات کی حقیقت ہے۔عبدۂ کائنات کے اندر کا راز ہے۔(اے مخاطب!) پہلے دو اشعار کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا اگر عبدۂ کو قرآن کی آیت 'وَمَا رَمَیْتَ اِذْرَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی' (تم نے مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی جب پھینکی تھی، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی ......۸:۱۷) کی روشنی میں نہ دیکھا جائے''۔

جوہر کی وضاحت کرتے ہوئے معروف مستشرق این میری شمل نے بڑی خوبصورت اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے:

''یہ جو حضرت محمد ؐ کو'انسان اور جوہر' کا امتزاج کہا گیا، یہ ابنِ عربی اور الجیلی کی تقلید میں ہے۔جنھوں نے انسان کامل کا نظریہ پیش کیا اور ایسے انسان کو[کی]دنیوی اور خدائی صفات بتائی ہیں ۔اب عبدۂ کی حقیقت پر زور دینے کا مسئلہ۔قدیم صوفیاء کی روایات کے بموجب' مثلاً دیکھیں رسالہ قنبریہ[قشیریہ؟] اور پنجابی شاعر بلھے شاہ

کے اشعارٗ عبدہٗ کے کلمات حضرت محمدؐ کی عظیم شان کے مظہر ہیں کیوں کہ واقعہء معراج کے بیان میں بھی (۱:۱۷) قرآنِ مجید نے پیغمبرؐ کوعبدہٗ (اس کا خاص بندہ) کہاہے۔ واقعہء اسرا ء میں اور معراج میں چونکہ آں حضرتؐ نے حقائق و معارف کو بے نقاب دیکھا تھا۔ لہٰذا عبدہٗ بے حد بلند روحانی مقام تھا جو انھیں نصیب ہوا......

مردِ مومن در نسا زد با صفات
مصطفیٰؐ راضی نشد الاّ بذات
تاز مازاغ البصر، گیرد نصیب
بر مقامِ عبدہٗ گردد رقیب'' (۱۶)

''مردِ مومن صفات کے مشاہدے پر قناعت نہیں کرتا۔ کیوں کہ رہبرِ اعظم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بھی ذات کے دیدار کے علاوہ کسی نعمت کو نہیں چاہا تھا'' (۱۷)

''یہاں تک کہ حضورِ اکرم ﷺ نے وہ مقام حاصل کرلیا جسے اللہ نے 'ما زاغ البصر و ماطغیٰ' (نہ تو آپ ﷺ کی نگاہ میں کجی پیدا ہوئی اور نہ حد سے بڑھی) کہا ہے اور پھر مقامِ عبدہ' بھی حاصل کرلیا۔ [بندہء مومن آپ ﷺ کی پیروی میں کامل ہوکر ذاتِ واجب الوجود کے دیدار کی منزل تک پہنچ سکتا ہے]'' ۔(۱۸)

جمالِ ذات کا عاشق ہی جملہ کائنات کا سردار ہوسکتا ہے۔ اس لیے صرف حضورِ اکرم ﷺ ہی کی ذاتِ گرامی تمام عالمین کی سردار ہے۔ یہ بات اشارۃً حضرت جلال الدین رومیؒ نے کہی تھی اور اقبال نے ان کا ایک شعر جاوید نامہ میں نقل کیا ہے:

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سید جملہ موجودات را

(جو کوئی [اللہ تعالیٰ] کی ذات کے حسن کا طالب ہوا۔ وہ ساری کائنات کا سردار ٹھہرا۔ (۱۹)

حضور ﷺ ہی وجہ تخلیق کائنات ہیں اور آپ ﷺ ہی کی ذات میں وہ جوہر ہے

جس کی تلاش وجستجو میں بنی نوع آدم سرگرداں ہے۔ جس نے اس نور (نور مصطفیٰ ﷺ) کے ذریعے اپنی شناخت کرلی اس کی قیمت اسی کے باعث متعین ہوچکی ہے ورنہ اسی نور کی تلاش میں انسان گھومتا پھر رہا ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یازِ نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است (۲۰)

''[ترجمہ] جہاں جہاں بھی رنگ و خوشبو کی دنیا تمہیں نظر آرہی ہے، ہر وہ دنیا جس کی خاک سے آرزوئیں جنم لیتی ہیں (جس میں کمال حاصل کرنے کی تڑپ موجود ہے) یا تو اس کی قیمت نور محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وجہ سے ہے یا وہ دنیا نورِ محمدی ﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے''۔

ہر کجا ہنگامہء عالم بود
رحمۃٌ للعالمینی ہم بود (۲۱)

''[ترجمہ] جہاں جہاں بھی دنیا کی رونقیں ہیں وہاں وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفت رحمۃٌ للعالمینی موجود ہے''۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃٌ للعالمینی انتہا ست (۲۲)

''[ترجمہ] مخلوق، تقدیر اور ہدایت مرحلہء تخلیق میں پہلے ہیں۔ رحمۃٌ للعالمینی اس تخلیق کے مرحلے کی انتہا ہے''۔

مقام رسالت کے اظہار کے مختلف پیرائے علامہ کی ہر تحریر میں ملتے ہیں۔ مثنوی اسرارخودی میں بڑے مربوط انداز میں لکھتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است

آبروئے ماز نامِ مصطفیؐ است
طورِ موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسبِ افزائش از ذاتش ابد
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
درشبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم
تابہ تخت خسروی خوابیدہ قوم
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ اَمِ گیتی نزاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
روزِ محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او
لطف و قہرِ او سر اپا رحمتے
آں بیاراں ایں باعدا رحمتے
آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد

مکہ را پیغام ’ لا تثریب‘ داد
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم
در جہاں مثلِ مے و میناستیم
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت
چوں گلِ صد برگ مارا بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست
سرِّ مکنونِ دلِ او ما بدیم
نعرہ بے باکانہ زد، افشا شدیم
شورِ عشقش در نئے خاموشِ من
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
من چہ گویم از تولّاَیش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست
نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست(۲۳)

’’[ترجمہ]حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے۔ہم مسلمانوں کی عزت و آبرو بھی آپ ﷺ ہی کے نام سے قائم ہے۔آپ کے گھر کے غبار کی لہر ’طور سینا‘ ہے۔آپ ﷺ کا حجرہ مبارک ، بیت اللہ کے لیے بھی کعبہ کا درجہ رکھتا ہے۔ابد آپ کے اوقات کے مقابلے میں ایک لمحے سے بھی کم وقفہ ہے۔دراصل آپ ہی کی ذات سے ابد نے بھی ابدیت حاصل کی ہے۔آپ بوریئے پر آرام فرماتے تھے اس لیے بوریا بھی آپ کے احسان کا ممنون ہے۔آپ کی امت کے پاؤں کے نیچے کسریٰ کا تاج آیا۔آپ ﷺ نے غار حرا میں تنہائی کی راتیں گزاریں۔آپ ﷺ نے ایک نئی قوم، ایک نیا آئین اور ایک نئی حکومت عطا فرمائی۔

آپ ﷺ نے بہت سی راتیں بغیر نیند گزاریں تاکہ آپ ﷺ کی امت تخت خسروی پر آرام کرے۔ دنیا میں آپ ﷺ نے نئے دستور کا آغاز فرمایا۔ سابقہ قوموں کی مسند اقتدار کو آپ ﷺ نے لپیٹ دیا۔ آپ ﷺ نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔آپ جیسا سپوت مادرِ گیتی نے بھی نہ جنا۔ (حضرت حسان بن ثابتؓ نے فرمایا تھا **و اجمل منک لم تلدالنساء**' اورآپ سے زیادہ خوبصورت کسی ماں نے نہیں جنا)۔آپ ﷺ کی نگاہ میں بلند اور پست سب انسان برابر ہیں۔آپؐ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔حشر کے دن ہم مسلمانوں کا بھروسہ (شفاعت کے لیے) آپ ﷺ ہی کی ذات پر ہوگا۔ دنیا میں بھی آپ ﷺ ہی ہماری کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔آپ ﷺ کا لطف اور قہر، دونوں سراپا رحمت ہیں۔ لطف دوستوں کے لیے اور قہر دشمنوں کے لیے رحمت ہے۔آپ ﷺ وہ ہیں جنہوں نے دشمنوں پر رحمت کے دروازے کھول دیئے۔ فتح مکہ کے وقت اپنے جانی دشمنوں سے فرمایا 'آج تم پر کوئی گرفت نہیں' (جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں اپنے بھائیوں کو معاف فرمایا تھا)۔ ہم بطحا کے ساقی کی آنکھوں سے پی کر مست ہیں۔ہم دنیا میں شراب اور صراحی کی طرح ہیں۔آپ ﷺ نے نسل و نسب کے فرق کو یکسر بھسم کردیا۔دنیا کے باغ کو اس کوڑے کرکٹ سے پاک فرمادیا۔سو پتیوں کے پھول کی طرح ہماری خوشبو ایک ہی ہے۔(کیونکہ) آپ ﷺ اس نظام کی روح ہیں اور آپ ﷺ ایک ہیں۔ہم آپ ﷺ کے قلب میں چھپے ہوئے بھید کی طرح تھے۔جب آپ نے بے باکانہ نعرۂ توحید بلند فرمایا تو ہم ظاہر ہوگئے۔میری خاموش بنسری میں آپ ﷺ کے عشق کا شور ہے۔میرے سینے میں سینکڑوں نغمے تڑپ رہے ہیں۔ میں آپ ﷺ کی محبت کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ کیا ہے۔ آپ ﷺ کی جدائی کے خیال سے تو سوکھا ہوا تنا (حنانہ) بھی رونے لگا تھا۔(المختصر) ساری کائنات کتاب ہے تو اس کا دیباچہ (مغز، جوہر) آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔تمام عوالم غلام ہیں اور آپ ﷺ ہی آقا ہیں''۔

علامہ اقبال نے ''مثنوی رموزِ بیخودی'' میں یہ بتایا ہے کہ '' ملت کے پیکر میں

رسالت ہی کی وجہ سے روح پھونکی گئی ہے''، وہ فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما
آں کہ شان اوست یہدی من یرید
از رسالت حلقہ گردِ ما کشید
ما ز حکم نسبت او ملتیم
اہل عالم را پیام رحمتیم
زندگی، قوم از دم او یافت است
ایں سحر از آفتابش تافت است
فرد از حق ملت از وی زندہ است
از شعاع مہر او تابندہ است (۲۴)

''[ترجمہ] اللہ تعالیٰ نے ہمارا (ملی) پیکر تیار فرما کر اس میں ''رسالتِ محمد ﷺ'' کی وجہ سے روح پھونکی۔رسالت ہی کی وجہ سے بحیثیت ملت ہماری پیدائش ہوئی اور رسالت ہی کے طفیل ہمیں دین اور دستورحیات میسر آیا۔ وہ (اللہ تعالیٰ) جس کی شان یہ ہے کہ جسے چاہے ہدایت دے، اسی نے ہمارے گرد رسالت کا حلقہ کھینچ دیا۔ہم اس رسالت ہی کی نسبت سے ایک ملت ہوکر عالم انسانی کے لیے باعث رحمت ہیں۔اس قوم کے ہر فرد نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی بدولت زندگی پائی ہے اور اس کی صبح کی روشنی آفتابِ رسالت ہی کی عطا کردہ ہے''۔

حرف بے صوت اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرعے موزوں شدیم
از رسالت صد ہزار ما یک است

جزو ما از جزو مالا ینفک است
از میانِ بحر او خیزیم ما
مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
وحدتِ مسلم، ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحر بے پایانِ اوست
ما کہ یکجا نیم از احسانِ اوست
تا نہ ایں وحدت ز دست ما رود
ہستی ما با ابد ہمدم شود(۲۵)

''[ترجمہ] ہم لوگ دامن رسالت میں پناہ لینے سے قبل اس طرح تھے جیسے بے آواز حرف۔ پھر رسالت (ﷺ) کے فیض سے ہم اس طرح آہنگ اور معانی والے بن گئے جیسے بیت کا مصرعہء دلکش ہو۔ ہم مسلمان عددی اعتبار سے لاکھوں ہونے کے باوجود محض رسالت(ﷺ) کی بدولت وحدت ملّی میں ضم ہوکر اس طرح ایک ہوگئے کہ ہمارا چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی پوری ملت اسلامیہ کا حصہ بن گیا۔ ہم مسلمان، رسالت کے سمندر کے درمیان سے موجوں کی طرح اٹھتے ہیں اور بحری موجوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، ایک ہی رہتے ہیں۔ ہم (مسلمان) رسالت کے طفیل ہی ایک آواز ہوگئے۔ ایک

دوسرے کے ساتھی بنے اور ہمارے مقاصد میں ہم رنگی پیدا ہوگئی۔ مقصد کی یک رنگی سے افراد کی کثرت، وحدت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور جب یہ وحدت پختگی حاصل کرلیتی ہے تو ''ملت'' وجود میں آجاتی ہے۔ ہر کثرت خود کو زنجیر میں پابند کرلینے سے، وحدت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ مسلمان کی وحدت دین فطرت (اسلام) کی بدولت قائم ہے۔ ہم (مسلمانوں) نے دین فطرت(اسلام) اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہی سیکھا ہے۔ اس طرح ہم نے حق کی راہ میں مشعل روشن کی ہے۔ (ملت مسلمہ کے وجود اور اس کی وحدت کا) یہ موتی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی کے بحر بے کراں سے نکلا ہے۔ ہماری (ذہنی، فکری، عملی اور روحانی) یکجائی بھی انہی ﷺ کے احسان عظیم کی مرہون منت ہے۔ جب تک (فکر و خیال و عمل کی) یہ وحدت ہمارے ہاتھ سے نہیں جاتی، ہماری ملت کی زندگی، ابدالآباد تک باقی رہے گی''۔

مثنوی رموزِ بیخودی ہی میں اقبال نے یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے کہ ملت افراد کے باہم ملاپ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی پرورش کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے:

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند
ذرہء بے مایہ ضو گیرد ازو
ہر متاعے ارج می گیرد ازو
دیدہء او می کشد لب جاں دہد
تا دوئی میرد یکے پیدا شود
رشتہ اش کو بر فلک دارد سرے
پارہ ہائے زندگی را ہم گرے
تازہ اندازِ نظر پیدا کند
گلستاں در دشت و در پیدا کند

از تف او ملتے مثل سپند
بر جہد شور ا فگن و ہنگامہ بند
یک شرر می افگند اندر دلش
شعلہء در گیر میگردد گلش (۲۶)

مثنوی کے اس حصے میں پہلے تو اقبال، آدم کی سرگزشت بیان فرماتے ہیں کہ اس نے اپنی عقل خام کے ساتھ کیسے کیسے دن دیکھے تھے اور انسانوں کے باہمی میل جول کی کیا کیفیت تھی ، ہم اس سے آگاہ نہیں ہیں۔اس کے بعد فرماتے ہیں:

''[ترجمہ]یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی پیدا کردیا جس نے ایک حرف کے ذریعے ایک کتب خانہ لکھوادیا یعنی ایک مکمل نظام زندگی عطا کردیا۔اس (نبی) کی وساطت سے ایک حقیر ذرہ بھی روشنی حاصل کرلیتا ہے۔ انسان کی ہر متاع (پونجی) ایک نئی قیمت پالیتی ہے۔ ہر جنس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ نبی کی آنکھ(باطل کو) مارڈالتی ہے اور اس کے لبوں سے (حق اس طرح جاری ہوتا ہے کہ) بے روح جسموں میں جان پڑجاتی ہے۔ (یہ اس لیے ہوتا ہے کہ) اس نبی کا تعلق آسمان سے (بذریعہء وحی) استوار ہوتا ہے۔ (جس کی بدولت وہ) زندگی کے ٹکڑوں (افراد) کو جوڑ دیتا ہے۔ وہ (نبی) انسانوں میں ایک نیا زاویہء نظر پیدا کردیتا ہے اور (اس طرح زندگی کے بے آب و گیاہ) صحراؤں میں باغ لگا دیتا ہے۔ اس کی عطا کردہ (مقاصد کی) گرمی سے قوم حرمل کے دانے کی طرح اچھلنے کودنے اور ہنگامہ برپا کرنے لگتی ہے[اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ راہ حق میں ہر باطل سے گرم ستیز ہوجانے کے لیے تڑپ اٹھتی ہے]۔ وہ(نبی) قوم کے دل میں ایک چنگاری ڈال کر ولولہ پیدا

کردیتا ہے۔جس کی بدولت ملت کے وجود میں ایک شعلہ پیدا ہوجاتا ہے''۔

یہ ہے وہ تصورِ رسالت جس کے طفیل ملتِ اسلامیہ ایک ملتِ واحدہ کے طور پر ابھری تھی۔ اللہ نے تو مسلمانوں کو''توحید'' پر ایمان کے بعد صرف اور صرف''رسالت'' پر ایمان لانے کا حکم دیا تھا اور حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ اقدس پر نبوت کے خاتمے کا اعلان فرماکر اس بات کا امکان ہی ختم فرمادیا تھا کہ حضورِ اکرمﷺ کے بعد کوئی فرد یا گروہ اس بات کا دعویٰ کرے کہ تکمیلِ دینِ اسلام کے بعد بھی اس کی ذات اسی طرح واجب التعظیم اور واجب الاتباع ہے جیسے حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ گرامی! یہی وجہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی اکثریت نے کبھی بھی حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ والا کے بعد کسی بھی بزرگ کو صرف اور صرف اتباعِ رسولﷺ کی بنیاد پر بزرگ جانا۔ نہ تو انہیں بذاتہٖ واجب الاتباع جانا اور نہ معصوم عن الخطاء قرار دیا۔ ہاں حضورِ اکرمﷺ کے تمام مومن اقرباء اور صحابہ کرام و ازواجِ مطہرات ، سب کے سب محفوظ عن الخطاء تسلیم کیے گئے۔

اقبال نے یہ نکتہ اپنے ایک خطبے میں واضح کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں :

''اسلام کی آفرینش' عقلِ استقرائی کی آفرینش ہے۔اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچی ہے کیوں کہ اس نے اپنے ہی خاتمے کی ضرورت کو محسوس کرلیا ہے۔ اس میں یہ ادراک گہرے طور پر موجود ہے کہ زندگی کو ہمیشہ بیساکھیوں کے سہارے نہیں رکھا جاسکتا اور یہ کہ ایک مکمل خود شعوری حاصل کرنے کے لیے انسان کو بالآخر اس کے اپنے وسائل کی طرف موڑ دینا چاہیے۔اسلام میں پاپائیت اور موروثیت کا خاتمہ، قرآن میں استدلال اور عقل پر مسلسل اصرار اور اس کا بار بار فطرت اور تاریخ کے مطالعے کو انسانی علم کا ذریعہ قرار دینا ، ان سب کا تصور ختمِ نبوت کے مختلف پہلوؤں سے گہرا تعلق ہے......انسانی فکر کی

تاریخ میں اب ہر قسم کا شخصی تحکم جو کسی مافوق الفطرت سرچشمے کا دعویٰ
کرتا ہے ختم ہو چکا ہے۔(۲۷)

پاپائیت اور موروثیت کے خاتمے کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضورِ اکرمﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم نے اپنے بعد اپنی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ بنانے کا اعلان نہیں کیا۔حضرتِ حسنﷺ کو حضرت علیﷺ کے بعد بحا لتِ مجبوری خلافت کا عہدہ سنبھالنے کی ضرورت پیش آئی لیکن بعد میں انہوں نے بھی شاید ملوکیت کے آغاز کا خطرہ' بھانپ کر خود کو خلافت کی ذمہ داریوں سے علاحدہ کرلیا!!!

"انسانی فکر کی تاریخ میں اب ہر قسم کا شخصی تحکم جو کسی مافوق الفطرت سرچشمے کا دعویٰ کرتا ہے ختم ہو چکا ہے"۔

علامہ اقبال کی اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں جاننا ہوگا کہ اقبال دینِ اسلام کے اس version کو تسلیم کرتے ہیں جس میں عربیت غالب ہو۔عجمی نظریات کے ضمن میں اقبال کے بے شمار تحفظات ہیں۔اسی لیے وہ برملا کہتے ہیں :

تب و تابِ بتکدۂ عجم نرسد بسوز و گدازِ من
کہ بیک نگاہِ محمدؐ عربی گرفت حجازِ من(۲۸)

(ترجمہ: غیر عرب بتکدہ کی چمک دمک میرے سوز و گداز کو نہیں پہنچتی......یعنی غیر عربی یا غیر اسلامی تصورات و نظریات میری طبیعت کو راس نہیں ہیں۔[کیوں کہ] میرے دل پر حضورِ اکرمﷺ کی نگاہِ لطف و کرم کا اثر بہت گہرا ہو چکا ہے۔گویا آپ کی تعلیمات کے ارتکاز کی وجہ سے میرا دل ہی حجاز بن گیا ہے)۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اقبال کے درجِ بالا شعر کی بہت اچھی تشریح کی ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ من وعن یہاں نقل کردی جائے:

"تب و تاب بتکدۂ عجم کنایہ ہے غیر اسلامی تصورات سے۔محمد عربیﷺ کنایہ ہے اسلامی تعلیمات سے۔اور حجازِ من کنایہ ہے قلبِ

عاشق سے۔کہتے ہیں کہ سرکارِ مدینہﷺ کی پاکیزہ تعلیمات نے آنِ واحد میں میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کرلیا ہے کہ اب عجمی تصورات (غیر اسلامی خیالات) میری نگاہ میں بالکل بے قیمت ہو کر رہ گئے ہیں یعنی عاشقِ رسولﷺ غیر اسلامی خیالات سے متاثر نہیں ہوسکتا"۔(۲۹)

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے عام مسلمان کو حضورِ اکرمﷺ کے لائے ہوئے دین کی حدود ہی میں رہنے کا مشورہ دیا :

شکوہ سنجِ سختیء آئیں مشو
از حدودِ مصطفیؐ بیروں مرو (۳۰)

"آئین و احکامات کی سختیوں کی شکایت مت کرو۔حضورِ اکرمﷺ کی متعین کردہ حدودِ شریعت سے کبھی اپنا قدم باہر مت نکالو'

اقبال نے حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ والا صفات کی تفہیم کا انداز اسی طرح اختیار کیا جیسا ان کے معنوی رہنما حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا یا تھا۔مولانا فرماتے ہیں:

من بندہء قرآنم اگر جاں دارم
من خاکِ رہِ محمدِؐ مختارم
گر نقل کند، جز ایں، کس از گفتارم
بیزارم و ازاں سخن بیزارم

"میں اگر زندہ ہوں تو قرآن کی وابستگی کی وجہ سے زندہ ہوں۔میں حضرت محمد مصطفیٰﷺ کے راستے کی مٹی ہوں۔اگر کوئی شخص [قرآن و صاحبِ قرآن سے وابستگی کے علاوہ] مجھ سے کوئی اور بات منسوب کرے تو میں اس سے ہزار بار بیزاری کا اظہار کرتا ہوں"۔

لیکن اقبال بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اتباعِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم

کی بنیاد پر عہدِ رسالت مآب سے قیامت تک آنے والا ہر مسلمان لائقِ تعظیم ہے۔ کیوں کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ نبی علیہ السلام کی اتباع کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے اور ایمان اور اعمالِ صالحہ کے معیارات کو برقرار رکھنے والوں کے لیے اپنی مخلوق کے دلوں میں ان کی محبت پیدا فرمادیتا ہے۔(۳۱)......اقبال کے کلام میں بزرگانِ دین کے مناقب کی موجودگی اس بات کی واضح دلیل ہے۔

لیکن بزرگانِ دین کی محبت میں بھی غلو کا عنصر مٹانے ، نبوت کے تصور میں جزوی شرکت کے رجحان کو بھی زائل کرنے اور ختم نبوت کے مسئلے کو دوٹوک انداز میں سمجھانے کے لیے ہی اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کو مزید واضح فرمادیا کہ حضورِ اکرمﷺ کے بعد کسی بھی مفہوم میں وحی کے تسلسل کا تصور ''شرک فی النبوت'' ہے اور نبی علیہ السلام کے بعد کوئی بھی نبی ءِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ مبارکہ کی طرح واجب الاتباع نہیں ہے نہ ہوسکتا ہے۔

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ ایماں کردہ ای(۳۲)

''اے نبی ءِ کریم علیہ السلام! آپﷺ کے بعد نبوت ہر مفہوم میں [ظاہر یا پوشیدہ مفہوم میں ، جیسے کسی کو نبی کی طرح واجب الاتباع قرار دینا]شرک ٹھہری ......آپﷺ نے محفل امکاں کو ایمان کے نور کی شمع سے جگمگا دیا''۔

الحاصل، امتِ مسلمہ کا اتحاد اس بات پر منحصر ہے کہ بلا شک و ریب حضورِ اکرم ﷺ کے جو اعمال و افعال و گفتار و تقریری آثار امت تک تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں صرف ان کو اختیار کرلیا جائے۔حضورِ اکرم کی ذات پر دین کی تکمیل ہوئی ہے اس پر کامل ایمان لاکر بعد میں پیدا ہونے والی بدعتوں اور تاریخ میں رونما ہونے والے واقعات کی بنا پر بننے والے عقائد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ، پورے اخلاص سے دین کی رسی (قرآنِ کریم) کو مضبوط پکڑ لیا جائے۔

حافظ شیرازی نے کیا پتے کی بات کہی ہے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خمِ طُرّہَ یارے گیرند (۳۳)

''میرے نزدیک تو اب یہی ایک مصلحت رہ گئی ہے کہ سارے دوست سارے کام چھوڑ چھاڑ کر محبوب کی زلف کے خم کی طرف مشغول ہوجائیں۔یعنی محبوب کی زلفوں کا حلقہ تھام لیں کیوں کہ محبوب کی زلف سے وابستگی ہی دنیا کے تمام غموں سے نجات کا ذریعہ ہے''۔

حافظ کے اس شعر میں محبوب' حضورِ اکرمﷺ کی ذات ہی کو سمجھنا چاہیے اور خمِ طُرّہَ یار سے ''دین'' کی رسی مراد لینی چاہیے۔ اقبال کا سارا پیغام یہی ہے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ساری توجہ[حُبِ رسولﷺ اور اتباعِ رسولﷺ کی غرض سے] حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات پر مرکوز کردی جائے''۔

بال جبریل میں شامل نظم ''ذوق وشوق'' فکر و فلسفہء اقبال کا ایک ایسا شاہکار ہے جس میں حضورِ اکرمﷺ کی عظمت کے بھرپور ادراک کے ساتھ انہوں نے اسلامی تاریخ کے روشن ماضی کے نقوش کی طرف تخلیقی قوت کے ساتھ اشارے کیے ہیں۔کمزور حال کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔لیکن عشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی قوت حاصل کرکے اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کا نسخہ بھی بتایا ہے:

آیہء کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں، کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!
بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خاروخس!

میرے نفس کی موج سے نشونمائے آرزو!
خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو!(۳۴)

اقبال نے اس نظم کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے تھے اور غیر منقسم ہندوستان کی بنسبت فلسطین چوں کہ مدینہ منورہ سے زیادہ قریب تھا اس لیے ان کے دل میں مدینہ منورہ کی حاضری کا ذوق و شوق انتہائی درجہ بڑھ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کے ابتدائی اشعار پر عرب کے جاہلی عہد کے شعراء کے سبعہ معلقہ قصائد اور شرف الدین بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدہء میمیہ کا اثر ہے۔ جاہلی شعراء کے قصائد کی تشبیب میں ان کی محبوبہ کی یاد کا احوال رقم ہوتا تھا اسی کی مناسبت سے بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قصیدے میں موضع ذی سلم اور وادیء کاظمہ اور پہاڑی سلسلے اضم کا ذکر کیا تھا۔ اقبال نے بھی کوہِ اضم اور ریگِ نواحِ کاظمہ کا ذکر کیا ہے۔

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب!
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا' برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں! (۳۵)

نظم کے تیسرے بند میں اقبال نے براہِ راست نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے مخاطب ہوتے ہوئے آپ ﷺ کی عظمت کا بیان کیا ہے۔ کائنات ایک لفظ ہے تو اس کی روح ،معنی اور منبع و غایت حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والاصفات ہے۔لیکن معنی کی تلاش میں نکلنے والوں کو آپ ﷺ کی عظمت و رفعت کا ادراک ہونا ذرا مشکل ہے۔ کیوں کہ انسانی عقل 'عَبدُ' کو تو سمجھ سکتی ہے ''عَبدُہ'' کا ادراک اس کے بس کی بات نہیں ۔ اس لیے اقبال نے حضورِ اکرم ﷺ کو ''معنیء دیریاب'' کہا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے بڑی پُر مغز باتیں کی

ہیں۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کا کچھ حصہ بطورِ اقتباس یہاں پیش کردیا جائے:

''حضور(ﷺ) تو بالاتفاق ''برزَخِ کبریٰ'' ہیں۔ پس حقیقتِ محمدیہ (ﷺ) جو حقیقۃ الحقائق ہے' اس کا سمجھنا بلا شبہ نہایت مشکل ہے ۔ کائنات کے مختلف مراتب میں اللہ نے برزخ کا سلسلہ قائم فرمایا ہے۔ چنانچہ:

جمادات اور نباتات کے درمیان، مرجان ، برزخ ہے۔
نباتات اور حیوانات کے درمیان چھوئی موئی کا پودا برزخ ہے
حیوانات اور انسان کے درمیان بن مانس برزخ ہے
انسان اور خدا کے درمیان حقیقۃ محمدی (ﷺ) برزخ ہے۔

اسی بات کا ایک عاشقِ رسول ﷺ نے یوں بیان کیا ہے:

اِدھر مخلوق میں شامل 'اُدھر اللہ سے واصل!
خواص اُس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

خلاصہء کلام یہ ہے کہ کائنات کی ساری قدر و قیمت اور خوبی آپ ﷺ ہی کے دم سے ہے۔یعنی جس شئے میں آپ ﷺ کا نور نسبتاً زیادہ ہے وہ شئے دوسری اشیاء سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی لیے ساری دنیا آپ ﷺ کے نور سے فیضیاب ہونے کے لیے بیتاب اور بے قرار ہے' اسی لیے ساری دنیا آپ ﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے......یا زنورِ مصطفیٰؐ اورا بہاست......یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است)......(۳۶)

اگلے شعر میں اقبال نے اپنے عہد کے علماء کو بے بصیرت و بے ذوق کہا ہے کیوں کہ وہ اپنی دنیا بنانے میں اپنے منصب کے تقاضوں سے آنکھیں بند کرچکے ہے۔ صوفیوں کی خانقاہوں میں بھی اللہ کی محبت کے ساغر پلانے کے بجائے دنیا طلبی کا درس مل رہا ہے۔ پھر اقبال کہتے ہیں کہ میں اسلامی تاریخ کے سنہرے دور کی بازیابی کا خواہش مند ہوں

اور کھوئے ہوئے عظیم فرزندانِ اسلام کے کردار کی جھلک دیکھنے کی جستجو رکھتا ہوں۔ عمومی فضا میں تو صرف کانٹے اور گھاس اگتی ہے جبکہ میرے فکر وفن سے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی آرزو پیدا ہوتی ہے......اس نکتے کو اقبال کے ایک فارسی شعر سے سمجھا جاسکتا ہے :

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم (۳۷)

''ہم اپنے مقاصد کی شعوری تخلیق ہی سے زندہ ہیں اور اس مقصد اور آرزو کی کرن ہی سے ہماری چمک دمک قائم ہے...........[انسان اور بہائم میں فرق ہی نصب العین کے ہونے نہ ہونے کا ہے]''

ذوق وشوق کے مذکورہ شعر میں بھی اقبال نے اپنا شعری مسلک یہی بتایا ہے کہ مقاصد کی تخلیق اور آرزو کی نشو ونما کے لیے ہی میں شعر کہتا ہوں۔ پھر اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اپنے فن کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کی ہے، میری آواز[شعر] میں میرالہو شامل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تصنیف زَبورِ عجم سے ایک شعر نقل کیا ہے۔ وہ حضورِ اکرمﷺ سے استدعا کرتے ہیں کہ میرے دلِ بے قرار کو [میری تخلیقِ آرزو کی جدوجہد سے] کبھی فرصت نہ دیجیے۔ بلکہ مجھے عشق کی پیچیدگیوں میں مزید الجھائے رکھیے!!!

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دوشکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را (۳۸)

''اے میرے محبوب[حضورِ اکرمﷺ]! آپ مجھے اپنے جمالِ جہاں آرا کے فیضان سے مسلسل متمتع ہونے کا موقع عطا فرماتے رہیے۔اپنے بل کھائے ہوئے گیسوؤں میں اور ایک دوشکن کا اور اضافہ فرمالیجیے تاکہ میں تا حیات اسی عشق میں مبتلا رہ سکوں''۔

اگلے بند میں اقبال نے وہ شاہکار اشعار پیش کیے ہیں جن کی مثال پوری اردو نعت کی تخلیقی تاریخ میں نہیں ملتی۔

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب

گُنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہِ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جُنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیریﷺ نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوہء بے حجاب سے(۳۹)

حضورِ اکرمﷺ کی حدیثِ مبارک ہے''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ''(پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ میرا نور ہے)(۴۰)ایک حدیث میں ارشادفرمایا ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمُ''......(پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ قلم ہے) (۴۱)......ایک اور حدیث میں ہے ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ o ''(سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے)(۴۲)............

صاحبِ سرِّ دلبراں لکھتے ہیں :

''حضور سرورِ کائناتﷺ عقل کی صورت ہیں اور خدا کا قلم ہیں اور دعوت الی اللہ کی حقیقت اور شریعت کے وضع کرنے میں آپ عقولِ جزویہ ہیں اور تینوں احادیث سے آپ ہی کی ذات مراد ہے۔(۴۳)

حضرت ذوقیؒ مزید لکھتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ نے عالمِ روحانی کا ابداع کیا اور عالمِ جسمانی کی

تخلیق فرمائی تو نورِ نبوت کو عقلِ اول کی ذات سے اس طرح نکالا
جس طرح مکان کا نقشہ انجینئر کے ضمیر سے نکلتا ہے۔ چنانچہ اسی نور
سے چاند سورج روشن ہوئے اور اسی نور سے عرش و کرسی اور لوح و قلم
کو قیام ملا''۔(۴۴)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا 'اِنَّ خُلُقَ نَبِیِّ اللّٰہِ ﷺ کَانَ الْقُرْاٰنُ'' (حضورِ اکرم ﷺ قرآنِ پاک میں بیان کردہ تمام اخلاقِ جلیلہ اور اوصافِ حمیدہ کا مجسمہ تھے)......(۴۵)

ان تمام روایتوں کو پیشِ نظر رکھیں تو اقبال کی استعاراتی زبان ''لوح''، ''قلم'' اور ''الکتاب'' کے مفاہیم سمجھ میں آسکتے ہیں۔ کیوں کہ آپ ﷺ کے نور کی تخلیق ہی تخلیقِ اول ہے بقیہ تخلیقات نورِ اولیں کی تخلیق کا تتمہ ہیں اس لیے ان کے نام بھی حضورِ اکرم ﷺ کے اسمائے گرامی کے دائرے میں آسکتے ہیں۔'' الکتاب'' قرآنِ صامت ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات قرآنِ ناطق اور مجسم، اس لیے آپ ﷺ کے وجود کو ''الکتاب'' کہنے میں بڑی معنویت ہے۔ رہا آسمان کا آپ ﷺ کی ذات کے محیط میں ایک بلبلہ ہونا......تو حقیقتِ محمدیہ اصلِ کائنات ہے اس محیط میں آسمان کی حیثیت سمندر میں بلبلے کی سی ہی ہے۔
اس خاکداں کو آپ کی تشریف آوری کے باعث فروغ حاصل ہوا ہے کیوں کہ آپ نے خاک کے ہر ذرے کو سورج جیسی چمک عطا فرمادی۔ یعنی انسانی سرشت میں جو حیوانیت تھی اور جس کا مظاہرہ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل ہر لحہ ہورہا تھا، آپ ﷺ نے اس حیوانیت کا رخ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی طرف پھیر دیا۔ اس طرح آپ نے ذروں کو آفتاب کی چمک دمک عطا فرمادی۔ تاریخِ عالم میں آپ کی امت کے بادشاہوں کی شان و شوکت سے آپ ﷺ کے جلال کی جہت سامنے آتی ہے اور صوفیہ کرام کے فقر میں آپ ﷺ کے حسنِ معاشرت وسلوک کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ سلطان سنجر، سلجوقی خاندان کا بڑی شان و شوکت والا بادشاہ تھا اور سلطان سلیم اول سلطنتِ عثمانیہ ء ترکی کا نامور فرماں روا

تھا۔ حضرت جنید بغدادی اور حضرت بایزید بسطامی رحمہم اللہ صوفیہ کرام کے سرخیل ہیں۔ فقر و شاہی کا مفہوم اقبال کے درجِ ذیل شعر سے زیادہ واضح ہوسکتا ہے:

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است
ایں تجلیہاتِ ذاتِ مصطفیٰ است(۴۶)

''فقیری اور بادشاہت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی واردات اور شانیں ہیں۔ امت میں جس کو بھی بادشاہت ملی وہ حضورِ اکرم ﷺ کی شان اور تجلی کے طفیل اور کسی کو دولتِ فقر ملی تو وہ بھی حضورِ اکرم ﷺ کی شان اور تجلی کے ظہور کی علامت ہے''۔

اگلے شعر میں اقبال نے اپنی ذات کو واسطہ بنا کر ایک نکتہ بیان کیا ہے جو ہر مسلمان کے لیے ایک کلیہ، ایک ضابطہ اور ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر حضورِ اکرم ﷺ کی اتباع اور پیروی کا بالکل ایسا انداز نہ ہو جیسا نماز میں پیش امام کی پیروی کا ہوتا ہے تو زندگی کے ہر عمل میں راہ سے بھٹکنے کے علاوہ کوئی اور صورت پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ یہاں نماز، قیام اور سجود کہہ کر انسان کی پوری زندگی کے اعمال کی طرف اشارہ کردیا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کی پیروی میں انسان (اور جن) کا ہر عمل عبادت بن جاتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی توجہ ہی سے عقل کو بھی منزل ملی اور عشق کو بھی مقصود حاصل ہوا۔ عقل کی سرشت میں جستجو ہے اور کائنات کی گتھیاں سلجھانے کی تڑپ ہے اس لیے اسے ما بعدالطبیعاتی رموز سے آشنا کرکے مطمئن کردیا اور عشق کو روحانی طور پر نواز کر اطمینان کی دولت عطا فرمادی۔

ٹیپ کے شعر میں اقبال نے استغاثے کے انداز میں کہا ہے کہ حضور! میرا زمانہ بڑا تاریک ہے۔ زمانے کی گردش نے اس عہد کو ظلمت بداماں کردیا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنی توجہِ خاص سے ہماری دنیا کو پھر منور فرمادیجیے!

بعد کے بند میں اقبال نے اپنی کیفیات کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بیان کردیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذات مکمل عشق کی علامت ہے جس کے بغیر منزل مل ہی

نہیں سکتی ہے۔ چنانچہ منزل رسی کا واحد ذریعہ آپ ﷺ کی ذات سے انسلاک ہے۔ کیوں کہ محض عقل [جسے اپنے زعم میں برتری کا دعویٰ ہے اور جو پیکرِ محسوس کی خوگر ہے] کفر ہی کفر ہے۔

تازہ مرے ضمیر میں معرکہء کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بو لہب!(۴۷)

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق میں اقبال نے براہِ حضورِ اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے ان انقلابی اقدامات کا احوال درج کیا ہے جو حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات کے ظہور کے بعد آپ ﷺ کی وساطت سے انسانیت کے لیے باعثِ خیر و فلاح بنے تھے۔اقبال کہتے ہیں:

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ
وارہا ایں قوم را از ترسِ مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کر دی کائناتِ کہنہ را
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح، تو بانگ اذاں
لذتِ سوز و سرور از لا الہ
در شبِ اندیشہ نور از لا الہ
نے خداہا ساختیم از گاؤ خر
نے حضورِ کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر
ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست

فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست(۴۸)

''یا نبی اللہ! آپ ہی ہم بے یارومددگار لوگوں کا سازوسامان ہیں۔ آپ ﷺ اس مسلمان قوم کو [پہلے کی طرح] موت کے خوف سے نجات دلایئے! [کیوں کہ موت کے خوف نے اسے جہاد سے دور کردیا ہے]۔ آپ ﷺ ہی کی ذات تو ہے جس نے بتوں کو آگ میں جھونک کر اس پرانی کائنات میں نقشِ توحید از سرِ نو اجاگر فرمایا۔ انسانوں اور جنات کی دنیا میں صرف آپ ﷺ ہی کی ذات ہے جس نے ان کے ذکر و فکر میں ایسی جہتیں پیدا فرمائی ہیں کہ اب ذکر و فکر کی دنیا صرف آپ کی ذات سے منسوب ہوگئی ہے۔ [آپ ﷺ ہی کی بدولت ہمیں] الہِ واحد کے اقرار اور باطل خداؤں سے انکار کی لذتِ سوز و سرور حاصل ہوئی۔ اسی کلمہء طیب کی بدولت ہمیں فکر کی رات میں نور میسر آیا۔ آپ ﷺ کی تعلیماتِ توحید ہی کا یہ فیضان ہے کہ ہم نے مشرک قوموں کی طرح گائے اور گدھے کو نہیں پوجا اور نہ ہی ہم کاہنوں کے آگے جھکے۔ ہم نے پرانے نقلی خداؤں کے آگے سجدہ ریزی بھی نہیں کی اور نہ ہی ہم نے امیروں اور بادشاہوں کے محلوں کے چکر کاٹے۔ یہ سب خصلتیں ہم میں آپ ہی کی تعلیمات کی بدولت پیدا ہوسکی ہیں۔ ہماری فکر کی راست سمتی آپ ہی کے احسانات کی مرہونِ منت ہے''۔

علامہ نے رموزِ بیخودی میں ایک باب قائم کیا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رسالت کا مقصد انسانی معاشرے کو مساوات کی بنیاد پر استوار کرنا ہے۔

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مندو زیردست
سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر

بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ او رنگ و ہم پیر کنشت
باج بر کشتِ خرابِ او نوشت
از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ
تا امینِ حق بحقداراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
حرّیت زاد از ضمیرِ پاکِ او
ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او(۴۹)

''[نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تشریف آوری سے قبل اس دنیا میں] انسان اپنے جیسے انسان کی پرستش کرتا تھا۔نوعِ انساں انتہائی کمزور تھی۔ ایران کے بادشاہ اور روم کے شہنشاہ کی شان وشوکت نے، راہزن بن کر انسان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، گردن میں رسی اور پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔[اس دنیا میں انسان کے شکار کے لیے] سینکڑوں شکاری تھے۔کوئی غیب کی خبریں بتانے والا کاہن تھا تو کوئی پاپا کا روپ دھارے ہوئے تھا۔کوئی بادشاہ کی صورت میں تھا تو کوئی امیر تھا۔ بادشاہ اور کلیسا کا مذہبی رہنما دونوں ہی انسانیت کی اجڑی ہوئی کھیتی پر لگان وصول کرتے تھے۔انسان کی فطرت بھی غلامی کے باعث پست ہوگئی تھی۔اس کی بانسری میں نغمے خون آلود ہوگئے تھے۔ایسی فضا میں محمد مصطفیٰ ﷺ کا ظہور ہوا اور آپ نے بادشاہوں کے تخت ،غلاموں کے سپرد کرکے حقداروں کو ان کا حق دلوادیا۔[اس طرح انسان کی] آزادی نے آپ ﷺ کے قلبِ پاک سے جنم لیا اور یہ نئی اور میٹھی شرابِ [طہور] آپ کی[لگائی ہوئی] انگور کی بیل سے دستیاب ہوئی''۔

دشمنانِ اسلام کا منفی پراپیگنڈا بھی بعض اوقات اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے تعارف کا باعث بنتا ہے۔علامہ نے'' ابوجہل کا نوحہ'' بھی

اشعار میں ڈھالا ہے۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیماتِ اسلام انسانیت کے لیے کس قدر سود مند اور دشمنانِ انسانیت کے لیے کتنی مہلک ہیں۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دم او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاک قیصر و کسری سرود
نوجواناں راز دست مار بود
ساحر و اندر کلامش ساحری است
ایں دو حرف لا الہ خود کافری است
تابساط دینِ آبا در نورد
با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وی بگیر ای کائنات
مذہب او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست
قدر احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروے دو دمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب میدانم کہ سلماں مزدکی است(۵۰)

''ہمارا سینہ محمدﷺ کی وجہ سے داغ داغ ہے [کیوں کہ] ان ہی کی دی ہوئی تعلیم کے باعث ہمارے کعبے کا چراغ بجھ گیا ہے یعنی انہوں نے ہمارے ہاتھ سے بنائے ہوئے خداؤں کو پاش پاش کردیا ہے۔انہوں [ﷺ] نے قیصر و کسریٰ کی ہلاکت و بربادی کی بات کی اور مجھ سے میرے زیرِ اثر نوجوانون کو چھین لیا۔ وہ [ﷺ' نعوذُ باللہ] جادوگر ہے اور اس[ﷺ] کے کلام میں جادوگری ہے۔لاالٰہ کے دوحرفوں ہی میں دراصل کفر ہے [کیوں کہ اس میں الہِ واحد کے سوا سب کی نفی ہے]۔جب اس[ﷺ] نے ہمارے آبا و اجداد کے دین کی بساط الٹ دی تو ہمارے بتوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جو نا قابلِ بیان ہے۔اس [ﷺ] نے ہمارے بتوں کو اپنی ضرب سے پاش پاش کردیا [اب تو یہ بد دعا ہے کہ]اے کائنات [توہی]اس سے انتقام لے!...... اس کا مذہب وطنی اور نسبی [تفاخر کی] جڑ کاٹتا ہے۔وہ[ﷺ تو]قریش اور عرب کی فضیلت کا [بھی]منکر ہے۔ اس[ﷺ] کی نظر میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ وہ تو [کھانے کے لیے بھی]اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھا۔ اس [ﷺ] نے عرب کے آزاد بندوں کی ناقدری کی اور حبش کے بد صورت غلاموں کے ساتھ راہ و رسم بڑھالی۔[ان کے لائے ہوئے نظام کی بدولت] کالے ،گورے شیروشکر ہوگئے۔انہوں نے اعلیٰ خاندانوں کی عزت و آبرو خاک میں ملا دی۔ انسانی برابری اور بھائی چارے کا یہ تصور ایرانی ہے کیوں کہ سلمان [نبیﷺ کا صحابیؓ] ایرانی ہے [اور اسی نے مزدک کا دیا ہوا درس محمدﷺ کو دیا ہے]''۔

اس طرح اقبال نے حضورِ اکرمﷺ کے لائے ہوئے دین کی خوبیاں گِنا کر ،دشمنانِ دین کی طرف سے ان کے اپنے نظام کے تلپٹ ہوجانے کا نوحہ پیش کیا ہے۔

ہندوستان پر برطانوی قبضے کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فکری صلاحتیں کند ہونے لگیں اور انہیں مغربی آقاؤں کی ہر چیز میں حسن نظر آنے لگا۔حتیٰ کہ وہ اپنے مذہب میں بھی تاویلات کے ذریعے ردو قبول کے نکات نکالنے لگے۔ اقبال نے اس مہلک بیماری کی علامتوں سے مسلمانوں کو نہ صرف آگاہ کیا بلکہ انہیں نبیء کریم کا درسِ حریت یاد دلاکر صاف

صاف کہہ دیا کہ شئے کی حقیقت دیکھنے کے لیےصرف آزاد بندوں کی نگاہ درکار ہے:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حُسنِ زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا(۵۱)

ہندی مسلمانوں کو غلامی کے باعث عمل سے زیادہ اظہارِعشق کا چسکا تھا۔ دیدارِ رسولﷺ کی آرزوتھی جس کا اظہار کرتے ہوئے مسلمان نہیں تھکتے تھے لیکن یہ نہیں سوچتے تھے کی حضورِ اکرمﷺ کے دیدار کا اصل مفہوم و مدعا کیا ہے؟......اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں حسین بن منصور حلاج سے سوال کیا:

کم شناسم عشق را، ایں کار چیست؟
ذوقِ دیداراست؟ پس دیدار چیست؟(۵۲)

''میں عشق کا مفہوم کم سمجھتا ہوں [بتائیے کہ] یہ کیا کام ہے؟...... مجھے دیدارِرسولﷺ کا ذوق تو ہے لیکن اصل دیدار کیا ہے؟''

جواب میں حلاج نے کہا:

معنیء دیدارِ آں آخر زماںؐ
حکمِ اُو بر خویشتن کردن رواں
درجہاں زی چوں رسولِ انس و جاں
تا چو او باشی قبولِ انس و جاں
باز خود را بیں' ہمیں دیدارِ دوست
سنتِ او سِرّے از اسرارِ دوست(۵۳)

''نبیء آخرالزماںﷺ کے دیدار کا مطلب ہے کہ تو ان کے حکم کو خود [اپنی ذات] پرجاری کرلے۔یعنی ان کی لائی ہوئی شریعت پرعمل پیرا ہوجا۔ دنیا میں انسانوں اور جنوں کے رسول

ﷺ کے مانند زندگی بسر کر۔ تا کہ تو بھی ان کی طرح عالمِ انسانی اور عالم جنّات میں مقبول ہوجائے۔ بعد ازاں خود کو دیکھ کہ یہی ان کا دیدار ہے۔ ان کی سنت [پر عمل کرنے ہی سے معلوم ہوگا کہ] یہی ان کے بھیدوں سے ایک بھید ہے۔حضورِ اکرمﷺ کی صورت اور سیرت کی پیروی ہی سے دیدار کی آرزو کرنے والے کی ذات آئینہ ہوجائے گی جس میں حضورِ اکرم ﷺ کا دیدار نصیب ہوسکے گا''۔

اس طرح اقبال نے امت کو یہ پیغام دیا کہ پیروی کے بغیر حضور علیہ السلام کی محبت کا دعویٰ اور آپﷺ کے دیدار کی تمنا بے سود ہے۔ سچی آرزو اور سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان فنا فی الرسولﷺ ہوجائے اور پھر اپنے آقا حضرت محمد مصطفیٰﷺ کی قربت کا تمنائی ہو!

اقبال کا اپنا حال یہ تھا کہ وہ بیشتر اوقات قلب و ذہن و روح کے ساتھ اپنے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اسی کیفیت کی ایک نظم ''بانگِ درا'' میں ہے جس کا عنوان ہے ''حضورِ رسالت مآبﷺ میں''۔اس نظم کے اکثر اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال حضورِ اکرمﷺ کی محفل میں حاضر ہیں:

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیہء رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو
......کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
......ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

اس کے بعد اقبال عرض کرتے ہیں:

حضورﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو شے ہے اِس میں وہ جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں

(حضورﷺ رسالتِ مآب میں) (۵۴)

اس نظم سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اقبال نے جنابِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دربار میں بھی امت کا احوال ہی پیش کیا اپنی ذاتی روحانی وقلبی واردات کا ذکر نہیں کیا۔

امت کو اسلامی اقدار کا پابند رہنے کی تلقین اور حضورِ اکرمﷺ کی سچی پیروی اور محبت کی دعوت دینا ہی اقبال کا فکری وشعری مسلک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ انہوں نے تو شاعری کو پیغام پہنچانے کا ذریعہ بنایا ہے۔محض شاعری نہیں کی ہے۔

نہ شعر است ایں کہ بروے دل نہادم
گرہ از رشتہء معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق
مسِ ایں مفلساں را تاب دادم(۵۵)

''یہ محض شاعری نہیں ہے کہ جس میں میرا دل اٹکا ہوا ہے۔ میں تو معانی کی گرہیں کھول رہا ہوں۔اس امید پر کہ میری قوم کو عشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ، اکسیر بنادے۔ میں اس مفلس قوم کے تانبے کو آگ میں تپا رہا ہوں تا کہ یہ اکسیر بن جائے''۔

مفلس قوم کے تانبے کو اکسیر بنانے کے لیے ہر ہر زاویئے سے دعوتِ عمل دی اور عشقِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی غایت کا احساس دلایا:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدﷺ سے اُجالا کر دے(۵۶)

اور:

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ما سوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

(جوابِ شکوہ) (۵۷)

روحِ اسلام سے مملو پیغام اپنے اشعار، اپنی گفتار اور اپنی تحریروں میں بار بار پیش کرنے کے بعد بھی جب مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکے تو اقبال نے اپنے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰﷺ کی جناب میں یہ عرض داشت پیش کی:

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند
زِ شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ اممؐ داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند(۵۸)

''میں نے سرفرازی حاصل کرنے کا راز مسلمانوں کے سامنے پیش کردیا، لیکن انہوں نے میری باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔انہوں نے میرے شجرِ فکر کا پھل نہیں کھایا۔اب میرے آقاﷺ! آپ امتوں کے امام ہیں، میں آپ سے اپنی فکری سچائی اور پیامی شاعری کی داد چاہتا ہوں۔مسلمان قوم نے تو مجھے محض شاعر سمجھ رکھا ہے''۔

اقبال کی شعری وفکری تحریروں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا مماثل اسلامی دنیا میں بالعموم اور ہندو پاک اسلامی معاشرے میں بالخصوص کوئی نہ ہوا۔ایک ایسا شاعر جس کے کلام میں عشقِ رسولﷺ کی گرمی، امتِ مسلمہ کی اجتماعیت کا احساس اور قومِ

مسلم کے اِدبار و زوال کو عروج میں بدلنے کا اتنا شدید ولولہ ہو۔

اقبال کی مثال صحرائے حیات میں قیس کی سی ہے جس کے لیے غالبؔ نے کہا تھا:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا(۵۹)

کاش امتِ مسلمہ ''رسالت'' کے جملہ مفاہیم اور مقاصد و اغراض سے واقف ہوکر (اقبال کے فکری نکات کی روشنی میں) حضورِ اکرمﷺ سے محبت کرنے والی بن جائے اور آپﷺ کی پیروی کر کے خود کو جمالِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا آئینہ بنالے!!!

ماٰخذ ومنابع:

۱۔اقبال، کلیاتِ اردو، سروسز کلب، 1995 ء، ص 49/691
۲۔اقبال، جاوید نامہ، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص97/933
۳۔این میری شمل، شہپرِ جبریل، مترجمہ: ڈاکٹر محمد ریاض، گلوب پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۱۸۷
۴۔اقبال، پیامِ مشرق، شیخ بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص 185/678 ، غزل 34
۵۔ایضاً ص194/687 ۔غزل 44
۶۔مکاتیبِ اقبال بنام خان نیاز الدین خان، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص۶۰
۷۔جاوید نامہ، ص 63/899 ۸۔پیامِ مشرق، ص 147/640
۹۔کلیاتِ اقبال، اردو، (بالِ جبریل)، سروسز کلب، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱۹/۲۷
۱۰۔ایضاً ۳۱۷/۲۵ ۱۱۔اقبال، ارمغانِ حجاز، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۴۸
۱۲۔ایضاً ص۵۰ ۱۳۔ایضاً ص ۷۱ ۱۴۔جاوید نامہ، ۱۸۰/۱۰۱۶ ۱۵۔ایضاً ص ۱۸۰/۱۰۷
۱۶۔این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، مترجم: محمد ریاض، ڈاکٹر، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۱۹۷
۱۷۔جاوید نامہ ص 24/860 ۱۸۔ایضاً ص122/958 ۱۹۔جاوید نامہ ص ۸۵۵/۱۹
۲۰۔ایضاً ص179/1015 ۲۱۔ایضاً ص 176/1012 ۲۲۔ایضاً ص 178/1014
۲۳۔اقبال، اسرارِ خودی، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص 31 to 35/247 to 251
۲۴۔اقبال، رموزِ بیخودی، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص 161 to 163/377 to 379
۲۵۔ایضاً ص 163 to 165/379 to 381 ۲۶۔ایضاً ص 145/361

۲۷۔اقبال، خطباتِ اقبال، تجدیدِ فکریاتِ اسلام، مترجم: ڈاکٹر وحید عشرت، نظرِ ثانی: ڈاکٹر عبدالخالق، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۵

۲۸۔اقبال، پیامِ مشرق، شیخ بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص 185/678، غزل 34

۲۹۔یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرحِ پیامِ مشرق، عشرت پبلسنگ ہاؤس، لاہور، س۔ن۔ ص ۴۹۹

۳۰۔اسرارِ خودی، ص 67/283

۳۱۔''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور کیے انہوں نے نیک کام [تو] عنقریب پیدا کردے گا ان کے لیے، رحمٰن [دلوں میں] محبت......القرآن، آیت نمبر ۹۶ سورۂ مریم۔

۳۲۔کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۹۹

۳۳۔شرحِ دیوانِ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ، پروفیسر میاں مقبول احمد، مشتاق بک کارنر، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، س۔ن، لاہور، ص 534

۳۴۔کلیاتِ اقبال، اردو، (بالِ جبریل)، سروسز کلب، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۲/۴۰۳   ۳۵۔ایضاً ص ۱۱۱/۴۰۳

۳۶۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح بالِ جبریل، عشرت پبلسنگ ہاؤس، غزنی سٹریٹ، لاہور، س۔ن۔ ص ۵۵۲

۳۷۔اسرارِ خودی، ص 29/245   ۳۸۔کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۱۱۳/۴۰۵

۳۹۔ایضاً ۱۱۳/۴۰۵   ۴۰۔حضرت شاہ سید محمد ذوقیؒ، سِرِّ دلبراں، نارتھ کراچی، کراچی، طبع پنجم: ۱۴۱۸ھ، ۳۷۶

۴۱۔ایضاً   ۴۲۔ایضاً   ۴۳۔ایضاً ص ۳۷۸   ۴۴۔ایضاً ص ۳۶   ۴۵۔صحیح مسلم۔

۴۶۔مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مثنوی مسافر، شیخ بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص 82/1222

۴۷۔کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۱۱۴/۴۰۶

۴۸۔اقبال، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، صفحہ 73 / 1213

۴۹۔رموزِ بیخودی، ص 167/383   ۵۰۔جاوید نامہ، ص 78/914

۵۱۔کلیاتِ اقبال (اردو)، ص 24/316   ۵۲۔جاوید نامہ، ص 185/1021

۵۳۔ایضاً ص 185/1021   ۵۴۔کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۱۹۷

۵۵۔ارمغانِ حجاز، ص 32/747   ۵۶۔کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۲۰۷

۵۷۔کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۲۰۸   ۵۸۔ارمغانِ حجاز، ص 32/747

۵۹۔دیوانِ غالب (ردیف، الف)

....

[مطبوعہ: جسارت سنڈے میگزین، کراچی، بابت: بعنوان ''کلامِ اقبال میں ''مقامِ رسالت'' کی تفہیم ......عنوان کی تبدیلی اور اضافوں کے ساتھ۔]

سحرؔ سہارنپوری کی نعت گوئی

نعت گوئی حضرتِ حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے توسط سے امت کے بعد کے طبقوں میں رائج ہوئی۔عربوں کی گھٹی میں شاعری تو پڑی ہوئی تھی لیکن شرکیہ، قبائلی تفاخر پر مبنی اور زنانِ غیر محرم سے بے محابہ عشق کے اظہار پر مبنی اشعار ہی ان کی شاعری میں عام تھے۔ اس شاعری پر مبالغے کا عنصر غالب تھا۔اسلام نے انسان کو ودیعت کردہ کسی صلاحیت کو دبانے، مٹانے یا نظر انداز کرنے کے بجائے اس میں پوشیدہ شر کے عناصر اور معائب دور کرکے انسانی معاشرے کے لیے مفید بنا کر پیش کرنے پر زور دیا ہے۔اسی لیے ہر جذبہ اور انسانی جبلت کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ خیر کے اصول فراہم کرکے انسانوں کو ان کے رجحانات کے حوالے سے ذہنی و فکری راہیں متعین کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ شاعری کا ملکہ بھی عطیہء ربانی ہے اور اس فن کی تاثیر بھی سحر کارانہ ہے اس لیے اس کے مضرت رساں پہلوؤں سے بچ کر شاعری کرنے کی نہ صرف اجازت مرحمت فرمائی گئی بلکہ خیر کے پرچار کے لیے شعری قوت کو استعمال کرنے کی ترغیب بھی دی گئی۔ حضرتِ حسان رضی اللہ عنہ کا انتخاب اسی حکمتِ عملی کا مظہر تھا۔

شاعری کی قوت کو ہم ادبی رجحانات کی روشنی میں دیکھنا چاہیں تو انگریزی میں رائج اصطلاح کو پیش کرسکتے ہیں جس میں ادب کو ''معلوماتی'' اور ''پُر تاثیر یا پُر قوت'' کہہ کر ممیّز کیا جاتا ہے۔ یعنی AND LITERATURE OF KNOWLEDGE

LITERATURE OF POWER تخلیقی ادب میں ''لفظ کی قوت'' کو جس طرح اس تعریف میں بیان کیا گیا ہے اس کا ادراک کرتے ہوئے (عرب کے شعری منظر نامے ،تاریخی پس منظر، رائج شاعری کی تاثیر، قوت اور زور کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ہی) نبیِ کریم علیہ السلام نے شعراء کو محامدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام رقم کرنے اور مذموم پراپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے شعر گوئی کی ترغیب دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے:

''بے شک روح القدس (جبریلِ امین علیہ السلام) حسانؓ کے ساتھ ہوتے ہیں جب تک یہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے (کافروں کی ہجو کا) دفاع کرتے رہتے ہیں (یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے جواب دیتے رہتے ہیں)'' (سنن ابی داؤد ج سوم ص ۵۳۵)۔

حضورِ اکرم ﷺ دعا فرماتے تھے:

''اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ''

اے اللہ! روح القدس کے ساتھ حسان کی مدد فرما''

(صحیح بخاری۔ ج ۳،ص ۴۸۹)۔

علاوہ ازیں صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث ہے جس میں آیا ہے

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے ایک لشکر تیار کیا ہے وہ انصار ہیں ان کا مقصد صرف دشمن سے مقابلہ کرنا ہے۔ ہمارا وہ لشکر ہر وقت مذمت کرنے، جنگ کرنے، ہجو کرنے کے لیے تیار ہے۔ پس تم میں سے جو رسول اللہ ﷺ کی [ہجو کرنے والوں کی] ہجو کرے اور رسول اللہ ﷺ کی تعریف کرے اور ان کی مدد کرے سب برابر ہیں اور جبریل اللہ تعالیٰ کا رسول ہم میں موجود ہے۔ وہ روح القدس ہیں جن کا کوئی مدِ مقابل اور ہمسر نہیں (صحیح مسلم: ج ۳، ص ۴۳۳)۔

درجِ بالا حدیث شریف کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی اپنی شاعری کے

ذریعے تعلیماتِ رسول ﷺ کے صحیح خدو خال اجاگر کرنے اور نبی علیہ السلام کی تعریف و توصیف کرنے والے شعراء دین کے ویسے ہی انصار ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے جو کوئی خلوصِ نیت، بھرپور توجہ اور شرعی و شعری تقاضوں کے ادراک کے ساتھ اپنے قلم کو مجاہد کے طور پر استعمال کرے گا اس کو قیامت تک اس کام کے لیے روح القدس کی مدد حاصل رہے گی۔ حضورِ اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعے مدد حاصل ہونے کی جو دعا فرمائی تھی اس سے مترشح ہوتا ہے کہ لفظوں کی قوت اور تاثیر کے عمل کو کارفرما دیکھنے کی آرزو ہی ایسی دعا کرنے کا سبب بنی ہوگی!

نعتیہ شاعری کے اس پس منظر میں حضرت سرؔو سہارنپوری کی شاعری اپنے معیار اور سچائی کے اظہار کے حوالے سے عمدہ شاعری قرار پاتی ہے۔ کیوں کہ اس میں صداقت بیانی کے ساتھ ساتھ زورِ بیان بھی ہے، قوتِ ابلاغ بھی، عشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی چاشنی بھی ہے اور تعلیماتِ رسول ﷺ کی روشنی بھی۔

پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو قوم کے نام نہاد دانشوروں میں ''الحاد'' کی وبا پھیل گئی اور شعراء دینی اقدار کا حوالہ دینے اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر کرنے سے کترانے لگے کیوں کہ ان کی شعری کاوشوں کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھا جارہا تھا۔ لیکن اس عہد میں بھی اسلام سے عملی رشتہ قائم کرنے اور عشقِ رسول ﷺ کا برملا اظہار کرنے کی جراءت رکھنے والے شعراء موجود تھے جن کی کاوشوں کو بعد کے زمانے میں تحریک کی قوت نصیب ہوئی اور اس پُر خلوص گروہ کی مساعی کے ثمرات اس طرح ظاہر ہونے لگے کہ ''الحاد پرست'' بھی ''شعرِ عقیدت'' کے حصار میں آ گئے۔

مذکورہ دین بیزار ماحول میں شمعِ عشقِ نبوی روشن کرنے والے لوگوں میں سرؔو سہارنپوری مرحوم و مغفور کا نام نامی اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ پاکستان میں اسلامی ادب کی ترویج کے نام پر نعتیہ شعری اقدار کو پروان چڑھانے میں جن رسائل نے نمایاں کام کیا ان میں ماہنامہ سیارہ بھی تھا جس میں دیگر شعراء کے ساتھ سرؔو سہارنپوری کا نام بھی نظر آتا ہے۔

گوہر ملسیانی نے اپنے مضمون ''فروغِ نعت میں سیارہ کا کردار'' میں سرؔو سہارنپوری کا یہ شعر پیش کیا ہے:

جو دل میں عشقِ محمد کا آستانہ رہے
سحر کا حسن رہے، رونقِ شبانہ رہے

(نعت رنگ ۲۳۔ص۱۸۴)

عہدِ ضیاء الحق سے قبل تک نعت کا چرچا اسی لیے عام نہ تھا کہ سکہ بند ملحد ادیب و شعراء، نعت کو ''شاعری'' تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے عشق کے اظہار سے گریز کی بڑی گھناؤنی سازش تھی...... سرؔو سہارنپوری صاحب نے ۱۹۶۰ء میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں ایک قصیدہ کہا تھا اور مولانا صدرالدین الرفائی رحمۃ اللہ علیہ کی ترغیب پر نعتیہ قصیدے کے ساتھ ساتھ دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان میں بھی قصائد لکھے۔ ان قصائد کی طباعت کا اہتمام ۱۹۶۷ء میں ہوا تو مولانا مودودیؒ نے ان کے کلام پر رائے دیتے ہوئے لکھا:

''میں نے اس نقطہء نظر سے ان قصائد کو دیکھا کہ ان میں کہیں وہ بے اعتدالیاں تو نہیں ہیں جو عموماً نعت میں کی جاتی ہیں۔ الحمد للہ! کہ میں نے آپ کے کلام کو ان سے خالی پایا''۔

اپنی منقبتی اور نعتیہ شاعری کے ضمن میں ایک متبحر عالمِ دین سے اس بات کا تصدیق نامہ حاصل کر لینا کہ سرؔو سہارنپوری صاحب کے نعتیہ اور منقبتی قصائد شرعی اسقام سے پاک ہیں، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ نعت میں عموماً بے اعتدالیاں ہوجاتی ہیں۔ علامہ اقبال جیسا صاحبِ نظر بھی نعت کہتے ہوئے ابتداء میں عمومی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ اقبال نے کہا تھا:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

(کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال۔صابر کلوروی،ص۳۳۲)

یا اقبال کی نظم ''نورِ محمدی'' جس کے ابتدائی اشعار ہیں:

جو ہے خالقِ دہر، اور دہر بھی
جو ہے بحر اور بحر کی لہر بھی
جو کثرت میں آ کر بھی تنہا رہا
نہاں ہو کے پردوں میں پیدا رہا
رہی بے کلی جس کو سیماب وار
ملا میم احمدؐ میں جس کو قرار
ہوا جسمِ بے سایہ بن کر عیاں
بنی جس سے خاکِ عرب آسماں

(ایضاً،ص۳۳۸)

لیکن بعد میں اقبال کے تنقیدی شعور نے اس قسم کی شاعری کو اپنے کسی شعری مجموعہ میں شامل کرنے سے باز رکھا۔

اقبال کی مثال سے یہ بات سمجھنا آسان ہوگئی کہ نعتیہ مضامین میں شرعی تخلیص (PURITY) کا خیال رکھنا آسان نہیں ہے۔ سرؔو سہارنپوری کا کلام جو شرعی اسقام سے پاک ٹھہرا اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے مضامین پر ان کی گہری نظر تھی۔

شرعی معیارات کے حوالے سے مطمئن ہوجانے کے بعد جب ادبی اور شعریاتی (poetics) پیمانوں سے سرؔو سہارنپوری کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں ان کے کمالِ فن کی داد دینی پڑتی ہے کیوں کہ ان کا بیشتر کلام ادبی محاسن سے لبریز ہے۔

زخمۂ دل کے نعتیہ اور منقبتی قصائد میں قصیدے کے مطلوبہ اجزا یعنی تشبیب، گریز، مدح، حسنِ طلب اور دعا وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں اور وہ ادبی شان بھی نظر آتی ہے جس کی روشنی میں اِن قصائد کو اردو کے معیاری قصائد میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ قصیدہ شاعری کی مشکل

صنف ہے۔اس میں ایک ہی قافیہ کی پابندی ، اور اگر ردیف بھی ہوتو دونوں کی پابندی کے ساتھ ہر شعر کے مضمون کو معنوی ربط دے کر بیان کرنا اور شعری محاسن سمونا ہر کہہ و مہہ کے بس کی بات نہیں ہے۔قصیدے کے لیے شکوہِ زبان کا خیال رکھنا بھی لازمی تھا لیکن محسن کاکوروی کے اجتہاد نے بعد کے شعراء کے لیے وہ شرط ختم کردی۔ یہی وجہ ہے کہ سرو سہارنپوری کے ہاں زبان سادہ وسلیس ہے اور مضامین کا ربط وتسلسل دیدنی ہے۔

قدماء کے قصائد میں صاحبانِ دول و اقتدار کی مدح ملتی ہے۔ اردو میں نعتیہ قصائد لکھنے کا آغاز پہلے صاحبِ کلیات شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۷۲ھ تا ۱۰۲۰ھ) ہی نے کردیا تھا ۔پھر سلطان علی عادل شاہ ثانی ، شاہی(۱۰۴۸ھ تا ۱۰۸۳ھ) نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا ۔نصرتی (م۱۰۸۵ھ) ، شاہ افضل قادری، جنونی گجراتی، ولی دکنی (۱۷۰۷ء) ، آزاد۔سید امیرالدین (۱۲۵۷ھ یا ۱۸۹۰ھ)، مرزا رفیع سودا (م ۱۱۹۵ھ) ، قائم چاندپوری(م۱۲۰۸ھ)، غلام ہمدانی مصحفی (م۱۲۴۰ھ)،حکیم مومن خاں مومن(م۱۲۶۸ھ)، میر نظام ممنون، کرامت علی خاں شہیدی (م۱۲۵۶ھ)، لطف بریلوی(م۱۲۹۸ھ)، امیر مینائی (۱۳۱۸ھ)،محسن کاکوروی(م۱۹۰۵ء) ،مولانا احمد رضا خاں بریلوی(م۱۹۲۱ء) وغیرہم کے قصائد بڑے معرکے کے قصائد ہیں۔ پاکستان میں قصیدے کے احیا کا کام عبدالعزیز خالد نے کیا ، دیگر شعرا میں خالد احمد، فدا خالدی دہلوی، حفیظ تائب ،سروسہارنپوری ، وغیرہم نمایاں ہیں۔

حضرت سرو سہارنپوری کے ہاں نعتیہ قصیدے کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کے قصائد کا بھی اہتمام ہے اس لیے ان قصائد کی ادبی شان اور تاریخی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کیوں کہ بعض ابولہب کے پیروکار، اپنے مذموم عزائم کے باعث، یہ بات کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ دینِ اسلام کی عملی شکل حضورِ اکرمﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد نبوت کے منہاج پر قائم نہیں رہی تھی۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حضورِ اکرم کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی دینی خدمات کا چرچا کرے اور ان کے ایثار و اخلاص

کی خوشبو اپنی تحریروں کے ذریعے عام کرے۔ نعتِ رسولِ مقبول کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے مناقب کا ذکر بھی ضروری ہے جن کی مساعی سے بادِ مخالف میں چراغِ دین نہ صرف روشن رہا بلکہ اس کے صحیح خدو خال محفوظ شکل میں آج تک موجود ہیں اور ان شاء اللہ قیامت تک محفوظ رہیں گے۔

دین کی حفاظت کا یہ انتظام خود حکمتِ ربانی اور مشیتِ الٰہیہ کے تحت عمل میں آیا تھا کہ اللہ رب العزت نے خود ہی فرمادیا تھا: ’’اِنَّانَحنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ‘‘(بے شک ہم نے ہی نازل کی ہے یہ کتابِ نصیحت اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔آیت : ۹، الحجر)۔اس آیت میں قرآن کریم کا ذکرفرما کر اللہ رب العزت نے پورے دین کی حفاظت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ،اصحابِ رسولِ اکرمﷺ کا ذکر بھی حضورِ اکرمﷺ کے ذکر سے متصل ہی کیا ہے۔ سورۂ فتح کی آیت نمبر ۲۹ میں اس طرح فرمایا ہے: ’’مُحَمَّدٌ رَّ سُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ‘‘ (محمد اللہ کے رسول ہیں، اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں)۔یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح نبوت کا منصب اللہ تعالیٰ کی عطا سے نبی علیہ السلام کو ملا تھا اسی طرح صحابیت کے منصب کے لیے بھی اللہ ربّ العزت نے بہترین شخصیات کو چن لیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحابیت کا ذکر تو خود قرآنِ کریم میں بڑے دلنشین پیرائے میں ہوا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت نمبر چالیس میں فرمایا گیا: ’’ ثَا نِیَ ا ثْنَیْنِ اِذْهُمَا فِی الغَا رِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ ‘‘ (جبکہ وہ دونوں غار میں تھے اور جب کہہ رہا تھا وہ اپنے ساتھی سے)۔

اسی لیے جو لوگ دینی شعور رکھتے ہیں وہ نعتیہ شاعری کرتے ہوئے حضورِ اکرم ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ذکر لازماً کرتے ہیں۔ ممتاز حسن مرحوم نے اپنے نعتیہ انتخاب (خیرالبشرﷺ کے حضور میں)میں سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مناقب کو بھی نعت ہی کے طور پر پیش کیا ہے۔زخمہء دل کے اندرونی سرورق پر درجِ ذیل شعر لکھ کر سرو سہارنپوری نے اپنے شعری مسلک ،عقیدے کی

تخلیص (PURITY) اور خیال کی پاکیزگی کا اظہار کردیا ہے:

نبیؐ کی نعت و صحابہؓ کی منقبت کا ہے فیض
کہ حرف و صوت کی خوگر ہوئی زباں میری

اس پس منظر میں جب ہم سرؔو سہارنپوری کے قصائد کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوجاتا ہے کہ ان کے کلام میں شرعی تقاضوں کو بااحتیاط پورا کرنے کے شواہد بھی ملتے ہیں اور فنی دروبست کا شعوری احساس بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا کلام شعریت اور شریعت کے پیمانوں پر خاصی حد تک پورا اترتا ہے۔

زخمہء دل کے نعتیہ قصیدے کا آغاز ''تشبیب'' سے ہوا ہے ۔قصیدے کی تشبیب میں شاعر نے روشنی کے استعارے کے طور پر'' صبح کے تارے کو پیشِ نظر رکھا اور اس کا حوالہ دیا ہے......انسانی سرشت میں یہ بات ودیعت کردی گئی ہے کہ وہ روشنی کو خیر سے اور ظلمت کو شر سے تعبیر کرے۔دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادب میں روشنی خیر ہی کی علامت رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود نور ہے۔اس نے سب سے پہلے جو نور تخلیق فرمایا وہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے محبوب حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا نور تھا۔ پھر آدم علیہ السلام کے مٹی کے پتلے میں اللہ نے اپنے امر سے روح پھونکی ۔انسانی روح بھی اپنے فاعل (اللہ تعالیٰ) کا نوری وصف لیے ہوئے تھی۔آج کی زبان میں بات کرنی چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کی صورت میں ایک HARD WARE تیار کیا اور روح کی شکل میں ایک SOFT WARE اس ہارڈ ویئر میں رکھدیا جس کو اپنے امر یعنی COMMAND سے چالو (BOOT) کردیا۔

اس طرح غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور، اس کا تخلیق کردہ رسولِ اکرم ﷺ کا نور اور آدم کے پتلے میں پھونکا جانے والا نور یعنی امرِ باری تعالیٰ......سب ہی نوری سلسلے کی ایک کڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت میں نور سے محبت کا ایک جذبہ رکھدیا گیا۔

سرؔو سہارنپوری نے 'صبح کا تارا' کہہ کر عالمِ انسانی پر چھائی ہوئی طویل ظلم و بربریت کی رات کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے قصیدے کا آغاز کیا ہے۔مطلع اور چند اشعار ملاحظہ ہوں :

وہ خواب سے بیدار ہوا صبح کا تارا
تاحدِ نظر پھیل گیا نور کا تڑکا
اک رنگِ فعالی ہے ہر اک شے سے نمایاں
جاگی ہے ہر اک چیز میں جینے کی تمنا
ہنستی ہوئی پلکوں پہ شہابوں کا سماں ہے
بجھتی ہوئی شمعیں ہیں نشاں قربِ سحر کا

تشبیب کے ان اشعار سے کسی بڑے واقعے کے ظہور کی نوید مل رہی ہے ۔ایسا واقعہ جس میں انسانی فوز و فلاح کا نوریں سلسلہ قائم ہوگا ۔ شاعر اس واقعے کا ظہور اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور اس کا وجدان اس کی سرشاری کو شعری زبان عطا کررہا ہے۔اس شعری زبان میں زندگی کا حرکی تصور نمایاں ہے۔ اسلام کا پیغام حرکت و عمل ہے اس لیے شاعر نے ابتداء ہی میں ظہور پذیر ہونے والے واقعے کے اثرات یہ دکھائے ہیں کہ کائنات کی ہر شے پر''رنگِ فعالی'' چھا گیا ہے۔ یعنی سوئی ہوئی اور جامد تہذیب مائل بہ حرکت(DYNAMIC S) ہورہی ہے۔ اسی حرکت میں جینے کی تمنا مضمر ہے اور زندگی سے مایوسی کی طویل رات کٹ رہی ہے جس کے آثار بجھتی ہوئی شمعوں کی صورت نمایاں ہیں۔

تشبیب کے اشعار میں انوار کا ایک دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے اور بہار میں پھولوں کی فراوانی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر گریز کی منزل آتی ہے۔ قصیدے میں گریز کی منزل پر شعراء کا امتحان ہوتا ہے۔ سرؔو سہارنپوری نے تشبیب کے بہاریہ آہنگ کو بدل کر حالتِ منتظرہ کے اختتام اور خوش آئند واقعے کے ظہور کا اعلان کرتے ہوئے ظہورِ قدسی کا آہنگ اختیار کیا

ہے:

آمد ہے یہ کس شاہدِ آئینہ نما کی
سکتے میں ہے فطرت کا ہر اک آئینہ خانہ
بیدار ہو بیدار ہو اے روحِ اخوت
خوش باش کہ آتا ہے وہ صدرشکِ مسیحا

اس کے ساتھ ہی نورِ رسالت کے پھیلنے کا مژدہ سنایا جاتا ہے۔

لہرایا وہ تکمیلِ ہدایت کا پھریرا
وہ پھیل گیا نورِ رسالت ﷺ کا سویرا

شاعر نے نورِ رسالت کے پھیلنے کا مژدہ اس خوبی سے سنایا ہے کہ ایک ہی مصرعے میں یہ بات واضح کردی کہ انسانی معاشرے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت بخشی کا جو سلسلہ آدم علیہ السلام کے وقت سے عیسیٰ علیہ السلام تک جاری تھا، اس کی تکمیل حضورِ اکرم ﷺ کے نورِ رسالت کے پھیلنے سے ہوگئی ہے اب قیامت تک صرف اسی نور سے اکتسابِ ہدایت کیا جاتا رہے گا۔ یہاں مجھے علامہ اقبال کا بیان کردہ ایک نکتہ یاد آرہا ہے۔ ختمِ نبوت کے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں:

انسانی فکر کی تاریخ میں اب ہر قسم کا شخصی تحکم جو کسی مافوق الفطرت سرچشمے کا دعویٰ کرتا ہے ختم ہو چکا ہے۔ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک نفسیاتی قوت ہے جو ایسے تحکم کی نفی کرتی ہے۔اس تصور کا وظیفہ انسان کے باطنی تجربے کی حدود میں تازہ مظاہرِ علم کا در کھولنا ہے۔

(تجدیدِ فکریاتِ اسلام۔ص۱۵۶)

سرو سہارنپوری نے جو بات ''تکمیلِ ہدایت'' کے بلیغ اشارے کے ذریعے کہی ہے وہ علامہ اقبال کے بیان کردہ نکات کی روشنی میں زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔تکمیلِ ہدایت کا پھریرا لہرانے میں جواحساس بہجت ہے اس کا ادراک ان حقائق کے جاننے سے گہرا ہے جو

ختمِ نبوت کے ثمرات کے طور پر عالم انسانی کو میسر آئے۔جن میں انسان کے باطنی تجربے کی حدود میں تازہ مظاہرِ علم کا در کھلنے کی نوید بھی ہے۔

لفظوں کے صحیح مفاہیم صرف شاعر پر کھلتے ہیں اور کبھی کبھی شاعر کسی لفظ کو اس طرح استعمال کرجاتا ہے کہ لغت بھی دنگ رہ جاتی ہے۔سرو سہارنپوری نے قصیدے کے تیسرے رکن ''مدح'' کی جانب رخ کیا ہے تو پہلے ہی شعر میں ''اللہ کی تقدیرِ سعادت'' کہہ کر اتنے سے ٹکڑے میں معانی کا خزانہ بھر دیا ہے۔

پوری ہوئی اللہ کی تقدیرِ سعادت
لپکا سرِ فاراں سے وہ اک نور کا کوندا

''اللہ کی تقدیرِ سعادت'' کہہ کر شاعر نے چارلفظی ترکیب میں جہانِ معانی کے آفاق کھول دیئے ہیں۔لغوی اعتبار سے ''تقدیر'' کے معانی ہیں کسی شے کی مقدار کا وہ اندازہ جو خالق نے روزِ ازل اس کے لیے مقرر فرمادیا ہے۔تصوف کی اصطلاح میں تقدیر ''حقائقِ اشیاء کا مع استعدادات کے علمِ حق میں ثابت ہونا'' ہے اور ''سعادت'' کے معانی ہیں ''نیک فالی، نیک اور اچھے اثرات ہونا، خوش قسمتی، اقبال مندی، خوش نصیبی۔تصوف کی اصطلاح میں طلبِ ازلی یعنی جس میں ابتدا ہی سے حق کی طلب رکھی گئی ہو...... اب اللہ کی تقدیرِ سعادت پوری ہونے کے معانی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیائے انسانی کے لیے خوش قسمتی کے جتنے خزانے مقرر فرمائے تھے وہ بطور انعام حضورِ اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد اپنی تکمیلی سطح یا انتہائی بلندی (CLIMAX) پر پہنچ گئے ہیں اور اب سعادت اپنے جملہ مفاہیم کے ساتھ صرف حضورِ اکرم ﷺ کے دامن سے وابستہ ہوکر ہی حاصل کی جاسکتی ہے، ادھر ادھر بھٹکنے سے نہیں ملے گی۔ اس موقع پر قرآنِ کریم کی وہ آیات بھی ذہن میں رہیں جن میں تکمیلِ دین کا اعلان کیا گیا ہے: **(الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا)** (آج میں نے تمہارے دین کوتمہارے لیے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے اورتمہارے لیے اسلام کوتمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا

ہے[۳۔المآئدہ]) اور یہ فرمادیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک دین صرف ''اسلام'' ہے: (ان الدین عنداللہ الاسلام قف) (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے[۱۹ الِ عمران]) تو بات زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔اس طرح شاعر اپنے لفظ لفظ میں عقیدۂ ختمِ نبوت سمو کر یہ بتانا چاہتا ہے کہ عالمِ انسانی کے لیے سعادت کے جتنے خزانے رکھے گئے تھے وہ نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی دنیا میں تشریف آوری کے بعد صرف ''اسلام'' میں مجتمع ہوگئے ہیں اب کوئی شخص، کوئی گروہ، کوئی طبقہء انسانی ، کسی اور جگہ کسی قسم کی سعادت نہ ڈھونڈتا پھرے۔بقول اقبال:

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

(حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیمات کے حصار میں داخل ہوجاؤ۔اگر اس حصارِ سعادت تک نہیں پہنچ سکے تو جان لو کہ دنیا میں صرف کفر ہی کفر ہے)

اس کے بعد قصیدے میں،حضورِ اکرم کی تشریف آوری کے حوالے سے انبیائے ما سبق کی پیش گوئیوں کی طرف تلمیحاتی اشارے ہیں مثلاً

ظاہر ہوئی وہ آہِ براہیمؑ کی تاثیر
شرمندۂ تعبیر ہوا خوابِ تزکیٰ
قالب میں ڈھلی آج نویدِ بنِ مریمؑ
جاگا ہے وہ سویا ہوا دنیا کا نصیبا

یہاں حالی کے مسدس کا وہ حصہ یاد آجاتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا:

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

لیکن سرو سہارنپوری نے صرف حالی کے متن کی تجدید نہیں کی ہے بلکہ تلمیحاتی اشارے میں ''تزکیٰ'' کا ذکر کر کے آیتِ قرآنی کی طرف رہنمائی بھی کردی ہے۔حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی: (**ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیاتک و یعلمھم الکتٰب وا لحکمة ویزکیھم** ط ...... اے ہمارے رب!اور بھیج ان میں ایک رسول ان ہی میں سے جو پڑھ کر سنائے ان کو تیری آیات اور تعلیم دے ان کو کتاب وحکمت کی اور پاک کرے ان [کے دلوں اور زندگیوں]کو[آیت نمبر ۱۲۹ سورۂ بقرہ)۔

حضرت سرّو سہارنپوری کے کلام میں تلمیحات کا نقشہ بڑا واضح ، بڑا گہرا اور نہایت درجہ معنی خیز ہے۔ اس نظامِ تلمیحات نے ان کے کلام کو بڑا بلیغ بنا دیا ہے۔ ان کے ہاں قرآن و احادیث کے حوالے بھی ہیں ، آثار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے نقوش بھی ہیں اورتاریخِ اسلام کے واقعات کی طرف اشارے بھی ہیں ۔اس شاعری کی قراء ت کے دوران میں قاری کا ذہن ، شاعر کے بیان کردہ نکات کی روشنی میں مختلف لونی عکس (SHADES) دیکھتا چلا جاتا ہے۔چند اشعار دیکھیے:

جن ہاتھوں نے کانٹے تری راہوں میں بچھائے
پایا ہے انہوں نے بھی ترے لطف سے حصہ
ان ہاتھوں نے پہنے ترے دربار میں کنگن
جو ہاتھ تھے ماضی میں ترے خون کے جویا
آزادیء افکار سے واقف تھا یہاں کون
احسان ہے یہ بھی تو ترے درسِ وفا کا
یہ جراء ت اظہار ترا فیض کرم ہے
یہ حفظِ خودی تیری عنایت کا نتیجہ

ان اشعار میں تلمیحاتی اشارے دیکھ کر آپ ﷺ کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے لوگوں کے ساتھ آپ کا حسنِ سلوک یاد آجاتا ہے۔ پھر سراقہؓ کے ساتھ ہونے والا واقعہ ذہن کے پردے پر نمودار ہوجاتا ہے، جنہوں نے ہجرت کے راستے میں انعام پانے کے لالچ میں حضورِ اکرم ﷺ کو کفار کے حوالے کرنے کا خواب دیکھا تھا اور جب اللہ کے حکم سے

ان کے گھوڑے کو زمین میں دھنسا دیا گیا تو بالآخر وہ اللہ کے نبی کی عظمتِ شان کا ادراک کرنے اور یہ جاننے کے بعد کہ نصرتِ الٰہیہ آپ ﷺ ہی کے ساتھ ہے، وہیں تائب ہو گئے تھے اور حضورِ اکرم نے کسریٰ کے کنگن ان کے ہاتھوں میں ڈالنے کی پیش گوئی فرمائی تھی جو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں پوری ہوئی۔

اظہارِ حق کی جراءت کے مظاہر سے تو اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ کربلا کا سانحہ ذہن میں لائیے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بڑا بلیغ اشارہ کیا ہے:

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

(حسین رضی اللہ عنہ نے قربانی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ''مسلمان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا غلام نہیں ہے اس کا سر کبھی کسی جابر حکمران کے سامنے نہیں جھکتا) [رموزِ بیخودی ص ۱۷۹]۔

بعد کی تاریخ میں بھی ایسے جری لوگ پیدا ہوتے رہے جن کی مثال دنیا کی تاریخ میں کمیاب ہے۔ مختار مسعود نے لکھا ہے کہ:

''جب شیخ شہاب الدین نے محمد تغلق کو سلطانِ عادل کہنے سے انکار کر دیا تو انہیں ایک مینار پر لے گئے اور بغیر سیڑھیوں کے نیچے اتار دیا''۔ (آوازِ دوست ص ۱۷)۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ:

''بہادر یار جنگ کو جب ایک بار عہدے کی پیش کش ہوئی تو کہا : مجھے کرسیِ وزارت پر بیٹھ کر امورِ مملکت پر غور کرنے کے لیے نہیں بلکہ گردِ کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے''۔ (ایضاً ۸۲)۔

مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں رحمھم اللہ کی عظمتِ کردار اور جراءتِ اظہار کے واقعات سے ہماری تاریخ روشن ہے......اور یہ سب صدقہ ہے اس نبی ءِ برحق

ﷺ کا جس کے افعال، اقوال اور احکامات کو اللہ رب العزت نے دوام عطا فرما دیا ہے۔ جراءتِ مسلم کی اِن روایات کی روشنی میں سَرو سہارنپوری کا محولہ بالا شعر پڑھیے تو جراءتِ اظہار اور حفظِ خودی کے مظاہر کے پس منظر میں تعلیماتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کی روشنی ہی نظر آئے گی۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی بہت اچھے شاعر بھی تھے اور نعتیہ ادب کے پارکھ بھی۔ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' میں بڑے محتاط انداز سے ایک بہت اہم نکتہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''اگر نعت میں کوئی ایسا خیال نظر سے گزرے کہ حضور علیہ السلام کی نبوت صاحبِ احتیاج تھی اور کارِ رسالت ناقص اور ادھورا رہ جاتا اگر فلاں یا فلاں صاحب اعانت سے ہاتھ کھینچ لیتے۔ یعنی کسی صحابی کو ''شریکِ نبوت'' قرار دینے کا خیال اگر کسی نعت و ثنا میں آپ کی نگاہ کا دامن کش ہو تو کیا آپ اسے منافیِ شانِ رسالت اور مخالفِ منشا و مقاصدِ نبوت قرار نہیں دیں گے؟'' (ایضا، ص ۲۳۰)

عاصی مرحوم و مغفور کا پیش کردہ یہ نکتہ جب میں بیدم وارثی رحمۃ اللہ علیہ کے اُس شعر کی روشنی میں دیکھتا ہوں جس میں کہا گیا ہے ''بیدم یہی تو پانچ ہیں مقصودِ کائنات'' اور پھر اس میں حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کو شامل کر لیا گیا ہے'' تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ صوفیانہ شطحیات کا دائرہ، نبوت میں بھی شرکت کی سطح تک پہنچ رہا ہے۔ مجھے یہ شعر بیدم وارثی رحمۃ اللہ علیہ کے دیوان میں تو نظر نہیں آیا، ممکن ہے یہ کسی نے ان سے منسوب کر دیا ہو یا انہوں نے کسی وقت یہ شعر کہہ کر دیوان میں شامل کرنے سے گریز کیا ہو! وجہ جو بھی ہو، یہ شعر قوالی کی محافل میں سکہء رائج الوقت کے طور پر پڑھا جاتا اور صوفیانہ وجد و حال کا موجب بنتا ہے۔

لیکن حلقہء صوفیا میں کبھی یہ نہیں سوچا گیا کہ اس شعر کے ذریعے کس نظریئے کا پرچار کیا جارہا ہے۔ یہاں نبیِ اکرم ﷺ کی ذات کو ''پانچ میں سے ایک'' دکھایا جارہا ہے۔گویا یہ پانچ کی پانچ بزرگ ہستیاں ایک ہی مرتبے اور ایک ہی درجے کی ہیں۔ حالآنکہ احادیث کی روشنی میں'' مقصودِ کائنات''صرف حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات ہے اور اس وصف میں آپ ﷺ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ میرا موقف ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اپنی حاکمیت اور قدرت کے حوالے سے''یکتا'' ہے تو حضورِ اکرم انسانی دنیا میں آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں (جن میں انبیا کرام ، اولیاءِ عظام بشمول حضرت علی رضی اللہ عنہ [جو امت کے سب سے بڑے ولی ہیں] ، صدیقین ،شہدا اور صالحین وغیرہم شامل ہیں) سے ہر اعتبار سے افضل ہیں۔ علاوہ ازیں عصمت اور کائنات کی تخلیق کی غایت کے ضمن میں صرف اور صرف آپ ﷺ ہی کی ذات یکتا ہے۔ اس وصف میں نہ تو کوئی صحابی شریک ہے اور نہ ہی حضورِ اکرم کا کوئی قریبی رشتہ دار ، نہ آل نہ اولاد۔ اقبال نے ختمِ نبوت کا حوالہ بڑے بھرپور انداز سے دیا ہے۔

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

(اے وہ ذات [ﷺ] جس کی آمد کے بعد نبوت شرک ٹھہری، چاہے کسی بھی مفہوم میں ہو! آپ ﷺ نے بزمِ امکاں کو نورِ عرفان سے روشن فرمادیا)۔

[کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی، ص۹۹]

لہٰذا نبی علیہ السلام کے علاوہ کسی کو بھی کوئی ایسا خطاب نہیں دیا جاسکتا، جس میں نبوت کے کسی جزو کا شائبہ ہو۔اس ضمن میں میری کتاب ''ہنر نازک ہے'' کے مضامین ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

اس طولِ کلام کا مقصد یہ ہے کہ میں نے حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اجمعین کے مرتبے کی تفہیم کے ضمن میں حضرت سَرو سہارنپوری کا ایک شعر اپنی ایمانیاتی روشنی

میں بڑا اہم محسوس کیا اور متعدد بار اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

بوبکرؓ و عمرؓ، حیدرؓ و عثماں ترے خادم
اے بعدِ خدا محترم و ارفع و اعلیٰ

یہ ہے وہ عقیدۂ راسخہ ،جس کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مرتبہ نبی علیہ السلام کی ذاتِ والا صفات کے بعد سب انسانوں سے افضل ہے۔لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین بھی تو نبیِ اکرم ﷺ کی صحبت ہی کے طفیل افضل ہوئے ہیں۔اس لیے تمام صحابہ کرام ، نبی علیہ السلام کے خادم ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں ۔ایسی صورت میں ان کی افضلیت کا اعلان کرتے ہوئے نبی ﷺ کے مقام و مرتبے کا خیال رکھنا لازمی ہے کیوں کہ بقول شاعر:

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

اس شعر کا ترجمہ اور تشریح جیسی سید نصیر الدین نصیر گولڑوی نے کی ہے اس کی مثال ہمارے متصوفانہ ادب میں ملنی مشکل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''کائنات میں ہر موجود شے کا اپنا یک الگ مرتبہ اور مقام ہے، لہٰذا جو شخص فرقِ مراتب کیے بغیر ہر موجود شے پر یکساں حکم لگائے ، وہ بے دین اور زندیق انسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اشیاء و اجسام کی ظاہری یکسانیت و مماثلت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ، سب پر یکساں حکم نہیں لگا یا جاسکتا''۔ (نام ونسب۔ص ۲۸۸)

یہاں تک تو سَرو سہارنپوری نے قصیدے کے جزوِ سوم یعنی ''مدح'' تک کا سفر طے کیا تھا۔اب بات شروع ہوئی ہے مدعا و مقصد یا عرضِ مطلب کی ۔عام قصائد میں ممدوح سے کچھ ملنے کی آرزو ہوتی ہے اس لیے اس کی طولِ عمر و اقبال کی دعا کی جاتی ہے۔لیکن نعتیہ شاعری کا آہنگ ہمیشہ''استغاثے'' کا رہا ہے۔ استغاثے کا پہلو بڑا نازک ہے۔اس

میں محتاط شعراء حضورِ اکرم ﷺ کی جناب میں دعا کی درخواست کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے حالؔی نے کہا:

اے خاصہء خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

بعض حضرات اس طرح کے استغاثے کو شرک سمجھتے ہیں۔اس لیے استغاثے کے ضمن میں یہ نکتہ پیش کردینا ضروری ہے کہ شعراء کرام حضورِ اکرم سے اپنی دعا کی قبولیت کے لیے شفاعت کے طالب ہوتے ہیں وہ حضورِ اکرم ﷺ سے براہِ راست دعا نہیں کرتے۔ امام محمد بن الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''حصنِ حصین'' میں ایک دعا ہے جو خود حضورِ اکرم ﷺ نے ایک نابینا شخص کو سکھائی تھی۔ اُس دعا میں حضورِ اکرم ﷺ سے شفاعت طلبی کا آہنگ ہے۔ نابینا شخص نے وہ دعا حضور علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریقے سے کی تو اس کو فوراً بینائی مل گئی تھی۔ دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیُ اَسْأَ لُکَ وَ اَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِحَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِ
الرَّحْمَۃِ یَا مُحَمَّدُ اِ نِّیِ اَتَوَجَّہُ بِکَ اِلٰی رَبِّیُ فِیُ حَاجَتِیُ ھٰذِہٖ
لِتُقْضٰی لِیُ اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْہُ فِیَّ O

(اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی محمد ﷺ کے واسطے سے متوجہ ہوتا ہوں وہ نبی جو رحمت والے نبی ہیں۔اے محمد ﷺ! میں آپؐ کا واسطہ دے کر اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اپنی اس حاجت کے بارے میں تاکہ وہ پوری کردی جائے۔اے اللہ! پس محمد ﷺ کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما!(ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ عن عثمان بن حُنَیفؓ......مستدرک، حاکم وغیرہ)(حصنِ حصین مع ترجمہ وشرح مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری، دارالاشاعت، کراچی۔ص۳۰۲)۔

استغاثے میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور مسلمان معاشروں میں شر کے پھیلاؤ پر غم و غصے کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان تمام خرابیوں کے مٹنے کی تمنا کے ساتھ حضورِ اکرم

ﷺ سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے رب سے مسلمانوں کے اِدبار و زوال کو ٹالنے کی دعا فرمائیں۔مسلمانوں کو کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل ہوجائے اس کے لیے بھی دعا کی استدعا کی جاتی ہے۔اس مرحلے پر شاعر مسلمان معاشرے کی خرابیوں کی بھرپور عکاسی کر کے ''شہرآشوب'' کا نقشہ بنادیتا ہے۔سید مسعود حسن رضوی نے ''شہرآشوب'' کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تیسری اور آخری قسم یہ بتائی ہے کہ وہ ایک ایسی نظم ہے جس میں کسی بھی ہیئت میں کسی شہر کی تباہی اور بدحالی کا بیان ہو۔(شہر آشوب کا فن اور موضوع......مشمولہ نگار اصنافِ شاعری نمبر، سالنامہ ۱۹۶۷ء ص ۳۰۶)۔

پاکستانی معاشرہ بالخصوص اور اسلامی دنیا کا نقشہ بالعموم بیشتر اسلام گریز ماحول کا عکاس بنتا جارہا ہے اس لیے ہر صاحبِ درد شاعر اس معاشرے کی بدصورتی(ugly face) کسی نہ کسی طور اشعار میں دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔نعتیہ قصائد میں حرفِ مدعا لب پہ لاتے ہوئے شاعر اپنے معاشرے کی بدصورتی کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ وہ اسلامی ماحول کی خوبصورتی کے رنگوں کے ذریعے اپنے معاشرے کی تصویرکشی کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔قصیدے کے اس حصے میں سؔرو سہارنپوری نے واقعتاً کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے مطلعِ ایثار و مساوات کے نیر
اب اٹھ کے ترے در سے کہاں جائے گی دنیا
اب کس سے ہو ماحول کی ظلمت کا تدارک
اب تیرے سوا کون یہ ناسور بھرے گا
پھر دورِ جہالت کی طرف پلٹی ہے تاریخ
ہے پیشِ نظر آج وہی رنگ فضا کا
اب قوم پہ وہ سخت گھڑی آئی ہے مولا
جب وقت کے دھارے پہ بہی جاتی ہے دنیا

ایمان کی ضو گردِ مہ و سال میں گم ہے
ہاں حسنِ عمل کا نہیں اب کوئی ٹھکانا
لذت کی صلیبوں پہ ہیں عصمت کے جنازے
معراج پہ ہے وحشتِ انساں کا تقاضا
طاقت ہے فقط حسن و قباحت کی ترازو
دولت کے ذخائر ہیں امارت کا وسیلا
دنیا کی نظر ظلم کو فن جان رہی ہے
ہر جہل کو ہے زعم ، کہ ہے علم کا داتا
بت رکھے ہیں رنگ و نسب و قوم و وطن کے
ہے دامنِ اسلام میں یہ شرک کی دنیا
گو آج بھی الحمد سے تا آیۂ والناس
قرآن کا ہر لفظ ہے اذہاں پہ کندہ
الفاظ اترتے نہیں حلقوم سے نیچے
پیغام پہنتا نہیں اعمال کا جامہ
ہر جبر پہ سلطانیٔ جمہور کا عنواں
ہر جہل پہ علمیتِ قرآن کا سایہ

☆

ہر فسق ''ربوبیتِ قرآں'' کا پیکر
ہر شرک کی پیشانی پہ توحید کا چھاپا
منبر پہ رضا جوئیِ حکام کی ترغیب
مسجد میں ثنا خوانیِ جبروت کا چرچا
ہر عامی و عالم کو بہر رنگ و بہر حال

ہے طاعت و تقلیدِ اولی الامر کا سودا
قرآن کی حکمت کو کہاں جاکے سمجھئے
گم ہوگئے آواز و ترنم میں معانیٰ

ان اشعار میں ہمارے معاشرے کے چہرے پر موجود مسوں اور مہاسوں کی بھر پور عکس بندی کی گئی ہے۔ اشعار کی قراءت یا خواندگی کے وقت،قاری کو شاعر کے قلب میں درد کی لہر ،روح کی بے چینی اور کڑھن کی شدت محسوس ہوتی ہے۔دراصل قصیدے کا یہ حصہ شاعر کی فکر کا ذُروہ یا سنام(Climax)ہے۔ اس لیے مناسب تو یہ تھا کہ اس قبیل کے تمام اشعار یہاں نقل کردیئے جاتے ،لیکن مضمون کی محدودات کے پیشِ نظر چند منتخب اشعار لکھ دیے ہیں۔ ان اشعار میں معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ ، اشارے کیے گئے ہیں۔

زمانے کے احوال بگڑنے کی یہ صورت ہوتی ہے کہ جو معیارات دینی حوالوں سے متعین کیے گئے تھے ان کو سراسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے بلکہ ان معیارات کے برعکس کچھ ایسے معیارات بن جاتے ہیں یا بنادیئے جاتے ہیں جن کوعملی شکل میں دیکھ کر صاف ظاہر ہو کہ یہ دین بیزار ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ معیارات سرکاری سرپرستی میں میڈیا کے ذریعے پھلتے پھولتے اور رواج پاتے ہیں۔ کیوں کہ سرکار دربار میں ''سلطانیٔ جمہور '' کے نام پرحکمرانی کرنے والوں میں بے دین طبقہ غالب رہتا ہے۔ ان تمام احوال کا ذکر سرؔو سہارنپوری کے ہاں بڑی ادبی شان اور فنی مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلا!ایمان کی ضو کا گردِ ماہ و سال میں گم ہونا۔لذت کی صلیبوں پرعصمت کے جنازوں کا اٹھنا،ظلم کوفن جاننا،جہل کوعلم گرادننا، حکام کی رضا جوئی کے لیے منبرِ رسول ﷺ پر ڈھٹائی کے ساتھ جبروتی عناصر کی ثنا خوانی کرنا اور دنیا طلبی کے لیے اولی الامر کے دین سے متصادم احکامات ماننا۔

دینی اصول یہ ہے کہ''اللہ تعالیٰ کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے'' لیکن اسلامی دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص، بیشتر حکام ایسے رہے ہیں اور

ہیں جو اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے بدکردار لوگوں کی پرورش کرتے ہیں اور ہر حال میں اپنے احکامات کی بجا آوری کے خواہاں ہوتے ہیں......پھر افسوس کا مقام یہ ہے کہ ایسے حکام کو ان کی اطاعت کرنے والے عامی اور عالم، سب طرح کے لوگ مل جاتے ہیں۔ اس دکھ کا اظہار سحؔرو سہارنپوری کے آخری شعر میں اس خوبی سے ہوا ہے کہ ان کی قدرتِ کلام اور برہنہ گفتاری کی جراءت پر داد دینی پڑتی ہے۔ واضح کرتا چلوں کہ یہ قصیدہ عہدِ ایوبی میں لکھا گیا تھا جو پاکستان کی تاریخ کا بدترین آمرانہ دور تھا۔

قصیدے میں حسنِ طلب کی صورت میں اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد ممدوح کو دعا دینے کا رواج تھا۔ نعتیہ قصیدے میں ممدوح سے دعا لینے کی استدعا کا قرینہ ہوتا ہے۔

سحؔرو سہارنپوری نے بھی اپنا مدعا پیش کرکے دعاؤں کی درخواست کی ہے:

اس آس پہ آنکھوں میں ضیا ٹھہر گئی ہے
پلٹے کبھی بگڑے ہوئے حالات کا نقشا
اللہ خلافت کا سزاوار بنا دے
ہے ایک یہی قوم کی پستی کا مداوا
اب حد سے سوا ہونے لگی ظلمتِ ماحول
لپکے سرِ فاران کوئی نور کا کوندا
بس اب یہی امید متاعِ دل و جاں ہے
ہاں بس یہی ارماں ہے یہی حسنِ تمنا
کیا پیش کروں سحؔرو حضورِ شہِ بطحا
اک شاعرِ نادارو تہی دست ہوں مولا
فیضِ نظرت دولتِ بیداریٔ قلبم
نذرانہ ہمیں سحؔرو سوئے خواجۂ بطحا

سرو سہارنپوری نے اپنا حسنِ تمنا ظاہر کرکے استغاثے کے انداز میں حضورِ اکرم

ﷺ کی توجہ حاصل کرنے کی استدعا کی ہے اور شفاعت طلبی کے حوالے سے بلیغ اشارہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہا ہے کہ حضورﷺ! آپ کا فیضِ نظر ہی میرے قلب کی بیداری کی دولت ہے۔ اور اپنے طولِ کلام میں دکھ کی داستان کی طرف اشارہ کرکے کہدیا ہے کہ خواجہء بطحا حضرت نبیءِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی جناب میں میرا یہی نذرانہ ہے۔

حضورِ اکرمﷺ کی جناب میں شفاعت طلبی کی غرض سے عرضداشت پیش کرنے کا سلیقہ یہ ہے کہ شاعر اپنا حسنِ طلب چند الفاظ میں اس طرح ظاہر کردے کہ مانگنے کا قرینہ بھی محسوس نہ ہو اور اظہارِ تمنا بھی ہوجائے۔ زخمہء دل کے شاعر کا یہ انداز و اسلوب، مطالعہء قرآن کی دین ہے۔ قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک دعا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں بے یارومددگار پہنچے تھے۔ ان کو نہ تو اپنی منزل معلوم تھی نہ کوئی ٹھورٹھکانہ تھا۔ بھوکے پیاسے بھی تھے اور سفر کی تکان بھی بہت تھی۔ عزتِ نفس ایسی صورت میں بھی برقرار رکھنی تھی چنانچہ کسی سے کچھ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لاچارگی کے عالم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے صرف اتنا کیا ''اے میرے رب! بلا شبہ جو کچھ تو نازل فرمائے میرے لیے ازقسمِ خیر (میں اس کا) محتاج ہوں'' (القصص آیت نمبر۲۴)۔ یہ ہے استدعا کا وہ بلیغ انداز جو مطالعۂ قرآن کے توسط سے سحؔرو سہارنپوری نے سیکھا اور اپنے قصیدے میں اس اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے حضورِ اکرمﷺ کے فیضِ نظر کو اپنے قلب کی بیداری کہہ کر، کوئی سوال کیے بغیر بات مکمل کردی۔ قصیدے کے اس شعر میں ''فیضِ نظرت'' پر جتنا غور کریں اتنا ہی خیرالکلام ما قل و دل (بہترین کلام وہ ہے جو مختصر اور مراد کو ظاہر کرنے والا ہو) کا لطف آتا ہے۔

زخمہء دل میں نعتیہ قصیدے کے بعد خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے قصائد ہیں۔ ان قصائد میں بھی قصیدے کا فنی اہتمام نظر آتا ہے۔ یہاں بھی شاعر نے احادیث وسیئرِ صحابہ اور تاریخ کے اہم واقعات کی طرف تلمیحی اشارے کیے ہیں۔

خیرالخلائقِ بعد الانبیاء علیہم السلام سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں جو

قصیدہ ہے اس کی تشبیب بھی بہاریہ ہے۔ روشنی کے تلازمے اس میں بھی موجود ہیں مثلاً:

یہ موسمِ گُل اور شبِ مہتاب کا عالم
ہے صحنِ چمن نکہت و انوار کا سنگم
تاروں کی اگر چرخ پہ بارات سجی ہے
گلشن کی پھبن بھی تو سہاگن سے نہیں کم

نکہت و انوار کے ذکر میں اسلامی تعلیمات کی خوشبو اور سیرتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نورانیت ضو ریز ہے۔تاروں کی کثرت کے ذکر سے اصحابی کالنجوم والی حدیث کی طرف دھیان جاتا ہے۔گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ طویل اندھیری رات ختم ہوئی اور حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کا ماہتاب اپنی چاندنی بکھیرنے لگا تو صحنِ چمن یعنی زندگی کا باغ نکہت و نور کے ملاپ (BLENDING) سے گلوں کی خوشبو اور نور کی چکاچوند سے ہم کنار ہوا۔پھر آسمان پر نور کے نمائندوں یعنی ستاروں کی بارات سج گئی ۔یعنی صحابہ کرام کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جن کے عمل کی روشنی کو قیامت تک کے لیے غیر فانی بنادیا گیا۔ وہ ایسے ستارے ہیں جو موسم، احوال، فضا ، خطوں اور منطقوں کے امتیاز کے بغیر ہر عہد میں ہدایت کی راہ دکھانے کے لیے جگمگاتے رہیں گے اور ان کی جگمگاہٹ سے دینِ اسلام کے گلشن کی پھبن عروسِ نو کی مثال ہوجائے گی۔

گریز کے مقام پر قصیدے میں ایک شعر آیا ہے جس میں بہار کی جولانی دکھانے کے بعد شاعر کہتا ہے۔

فطرت کا یہ اخلاص، یہ تعظیمِ بہاراں
حقا کہ ہے تیرے لیے اے صدقِ مجسم

یہاں ''صدقِ مجسم'' کہہ کر شاعر نے حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا وہ نمایاں پہلو اجاگر کردیا جس کا اشارہ قرآنِ کریم کی اس آیت میں ہے۔ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ O (اور جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور خود

بھی اس کو سچا جانا، یہی لوگ اہلِ تقویٰ ہیں [یعنی اللہ سے ڈرنے والے پرہیز گار ہیں]) (سورۃ الزُّمَر۔آیت:۳۳)۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیرِ مظہری میں لکھتے ہیں کہ ''کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا :قرآن لانے والے رسول اللہ ﷺ تھے اور اس کی تصدیق کرنے والے حضرت ابوبکر صدیقؓ۔زجاج نے حضرت علیؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں بھی اس طرح آیا ہے)۔

اس طرح گریز ہی کے ایک شعر میں شاعر نے اپنے ممدوح کی صفتِ غالب کا ذکر کردیا۔پھر ایک مطلع ہے جس میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو انبیاء کے بعد سب سے مکرم بتایا ہے جس پر اہلِ ایمان کا اتفاق ہے کیوں کہ قرآنِ کریم میں انبیاء علیہم السلام کے بعد صدیقین ہی کو فضیلت عطا کی گئی ہے:

اے قافلۂ قدس کے سالارِ معظم
اے بعد رسولانِ خدا سب سے مکرم

اس مطلع کے بعد کے اشعار میں تلمیحات کا ایک سلسلہ ہے جس میں شعریت اور قادرالکلامی کا جوہر نمایاں ہے۔حق یہ ہے کہ قرآن و احادیث اور تاریخ و سیَر کے ایسے بیشتر نکات جن کی نسبت حضرت سیدنا صدیقِ اکبر سے ہوسکتی ہے، بڑے دل نشین پیرائے میں معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔ان تلمیحات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا حضورِ انور کے چہرۂ پرنور کو دیکھتے رہنے کی عادت ، آپ کے سینۂ مبارک کا فیضانِ نبوت سے لبریز ہونا، قرآنِ کریم کی ترتیب میں آپ کا کردار، تصدیقِ احادیث میں آپؓ کا مرتبۂ ثقاہت،معراجِ نبوی علیٰ صاحبہاالصلوٰۃ والتسلیم کی تصدیق کا انداز، تصدیقِ رسالتِ محمدی ﷺ کی کیفیت، غارِ ثور کے قیام کے حوالے سے حضرتِ صدیقِ اکبرؓ کی شان میں ثانیءِ اثنین کا قرآنی خطاب، حضورِ اکرم ﷺ کا ......صدیقِ اکبرؓ کو بہرِ امامت منتخب فرمانا، حضرات صحابہ کرام بالخصوص حضرت عثمانِ غنی، حضرت عمر فاروقِ اعظم ، حضرت علی اور حضرت خالد بن ولید رضوان اللہِ تعالیٰ علیہم کا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھرپور تعاون ......غرضیکہ شاعر نے بہت سارے

واقعات، شواہد اور احوال و آثار، اتنے لطیف پیرائے اور فنی چابکدستی سے منعکس کیے ہیں کہ شعری قوت اور بیان کی ندرت دیکھ کر شاعر کی تخلیقی قوت پر رشک آتا ہے۔

عرضِ مدعا کا مرحلہ آیا تو اس قصیدے میں بھی شاعر نے ملتِ اسلامیہ کے اِدبار و زوال کی تصویر کشی کرتے ہوئے اخلاقی کمزوریوں اور دین بیزار ماحول کی عکاسی کی ہے۔ قصیدے کا یہ حصہ شہر آشوب کا اسلوب لیے ہوئے ہے۔ یہاں ساغرِ شعر سے شاعر کا کربِ دروں چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

ہیں ظلمتِ ماحول میں گم تیرے فدائی
فریاد ہے اسرارِ ہدایات کے محرم
بیگانے ہیں اب نام سے بھی صدق و وفا کے
کونین میں کل جن کی صداقت تھی مسلم
دل خون ہے حالاتِ تنزل کے اثر سے
اغیار کے محتاج ہیں کونین کے منعم
سرچشمۂ عرفاں سے ہیں بے نور نگاہیں
کیا کہیے کہ تریاق کی تاثیر ہوئی سم
اربابِ سیاست ہیں نرے نفس کے بندے
اور حاملِ دیں، دست و گریباں ہوئے باہم
احساس پہ طاری ہیں گھٹا ٹوپ اندھیرے
اِدراکِ حقیقت سے بہت دور ہوئے ہم

اس موقع پر مجھے میؔر یاد آگئے جنھوں نے شعر کو سخن کا پردہ بنا کر فن کا ایک محل تعمیر کیا تھا۔ سؔرو سہارنپوری نے نعتیہ اور منقبتی قصیدے ہی کو ''سخن کا پردہ'' بنایا ہے تاکہ قاری ان قصائد کو احساسِ تقدس کے ساتھ پڑھے تو اس کا شیشۂ دل موم کی طرح پگھلنے لگے!......تخلیقی ادب میں لفظ کی تاثیر سے پیغام کی ترسیل میں مدد لی جاسکتی ہے۔ سؔرو سہارنپوری نے لفظوں

کی تاثیر سے پیغام کی ترسیل کا بھرپور کام لیا ہے۔

قصیدے کے آخری جزو یعنی ''دعا'' کے مرحلے پر شاعر نے صرف پانچ اشعار کہے ہیں اور اپنی داستانِ غم و اندوہ مکمل کردی ہے:

فریاد کریں کس سے کہ اے نائبِ اعظم
کوئی بھی نہیں ہے دلِ مغموم کا محرم
اب تیرے وسیلے سے خدا سے یہ دعا ہے
اے قاضیٔ حاجات، خداوندِ دوعالم
صدیقؓ کا صدقہ مرے اللہ پھر اک بار
تکریمِ خلافت سے مسلماں ہوں مکرم
اور سؔرو بھی دربارِ خلافت میں بصد ناز
یہ مطلعِ روشن پڑھے با قلبِ مصمم
یک شاعرِ نادارم و مولا تہی دستم
من نذر کنم داغِ دل و دیدۂ پرنم

سیّدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے قصیدے سے متصل حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا قصیدہ ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب بھی بہاریہ ہے۔ شاعر نے زندگی کے کارواں کو ظلمت سے نور کی جانب رواں دواں دکھاتے ہوئے فنی جمال اور شاعرانہ کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

ہے رنگِ سرافرازی میں ڈوبی ہوئی دنیا
انوارِ مسرت سے افق لال بھبھوکا
فطرت نے مرتب کیا تطہیر کا خاکہ
لو ختم ہوا شب کی سیاہی کا تماشا
تنویر میں ذرے ہیں جوابِ مہ و انجم

سرتا بہ قدم موجہء انوار ہے صحرا
بکھری ہوئی شبنم ورقِ سادۂ گل پر
یا قوت پہ الماس کی تحریر کا نقشا

تشبیب کی لطافت کا بھرپور تاثر قائم ہوجانے پر گریز کا مرحلہ آیا تو شاعر نے تجاہلِ عارفانہ کا کنایہ اختیار کیا:

استادہ ہیں کس کے لیے شمشاد و صنوبر
یہ کس کی قدم بوسی کو بے چین ہے سبزا
کھینچی ہے تصور نے یہ کس بزم کی تصویر
ہر رنگ ہے نیرنگیٔ فطرت کا سراپا
کیا حسن کومنظور ہے تعظیم کسی کی
ہے صبح کی تنویر کہ بکھرا ہوا سونا
آتا ہے چلا کس کے جلو میں یہ اجالا
یہ کون بڑھا لے کے سحر رنگ پھریرا؟

بعد کے اشعار میں تاریخِ اسلام کے بہت سے باب کھلتے چلے جاتے ہیں۔ان اشعار میں شاعر نے استفہامیہ لہجہ اختیار کیا ہے تاکہ اس کے ہر سوال کے جواب میں اس کے ممدوح کی شخصیت کے علاہ کوئی اور شخصیت قاری کے ذہن میں نہ آسکے۔مثلاً انھوں نے روم کی عظمت کی قندیل بجھانے کا ذکر کیا، کسریٰ کی بساط الٹنے کا حوالہ دیا۔حضرت سراقہؓ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنانے اور حضورِ اکرم ﷺ کی معجزانہ پیش گوئی کا ذکر کیا۔شام کی فتح کی طرف اشارہ کیا۔ ہجرت کے وقت اعلانیہ مدینے جانے کی جراء ت کا مظاہرہ کرنے والی شخصیت کی تصویرکشی کی۔حضورِ اکرم ﷺ کی دعاؤں کے نتیجے میں اسلامی لشکر میں شامل ہونے والے سچے مؤمن کا ذکر ہوا۔غرض ہر ہرطرح کا ذکر کرتے ہوئے ایسا قرینہ اختیار کیا کہ سوائے شاعر کے ممدوح حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات کے قاری کے حیطۂ

خیال میں بھی کوئی اور نہ آئے۔اتنے تاریخی حوالے بصورتِ تلمیح دینے کے بعد ایک شعر میں شاعر نے اپنے ممدوح کا لقب استعمال کیا ہے:

وہ پہلی اذاں گونجی ہے محرابِ حرم میں
وہ بجنے لگا جرأتِ فاروقؓ کا ڈنکا

اس کے بعد حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے زریں نقوش کی جانب تلمیحاتی اشارے ہیں جن کا لبِ لباب ان اشعار میں پیش کردیا گیا ہے:

اسلام کی تاریخ ترا دورِ خلافت
ایماں مترادف ہے ترے حسنِ عمل کا
جو عزوشرف ہے سو ترے نام سے منسوب
جو حسنِ عمل ہے سو ترے دور کا حصہ
شامل ترے کردار میں ہر خوبیٔ کردار
داخل تری عادات میں کل حُسن کے اجزا
یہ فکر و نظر ، جرأتِ حق، حلم و تدبر
فاروقؓ کی تصویر کہ مومن کا سراپا
کس دل سے ہم آہنگ ہوئی وحیِ رسالت
قرآن موافق ہوا کس فکرِ رسا کا
ہوتی نہ اگر ختم محمدؐ پہ رسالت
اللہ کی عظمت کی قسم ، تو نبی ہوتا!

اس کے بعد پھر تاریخی حوالوں کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور قصیدے کا مدح والا حصہ اختتام سے ہم کنار ہوتا ہے۔ملاحظہ ہو:

اعجازِ تو ''یا ساریؓا'' عقبےٰ جبلے شو
آواز چہ آواز کہ صدقے دل و جاں را

ہے کفر سے بیزاری کی تصویر تری ذات
منہ بولتا نقشہ ترا پیکر ''رُحَما'' کا

اس کے بعد روئے سخن عرض مدعا کی طرف ہوتا ہے تو یہاں بھی مسلم امّہ کے زوال و اِدبار کا نقشہ کھینچا جاتا ہے اور عرض کیا جاتا ہے :

مدت سے ہے جھلسی ہوئی امید کی کھیتی
اب کشتِ محمدؐ پہ کوئی ابر کا ٹکڑا
ہم تشنہ لبوں کی بھی کبھی پیاس بجھے گی
کب جاگے گا ہم خفتہ نصیبوں کا سویرا

اس کے بعد دعائیہ اشعار پر قصیدے کا اختتام ہوتا ہے۔اس جگہ اللہ رب العزت کی جناب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واسطہ دے کر امت کے حالِ زار کو اِدبار کی گھاٹیوں سے نکالنے کی استدعا کی جاتی ہے:

فریاد! کہ یہ حال تو فاروقؓ کے مولا
ہاں ، ہاں، دلِ بیدار سے دیکھا نہیں جاتا
وہ خون جو محرابِ نبوت میں بہا ہے
ہاں اے مرے اللہ اسی خون کا صدقہ
تکبیر کی آواز پہ پھر کان لگے ہیں
ہاں پھر کوئی فاروقؓ عطا ہو مرے مولا!
ایں سوزِ تمنا کہ متاعِ دل و جانم
من نذر کنم سؔرو ہمیں سوزِ تمنا

اس طرح سؔرو سہارنپوری نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شان میں لکھے گئے قصیدے کا اختتام کیا۔

چوتھا قصیدہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے۔ اس کا فنی دروبست

بھی وہی ہے جو عام قصیدے کا ہوتا ہے۔تشبیب اس قصیدے کی بھی بہاریہ ہے۔تشبیب میں شاعر کا تخیل اس کے جمالیاتی ادراک (AESTHETIC VISION) کے در کھولتا چلا جاتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ عارضِ گل ہیں کہ سحر پھوٹ رہی ہے
یا اوس کے قطروں میں ڈھلی صبحِ بہاراں
اک وجد کی حالت ہے ہر اک پھول پہ طاری
اک کیف کا عالم رگِ ہر خار میں رقصاں
منہ جیسے چھپائے ہو عروسِ شبِ اول
یوں پتوں میں شرماکے چھپی جاتی ہیں کلیاں

اس تمہید کے بعد گریز کا مرحلہ آیا تو شاعر نے اپنے ممدوح کا وصفِ خاص ''حیا'' نمایاں کرتے ہوئے بات کا آغاز کیا :

کیا چوم لیا فرطِ محبت سے صبا نے
کیوں لال بھبھوکا ہے رخِ غنچۂ خنداں
آخر کوئی باعث تو ہے پھولوں کی حیا کا
شاید کہ لبِ سؔرو پہ ہے مدحتِ عثمانؓ

گریز کے بعد ممدوح کی براہِ راست تصویر کشی کی جاتی ہے اور احادیثِ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی روشنی میں تلمیحات کی ایک کہکشاں سجائی جاتی ہے:

چمکے ہیں جہاں عرشِ محمدؐ کے دو اخترؓ
وہ برجِ سعادت ، مرے مولا کا شبستاں
ہر ذرۂ یثرب ترا منت کشِ احساں
تو خاتمِ ایثار ہے اے حاتمِ دوراں

حقا ہے ترا دستِ کرم دستِ رسالتؐ
سمجھا گئی یہ بات ہمیں ''بیعتِ رضواں''
تاریخ سے انکار کی جرأت کسے ہوگی
تو منتظمِ دین ہے ، تو ناشرِ قرآں
یہ شانِ فضیلت ترا مقسوم ہے مولاؓ
قرآن کا اللہ محافظ، تو نگہباں
اس خون کی توقیر کا کیا وصف بیاں ہو
ہر قطرے کا ہو جس کے امیں مصحفِ قرآں
اے سیدِ مظلومؓ ترے خون کی سرخی
اب تک ''فسیکفیکھم اللہ'' پہ چسپاں
وہ پانی کے اک قطرے کو ترسایا گیا حیف!
سیراب کیا جس نے مدینے کا گلستاں

اس کے بعد شاعر نے حدیث ''الصحابی کالنجوم'' کی منظوم تسہیل کا فریضہ انجام دیا ہے :

اے سروؔ یہ سرکارِ دو عالمؐ کا ہے فرماں
احبابؓ مرے مثل ستاروں کے ہیں تاباں
ہر دور میں منزل کا نشاں بن کے رہیں گے
یہ لوگؓ کہ ہیں راہبرِ منزلِ عرفاں
تم ان میں سے جس نور کے سائے میں چلو گے
دشواریاں سب راہ کی ہوجائیں گی آساں
سرکارؐ کے اس قول کو اپنانے کی خاطر
طاعت کو چنا ہے مرے دل نے بھی وہ انساں

معصوم بھی، مظلوم بھی، دامادِ نبیؐ بھی
کافی ہے سہارے کے لیے آپ کا داماں
دربارِ نبوت کے غنیؓ، صاحبِ دو نورؓ
اے خیرِ خلائق بہ خدا بعدِ رسولاںؑ

یہاں واضح کرتا چلوں کہ شاعر نے ''معصوم'' کا لفظ اردو کے عام محاورے کے تحت استعمال کیا ہے ، جس میں کسی بے قصور مظلوم کو ''معصوم'' کہہ دیتے ہیں۔ اہلِ سنت کا عقیدۂ راسخہ یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے بعد حضورِ اکرم ﷺ کے قرابت دار مومنین رضی اللہ عنہما اور اصحابِ کرام رضی اللہ عنہما ''محفوظ عن الخطا'' ہیں ''معصوم عن الخطا''، قطعی نہیں۔ عصمت کا وصف نبی علیہ السلام کی ''نبوت'' کی تکمیل پر ہی ختم ہوگیا کیوں کہ یہ وصف صرف انبیاء علیہم السلام کے لیے مخصوص تھا۔

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے قصیدے میں مدح کا حق ادا کرنے کے بعد عرضِ مدعا کی طرف رخ مڑتا ہے تو شاعر پر پھر امت کی مریضانہ کیفیت کا اثر ہوتا ہے اور درد کی لہر اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس مرحلے پر شہر آشوب کا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے :

ڈھل جائے نہ کیوں سازِ اذاں سوزِ فغاں میں
جب منبر و محراب کا کوئی نہیں پرساں
اس دور میں اسلام ہے ڈھلتا ہوا سورج
ایمان کی ضو جیسے چراغِ تہِ داماں
سلجھیں گے نہ تقدیر کے الجھے ہوئے گیسو
آئیں گی نہ کیا لوٹ کے گزری ہوئی گھڑیاں
کیا نکبت و اِدبار کے بادل نہ چھٹیں گے
کیا جوش میں آئے گی نہ اب رحمتِ یزداں

مرحلۂ عرضِ حال کے بعد دعا کا ہنگام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے حضور، حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے واسطے اور وسیلے سے اپنی عرضداشت پیش کی جاتی ہے:

آنکھوں میں اسی آس پہ دم اٹکا ہوا ہے
ہو جلوۂ ماضی خطِ فردا سے نمایاں
صدقہ ملے عثمانؓ کے خوں کا مرے اللہ!
ہاں عظمتِ دیرینہ ہو پھر سلسلہ جنباں
ہو دینِ محمدؐ کی نمو شرق سے تا غرب
آباد ہو اسلام کا اجڑا ہوا بستاں
عالم میں ہو جب حقِ مبیں غلغلہ ساماں
پھر سَرو کے ہونٹوں پہ بھی ہو مدحتِ عثماںؓ
چہ تابِ ستائش کہ غریبِ عجمیم
قلبے کہ متاعم ہمیں نذرانہء سلطاںؓ

پانچواں قصیدہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب بھی بہاریہ ہے اور خوب ہے:

بیدار ہوا خواب سے عالم کا مقدر
آتا ہے نظر طور کے انوار کا منظر
پھولوں پہ لپکتے ہوئے شعلوں کا گماں ہے
ہر قطرۂ شبنم ہے مچلتا ہوا اختر
ہے فرشِ زمرد کہ لہکتا ہوا سبزہ
یہ گل ہیں کہ یاقوت کے ترشے ہوئے پیکر

بہاریہ نقشہ دکھانے کے بعد گریز کی طرف آتے ہوئے شاعر بے ساختہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حوالہ دے کر ممدوح کی مدح کی طرف آجاتا ہے:

شیرینیٔ توصیف سے لب قندِ مکرر
جاری ہوئی ہونٹوں پہ مرے مدحتِ حیدرؓ

اور مدح کے مرحلے پر اس طرح کے اشعار سامنے آتے ہیں:

ہاں وہ مرا ممدوح کہ ہے مطلعِ انوار
وہ حیدرِ کرار، وہ دامادِ پیمبرؐ
آتی ہے چلی فتح مبیں جس کے جلو میں
مقسوم ہوئی جس کے لیے نصرتِ خیبر
معلوم ہو کچھ زورِ ید اللّٰہی کا احوال
پوچھو تو ذرا کیفیتِ مرحب و عنتر
میراثِ نبوتؐ چو شود روشنیٔ علم
حقا کہ تو ایؓ وارثِ میراثِ پیمبرؐ
کھلتے ہیں ترے نام سے اسرارِ ولایت
چلتے ہیں ترے ساتھ ہدایات کے لشکر
منسوب ترے نام سے ہر خیلِ ولایت
سرخیلِ ولایت ہے تو اے رشد کے پیکر

حسنِ طلب کے مرحلے پر ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کا بیان ہے :

ہاں اے مرے مولاؓ، مرے آقاؓ، مرے سرورؓ
کچھ کہنے کو بے تاب ہوا ہے دلِ مضطر
اب قوم کس احوال سے دوچار ہوئی ہے
کس طرح بیاں کیجیے اے قوم کے رہبر
اس درس کو اربابِ صفا بھول گئے ہیں
جو درس کہ ارشاد ہوا تھا سرِ منبر

وارث ہیں ترے عدل کی میراث سے محروم
فریاد ہے اے مطلعِ انصاف کے نیر
اب کوچہء و بازار میں بکتا ہے ترا نام
کردار سے محروم ہیں گفتار کے خوگر
اب صدق و صفا کذب کے ساحل پہ کھڑے ہیں
اب مصلحت اندیشی ہے حق گوئی سے بڑھ کر
مقتل نظر آتا ہے ہر اک کوچہء و بازار
ہاں اپنے ہی سینے ہیں یہاں اپنے ہی خنجر
مولاؑ! یہ ترے سجدۂ اخلاص کے مداح
ہر نظمِ اطاعت سے ہوئے جاتے ہیں باہر
خاکم بدہن بات بنائے نہ بنے گی
ایماں کا دیا تند ہواؤں کی ہے زد پر
بیداریٔ دل کربِ مسلسل کی امیں ہے
آتی ہے ہر اک سانس جہنم سے الجھ کر

عرضِ حال کے بعد دعا کا ایک شعر ہے :

ہاں خستگیٔ احساس سے خوں جمنے لگا ہے
دے پھر مرے مولا ، کوئی ہم سیرتِ حیدرؓ!

اس قصیدے میں دعا کا ایک شعر لکھ کر شاعر نے حضرتِ علی کرم اللہ وجہ الکریم سے مخاطب ہوکر عجزِ مدح کا ذکر کیا ہے اور آخری شعر قصیدے کے عام مزاج کے برعکس بصورتِ مطلع لکھا ہے جس کے قوافی اور ردیف مختلف ہیں۔ یہ دونوں اشعار فارسی میں ہیں:

مدحت چہ کنم سرو کہ تابے نہ توانے
نازم بہ نیازے کہ گدائے درِ حیدرؓ

سوزِ دل صد پارہ کہ فیضِ نگہِ تست
فیضِ نگہِ تست، ہمیں نذرِ رہِ تست!

یہ ہے قصیدوں کا وہ شہرِ فن جس کی میں نے کچھ دیر سیر کی ہے اور اپنی اس سیر کے دوران میں یہ کوشش کی ہے کہ جمال فن کے مشاہدے سے جو تاثر قائم ہوا ہے اس کی ہلکی سی جھلک آپ کو بھی دکھا دوں!

بات یہ ہے کہ فن کا جمال بیان کرنے سے نہیں بلکہ اس کے براہِ راست مشاہدے سے کھلتا ہے۔ تنقیدی عمل میں نقاد تو فن کے صرف چند پہلوؤں اور باریک نکتوں کی طرف اشارے کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ تاہم تنقیدی عمل میں نقاد کی یہ آرزو پوشیدہ ہوتی ہے کہ قاری سے فیضؔ کی زبان میں کہہ سکے :

وہ تو وہ ہے تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو!

قصائد میں شعراء اپنی قادرالکلامی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ دنیاوی شخصیتوں کے قصائد میں فن کا جمال دکھانے سے کچھ فوائد کے حصول کا امکان ہوتا ہے۔لیکن مذہبی شاعری میں یہ زورِ کلام ،اُخروی فائدے حاصل کرنے کی غرض سے دکھایا جاتا ہے۔ اور معاشرے کی بدصورتی کا نقشہ دکھانے اورزوال ٹالنے کی تمنا کے اظہار میں یہ تمنا اور امید بھی مضمر ہوتی ہے کہ خیال کی ترسیل سے معاشرے کے سدھار کا کوئی پہلو نکل آئے!......ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ شاعر مرحوم کے افکار پورے عالمِ اسلام میں پھیل جائیں اور امتِ مسلمہ کے لیے سدھار کی راہیں آسان ہوجائیں، کیوں کہ خیال یا فکر ہی عمل کے لیے تخم کا حکم رکھتا ہے۔ شعراء، ادباء، دانشور اور مفکرین ، سب کے سب ، انسانی ذہنوں میں افکارِ تازہ کے بیج ہی تو بوتے ہیں ۔ ثقافتی عمل میں یہ بیج انسانی معاشروں میں سوچ کی یکسانیت ، عادات کی ہم آہنگی اور اجتماعیت کے میدان میں ثقافتی مظاہر کے یک رنگ پھول کھلاکر وحدتِ فکر وعمل کی فصل تیار کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ کاش ہمارے معاشرے میں نعتیہ آہنگ کی یکسانیت سے

اجتماعیت پیدا ہوسکے اور اقبال کے بقول پھٹکا ہوا آہو پھر سوئے حرم آجائے!

زخمۂ دل میں شامل نعتیں سب کی سب غزل طور لکھی گئی ہیں۔ ان نعتوں میں بھی خیال کی پاکیزگی اور اظہار کی نفاست نمایاں ہے۔ نعتیہ غزلوں سے شاعر کے وجدان پر غالب؛ موضوع کی عظمت کا خیال اور غزل کی مقتضیات کا فنی ادراک مترشح ہے۔ان نعتیہ غزلوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا وقت نہیں ہے۔ قلبِ مہجور کی تڑپ کی شدتِ احساس ملاحظہ ہو:

ہر ایک دھڑکن پہ اب تو دل کی گماں یہ ہوتا ہے سؔرو جیسے
مجھے وہ آواز دے رہے ہیں' غلام آئے غلام آئے!

غزل کی چھوٹی بحر میں معنوی بے کرانی کا احساس ہوتا ہے۔ چھوٹی بحر میں شاعری کرنا اور معنوی بلندی کو چھو لینا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن سؔرو سہارنپوری نے بحرِ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف الآخر یعنی مفعول۔مفاعلن۔فعولن، میں کمال کی نعت کہی ہے۔ ذرا اس مترنم نعت کی قراء ت کیجیے اور شعریت کے بحرِ بے کراں میں فضائے معنویت کی وسعت کا اندازہ فرمایئے:

تجھ سے ہے بہارِ جانِ عالم
اے چارۂ بے کسانِ عالم
تو اصلِ بنائے خلق ٹھہرا
تو عزووقار وشان عالم
سدرہ ترے خادموں کا مسکن
اے خواجۂ خواجگانِ عالم
مہکی نہ تھی بوئے خُلق جب تک
ویران تھا گلستانِ عالم
جب تک ترے ذکر سے تہی تھی

بے رنگ تھی داستانِ عالم
تارے ترے ہمرکاب آئے
اے صاحبِ کاروانِ عالم
قطرے ترے فیض سے سمندر
اے منعم و مہر بانِ عالم
ذرے ترا نام لے کے اٹھے
اور بن گئے کہکشانِ عالم
اک تیری نظر سے ہوگئے ہیں
بے نام و نشاں ، نشانِ عالم
در پر ترے آ کے جھک گئے ہیں
کیا کیا سرِ سرکشانِ عالم
بھٹکے گا شعور مدتوں تک
معراج ہے امتحانِ عالم!

یہ نعت ،اردو نعتیہ ادب میں اپنی معنوی وسعتوں اور مترنم بحر کی وجہ سے نمایاں رہے گی! غزل کی ایمائیت ہماری تمام اصنافِ سخن میں جدا گانہ اور اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اس نعت میں بھی تلمیحات کم ہیں لیکن لفظوں کے استعمال نے اس میں معنویت کی وہ اشاریت پیدا کردی ہے کہ سنجیدہ قراء ت سے ایک جہانِ معانی کھلتا جاتا ہے۔ ذرا تاروں کا صاحبِ کاروانِ عالم کے ہمرکاب ہونے کو حضورِ اکرم ﷺ کی معیت میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی موجودگی کے تصور سے ہم رشتہ کر کے دیکھیے! معراج ہے امتحانِ عالم!......کی بلاغت پر غور فرمایئے! میر نے کہا تھا؎

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

یہاں ''دہر'' کو'' جہانِ فن'' تصور کیجیے!............ذرا اس شعر کی معنویت پر غور فرمائیے:

جِلا بخشی ہے اُس نے یوں ضمیرِ آدمیت کو
نسیمِ صبح آ کے جیسے غنچوں کی زباں کھولے

ضمیرِ آدمیت، ایک آئینہ ہے جس پر زنگ چڑھ گیا ہے اور اس میں انسانیت کے صحیح خط و خال نظر نہیں آ رہے ہیں۔ انسان کے صحیح خط و خال اس کی فطرتِ صحیحہ ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے یعنی ''اسلام''۔ اس مفہوم کی ایک حدیث بھی ہے کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کے سپرد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے قلوب کے زنگ دور کرنے کا فریضہ رکھا تھا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے [۱] تلاوتِ آیاتِ ربانی [۲] تزکیۂ نفس [۳] تعلیمِ کتاب [۴] تعلیمِ حکمت (آیت ۱۵۱ البقرہ) کے ذریعے انسان کے ضمیر پر چڑھے ہوئے زنگ کو اتارا تب انسان کے دل کے آئینے میں اپنا اصلی چہرہ (اچھے انسان یا مسلمان کا چہرہ) نظر آیا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنا فرضِ منصبی کس طرح ادا کیا۔ جبر وظلم سے؟......قطعی نہیں۔ بلکہ اپنے اخلاق و کردار کی خوشبو پھیلا کر!!! چنانچہ شاعر نے جمالیاتی پیرایۂ بیاں اختیار کیا......

ع نسیمِ صبح جیسے آ کے غنچوں کی زباں کھولے

اس مصرعے کی بلاغت پر غور کرنے سے قاری پر شعری جمالیات اور حسن کارانہ بیان کی پرتیں کھلتی ہیں۔

زخمۂ دل میں مزید نعتیں بھی ہیں جن کی خواندگی سے شاعر کے فکر و فن کی ضو، قاری کے ذہن سے قلب تک پہنچتی ہے۔ نعتیہ شاعری میں حضورِ اکرم ﷺ کا سراپا لکھنا شاعر کے لیے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جس کے اوصافِ حمیدہ کا احاطہ ممکن نہیں ہے اس کے سراپا کو حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے قادرالکلام شاعر جو حضورِ اکرم کے منتخب کیے ہوئے اور نوازے ہوئے شاعر تھے وہ بھی اس سے زیادہ نہیں لکھ سکے:

واحسن منک لم تر قط عینی
میری آنکھوں نے کبھی آپ سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا
واجمل منک لم تلد النساءُ
عورتوں نے آپؐ سے زیادہ کوئی صاحبِ جمال نہیں جنا
خُلقت مبراءً مّن کلِ عیب
آپؐ کو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے
کانک قد خلقت کما تشاءُ
جیسے آپؐ اپنی مرضی کے مطابق پیدا کیے گئے ہوں

لیکن حضورِ اکرم ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد سے قیامت تک آنے والے شعراء کے لیے حضورِ اکرم ﷺ کے شمائل شریف کا بیان ان تمام معلومات کی بنیاد پر قائم ہوسکتا ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے مہیا فرمائی ہیں۔ سرو سہارنپوری نے بھی احادیث کے مضامین کی روشنی میں حضورِ اکرم ﷺ کا سراپا لکھا ہے۔ سراپا کے بیان میں شاعر نے اپنی شاعری کا مافیہ تو روایت سے اخذ کیا لیکن شعری معیار اپنا رکھا۔

بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف الآخر (مفعول مفاعلن فعولن...... بحرالفصاحت حصہ دوم، ص۱۲۰............احسان اللہ ثاقب ص۹۷) بڑی مترنم بحر ہے جس میں بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ سؔرو سہارنپوری نے ''سراپا'' لکھا ہے۔ یہاں انہوں نے شعری جمالیات کا خاص خیال رکھتے ہوئے مختلف تشبیہات کے سہارے سراپا کا بیان کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ماتھا ہے کہ صبح کا اجالا
عارض ہیں کہ رشک رنگ لالہ
آنکھوں میں سما گئے ہیں خورشید
ابرو کا ہے زاویہ نرالا

تشبیہ و مثال و استعارہ

وہ سب سے سوا ہیں، سب سے اعلا

ان اشعار میں بحر کا ترنم، الفاظ کی مناسبت، خیال کی پاکیزگی اور سراپائے رسول ﷺ کا بے داغ تصور موجود ہے جس نے اس شعری عمل کو اعلیٰ شاعری کا نمونہ بنادیا ہے۔ جمالِ یوسفی (علیہ السلام) بڑا مشہور ہے۔ لیکن حضورِ اکرم ﷺ کا جمال ہر اعتبار سے ہر نبی کی وجاہت سے فزوں تر ہے۔ اس لیے شاعر نے چشمِ تصور سے کام لیتے ہوئے بیان کیا:

دیکھا جو جمالِ مصطفائی
یوسف نے بھی اپنا دل سنبھالا

حضورِ اکرم ﷺ کا جمال معنوی کس پیرائے میں عکس بند ہوا ہے:

امی ہیں پر ان کی ذاتِ عالی
ہر علم کا مستند حوالا
وہ فرد بہ فرد ایک پیغام
وہ عہد بہ عہد اک اجالا
دنیا کے لیے نظیرِ اخلاق
سیرت کی ادا ادا حوالا

حضورِ اکرم کا فیضانِ نظر کس خوبی سے شعری حسن میں ڈھلا ہے:

ہاں ان کی نظر سے فیض پاکر
انسان ہوا بلند و بالا
در ان کے بھی باز ہو رہے ہیں
تھا جن کے نگاہ و دل پہ تالا

حضورِ اکرم ﷺ کی سراپا نگاری کسی بھی عہد کے کسی شاعر کے لیے آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کاوش میں ہر شاعر اپنے آپ کو عاجز پاتا ہے۔ سرو سہارنپوری نے

بھی اپنی نظم سراپا کو تین اشعار کہہ کر مکمل کردیا ہے۔ ان اشعار میں تاریخ میں محمد رسول اللہ ﷺ جیسا کسی اور کو نہ پانا...... حضورِ اکرم ﷺ کا سراپا بیان کرنے کے لیے امِ معبدؓ کا نطق پانے کی تمنا کرنا...... اور شاعر کا اپنی شاعری کے ذریعے دربارِ نبی علیہ السلام تک پہنچ جانے پر اپنے نصیب پر رشک کا مضمون باندھا گیا ہے:

پایا نہ کوئی بجز محمدؐ
تاریخ نے خوب دیکھا بھالا
مل جائے جو نطقِ امِ معبد
شاید کہ ہو نعتِ شاہِ والا
دربارِ نبیؐ تک آ گیا ہے
ہے سرو بڑا نصیب والا

زخمۂ دل میں شامل چار سلام بھی ہیں جو سب کے سب خلفائے راشدین کے حضور پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں مجھے ایک وضاحت کردینی چاہیے۔ شعری اصناف میں ''سلام'' اس نعتیہ یا منقبتی نظم کو کہتے ہیں جس میں کہیں نہ کہیں شاعر نے اپنے ممدوح کے حضور واضح الفاظ میں سلام پیش کیا ہو۔ جیسے سروؔ سہارنپوری نے کیا ہے، مثلاً

سلام اس پر نبوت نے جسے صدیق فرمایا...... یا
سلام اس پر نبوت نے جسے فاروق فرمایا...... یا
سلام اس پر جو دربارِ رسالت میں غنی ٹھہرا...... یا
سلام اس پر کہ کعبہ میں ولادت کا شرف پایا

لیکن آج کل غلطی سے ''سلام'' صرف حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق منقبت کو کہا جانے لگا ہے، چاہے اس منقبت میں شاعر نے ''سلام'' پیش کرنے کا قرینہ رکھا ہو یا نہیں...... لہٰذا اصنافِ سخن کی ہیئتی صحت برقرار رکھنے کے لیے یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا از بس ضروری ہے کہ ''سلام'' صرف اس نعتیہ یا منقبتی نظم یا غزل کو کہا جائے جس میں ''سلام'' کا

قرینہ ہو۔سلام کی وضاحت کے بغیر جو منقبت کہی جائے اس پر صرف منقبت کا عنوان دیا جائے۔چاہے وہ کسی بھی بزرگ کی منقبت ہو! ......مجھے سَرؔو سہارنپوری کا یہ اصلاحی انداز بہت پسند آیا۔ انہوں نے خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے حوالے سے منقبتی نظموں کو ''سلام'' کا عنوان دے کر ان نظموں میں ''سلام'' پیش کرنے کا قرینہ رکھا ہے۔اس طرح عملی طور پر ایک صنفِ سخن کا تشخص بحال کرنے کی بنا ڈالی ہے۔

سَرؔو سہارنپوری کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''ثنائے خواجہ'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔اس نعتیہ مجموعے میں شاعر نے نعتیہ آہنگ کو غزل کے روپ میں ڈھالا ہے۔غزل میں شاعر کی داخلیت ،نرم آہنگی،عشق کی حرارت، اظہار کا سلیقہ اور دو مصرعوں کی محدود یت میں جہانِ معانی سمونے کا عمل قابلِ لحاظ ہوتا ہے۔ عام طور پر قصیدہ گو شعراء غزل کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوتے کیوں کہ ان کا مزاج لفظوں کے بھاری بھرکم پن کو برتنے سے مطابقت رکھتا ہے اور غزل شیریں گفتاری کی متقاضی ہوتی ہے۔قصیدہ گو شعراء سودا کی طرح گھن گرج اور استادی کے پینتروں سے لبریز شعر تو کہہ لیتے ہیں لیکن میرؔ کی طرح غزل کا دھیما پن اور سوزشِ قلب کی تجسیم والا عمل شعر سے ظاہر نہیں کرسکتے۔لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔بعض شعراء قصیدہ اور غزل کہتے وقت دونوں اصناف کے مزاج اور تقاضوں کو نباہنے کے اہل ہوتے ہیں۔ سَرؔو سہارنپوری بھی غزل طور لکھی گئی نعتوں سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ قصیدے کی گراں بار لسانیت اور استادانہ فنکاری سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ غزل کے مزاج کی لطافت سے بھی نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ اس کو برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں......ملاحظہ ہو:

نہ جانے کب سے اس آرزو میں چراغ پلکوں پہ جل رہے ہیں
کبھی مدینے میں صبح گزرے کبھی مدینے میں شا م آئے
بجز متاعِ امید کچھ بھی نہیں ہے سرکارؐ پاس اپنے
زہے مقدر کہ یہ متاعِ امید ہی میرے کام آئے

حضورؐ میں بھی بس اک نگاہ نجات ساماں کا منتظر ہوں
بس اک نگاہِ نجات ساماں ادھر بہ لطفِ تمام آئے
ہر ایک دھڑکن پہ اب تو دل کی گمان ہوتا ہے سَرؔو جیسے
مجھے وہ آواز دے رہے ہیں غلام آئے غلام آئے

بحر متقارب مثمن مقبوض اثلم (فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن......

بحرالفصاحت حصہ دوم ص۱۶۹۔احسان اللہ ثاقب ص۱۲۹) کی سولہ رکنی بحر غزل کے لیے بڑی پسندیدہ بحر ہے۔قدماء نے یہ بحر بہت استعمال کی ہے۔ سَرؔو سہارن پوری نے اس نعتیہ غزل میں اپنی پاکیزہ آرزوؤں کی کہکشائیں سجائی ہیں۔ ہجرِ مدینہ میں پلکوں پہ چراغاں کا روایتی اظہار بھی اس نعت میں موجود ہے۔سَرؔو کی شاعری میں نئی نئی تراکیب بھی ہیں اور ان کی تکرار بھی ۔اس تکرار سے اسلوب میں تازگی اور اظہار کی طرفگی میں اضافہ ہوا ہے۔ دیکھیے کس خوبی سے اشعار میں متاعِ امید اور نگاہِ نجات ساماں کی تکرار کی گئی ہے۔

یہاں ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ پوری نعت ایک سلکِ خیال سے جڑی ہوئی ہے۔ ہر شعر الگ الگ بھی اپنی معنویت روشن کررہا ہے اور دوسرے اشعار سے بھی معنوی رشتہ قائم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔محولہ بالا اشعار میں پہلا شعر مدینے پہنچنے کی آرزو کا عکاس ہے اور دوسرے شعر میں وہاں پہنچنے کی امید کا گہرا رنگ جھلک رہا ہے ۔اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں اپنی آرزو پوری ہونے کا امکان روشن تر کرنے کے لیے شاعر نے حضورِ اکرم ﷺ سے شفاعت طلبی کا آہنگ اختیار کرتے ہوئے براہِ راست اظہارِ تمنا کرنے کے بجائے ''زہے مقدر'' کہہ کر اپنے ما فی الضمیر کی طرف صرف اشارہ کردیا ہے ۔اس شعر میں رجائیت اپنے عروج پر ہے۔ پھر شاعر اپنی امید کا رجائیت آمیز اظہار کرنے کے بعد تیسرے شعر میں حضورِ اکرم ﷺ سے براہِ راست درخواست کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ میں اک نگاہِ نجات ساماں کا منتظر ہوں ......کاش آپ کی نگاہِ نجات ساماں میری طرف بھی بہ لطفِ تمام متوجہ ہوجائے!......اپنی آروؤں کا تخم بونے کے بعد شاعر کو آرزوؤں کے چمن میں ثمرات نظر

آنے لگتے ہیں اور وہ برملا کہہ اٹھتا ہے کہ مجھے تو یہ گمان ہو رہا ہے کہ آقائے نامدار ﷺ مجھے حاضری کا پروانہ عطا فرما رہے ہیں۔ ''غلام آئے غلام آئے'' میں الفاظ کی تکرار حاضری کی تمنا پوری ہونے میں تعجیل کا اشاریہ بنی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ غزل طور لکھی ہوئی نعت، ایک نظم کا منظر نامہ بناتی ہوئی تکمیلیت کی طرف بڑھتی ہے اور آرزو پوری ہونے کی نوید پر ختم ہوتی ہے۔

سؔرو سہارنپوری کو بحرِ ہزج مثمن مقبوض کے استعمال پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ دیکھیے اس رواںدواں بحر (مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن......بحرالفصاحت حصہ دوم ص۱۰۹) میں کیسے کیسے اشعار نکالے ہیں:

کھلی ہوئی کتاب ہے یہ ان کی ساری زندگی
کہ لفظ لفظ نور ہے تو حرف حرف روشنی
اطاعتِ خدا انھی کی پیروی کا نام ہے
انھی کے راستہ سے انحراف ہے یہ گمرہی
ہمارے پاس کیا ہے ایک ان کے نام کے سوا
مگر یہ ان کا نام ہے! کہ زندگی ہی زندگی
یہ فضلِ خاص ہوگیا کہ ہم بلا لیے گئے
خدا کو بھا گئی ہماری عاجزی و بیکسی

اس نعت کی خواندگی میں قاری کو نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی نغمگی میں پیغامِ عمل اور اصلاحِ احوال کا اشارہ بھی موجود ہے۔ اللہ کی اطاعت صرف نبی کے طریق پر چلنے سے ہوسکتی ہے۔ اس راستے سے ہٹ کر سب کچھ گمراہی ہے۔

''ثنائے خواجہ ﷺ'' میں کچھ کلام وہ بھی شامل ہے جو ''زخمہء دل'' میں شائع ہوچکا تھا اس لیے کچھ اشعار پہلے بھی حوالوں میں آچکے ہیں۔ میں ایک بات پر آپ کی توجہ مبذول کروانے کے ساتھ ہی رخصت چاہوں گا۔ وہ بات یہ ہے کہ عجز بیاں، مقامِ رسالت مآب

ﷺ کے انسانی فکر وخیال سے ماورٰی ہونے کا مضمون اور نعت کہنے کی توفیق ملنے پر اظہارِ مسرت و تفاخر بہت سارے نعت گو شعرا نے کیا ہے لیکن جس تکرار کے ساتھ سؔرو سہارنپوری نے تحدیثِ نعمت کا شعار اپنایا ہے، شاید ہی کسی نے ایسا کیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نعت کہنے کی سعادت پالینے کے بعد سؔرو کو کوئی بڑی نعمت مل گئی تھی جس کا اظہار صرف علامتی شکل میں ''نعت'' کے حوالے ہی سے قلم بند ہوسکتا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

منصبِ نعتِ رسالت ہی مرا اعزاز ہے
اس حوالے سے ہی قرطاس و قلم اچھے لگے
جب سے ہے نعت کا فیضان کہانی میری
شام تا بندہ ہے اور صبح سہانی میری
ان کی توصیف مگر آبِ بقا ٹھہری ہے
مجھے تسلیم کہ یہ عمر ہے فانی میری
وہ ثنا خوانِ رسولِ عربی ﷺ آتا ہے
یہی محشر میں ہو اے کاش نشانی میری
سعدی و جامی و قدسی نہ سہی سرو مگر
نسبتِ نعتِ محمد ہے نشانی میری
نعت گوئی کی جب ابتدا ہوگئی
شاعری میری قبلہ نما ہوگئی
نعت گوئی مرا مشغلہ بن گیا
یہ عبادت مرا آئینہ ہوگئی
سؔرو سعدی نہ جامی نہ عطار تھا
پھر بھی نعتِ رسولِ خدا ہوگئی
صلہ ہے عشقِ مصطفیٰ کا سؔرو نعتِ مصطفیٰ

یہ میرا دورِ شاعری ہے اب ثواب کی طرح
زندگی جب سے مری نعت کے فیضان میں ہے
ایک تسکین کا عالم ہے کہ وجدان میں ہے
سرؔو یہ تمنا ہی حاصلِ تمنا ہے
یاد میں کیا جاؤں نعت کے حوالے سے
مجھے حاضری کا شرف ملا مجھے ذوقِ نعت عطا ہوا
مرے حال پر یہ ترا کرم بہ لحاظِ بے سببی بھی ہے
یہ خیال آیا تو کانپ اٹھا یہ شعور پایا تو گم ہوا
تری نعت گوئی کا ادعا بڑی حوصلہ طلبی بھی ہے
ملا ہے سرؔو مجھے منصبِ ثنائے رسولؐ
یہ افتخار بھی انعام حق تعالیٰ ہے

ایک چھوٹے سے شعری مجموعہ میں اتنے زیادہ اشعار میں نعت کہنے، نعت کہنے کی سعادت پانے اور اسی کو وظیفہء حیات بنالینے کے حوالے سے احساسِ تشکر و تفاخر، اس بات کی دلیل ہے کہ سرؔو سہارنپوری نے نہ صرف نعتیہ شاعری اپنانے کے بعد اسی شاعری کو اپنے لیے اعزاز جانا، بلکہ مجھے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شاعر کو نعت گوئی کے صلے میں روحانی طور پر نوازا بھی گیا۔

"اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" اے اللہ! روح القدس کے ساتھ حسان کی مدد فرما' والی دعاؤں کے اثرات حضرتِ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے توسط سے ہر مخلص نعت گو تک پہنچنے کے مظاہر دیکھنے ہوں تو سرؔو صاحب کی شاعری کے نمونے دیکھے جائیں جن میں پیغامِ عمل بھی ہے۔ تعلیم رسولﷺ کے نکات بھی ہیں اور حبِ نبیﷺ کے ازدیاد کے لیے حسن و جمالِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا احوال بھی اس طرح بیان ہوا ہے کہ بلا تشبیہ غالبؔ کا ایک مصرعہ بے طرح یاد آجاتا ہے۔

ع ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

اگر ہم نعت کے تقدس کا خیال کرتے ہوئے اس مصرعے کو اس طرح پڑھیں تو شاید کچھ بات بن جائے:

ع ذکر شاہِ خوباںﷺ کا اور پھر بیاں اپنا

''اور پھر بیاں اپنا'' میں جو تعلی ہے وہ چوں کہ شاعر کے قلم سے نہیں بلکہ اس کے مداح کی طرف سے معرضِ اظہار میں آئی ہے، اس لیے عین جائز ہے۔ واضح رہے کہ مداح کا لفظ استعمال کرنے میں سخن فہمی کا دخل تو ہے لیکن غالب کی طرف داری کا کوئی گمان نہیں ہے۔ اتنی اچھی شاعری کے مطالعے کے بعد اپنے معروضات پیش کرتے ہوئے ''سخن فہمی'' کی تعلی بھی کسی حد تک جائز قرار دی جاسکتی ہے۔

ماخذ ومنابع:

۱۔القرآن الکریم
۲۔سنن ابی داؤد، جلد سوم
۳۔صحیح بخاری، جلد سوم
۴۔احسان اللہ ثاقب، شاعری کرنا سیکھیں، کانٹی نینٹل سٹار پبلیشرز، لاہور، 2013 ء
۵۔اِفضال احمد انور، اردو نعت کا ہیئتی مطالعہ، غیر مطبوعہ، مخزونہ نعت ریسرچ سینٹر، کراچی
۶۔اقبالؔ، کلیاتِ باقیاتِ اقبال، مرتبہ: صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۴ء
۷۔اقبالؔ، تجدیدِ فکریاتِ اسلام، مترجم ڈاکٹر وحید عشرت، نظر ثانی: ڈاکٹر عبدالخالق، اقبال اکادمی، لاہور ۲۰۰۲ء
۸۔سرؔو سہارنپوری، زخمہء دل، القمر انٹر پرائزرز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۵ء
۹۔سرؔو سہارنپوری، ثنائے خواجہﷺ، دارالاحسان سالار والا، ضلع فیصل آباد، س۔ن
۱۰۔صبیح رحمانی، نعت رنگ ۲۳، ۲۴، نعت ریسرچ سینٹر، B306 بلاک 14، گلستانِ جوہر، کراچی
۱۱۔مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری، مترجم: حصنِ حصین، دارالاشاعت، کراچی
۱۲۔ڈاکٹر عاصی کرنالی، اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر، اقلیم نعت، کراچی، ۲۰۰۱ء
۱۳۔فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، لاہور، س۔ن
۱۴۔قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیرِ مظہری

۱۵۔مختار مسعود، آوازِ دوست، العطاء 177 شادمان 2، لاہور،۲۰۰۴ء

۱۶۔مولانا مودودی، تفہیم القرآن، لاہور

۱۷۔میر تقی میرؔ، کلیاتِ میر، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۸۔نجم الغنی ،مولوی رامپوری، بحرالفصاحت، حصہ دوم، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، دسمبر ۲۰۰۶ء

۱۹۔نصیرالدین نصیرؔ، نام ونسب، گولڑہ شریف، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

۲۰۔نگار پاکستان، اصنافِ شاعری نمبر، سالنامہ ۱۹۶۷ء

....

[مطبوعہ: ا۔ جسارت سنڈے میگزین، جہانِ ادب، 29 دسمبر 2013ء تا 2 فروری 2014ء۔
۲۔نعت رنگ (مرتب: صبیح رحمانی) شمارہ 24، جولائی 2014ء، ص 270۔]

حافظ مظہرالدین کا شعرِ عقیدت

......نوائے عاشقانہ!

نعتیہ شاعری جس اعلیٰ سنجیدگی (higher seriousness) کی متقاضی ہے اس کے لیے شاعر کا اپنے موضوع (نعت) کی نزاکتوں سے آگاہ ہونا بھی لازمی ہے اور اسلوب میں متانت' لطافت، بیان میں شائستگی اور فنی خلوص پیدا کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اظہار میں شعری جمالیات کا خیال رکھتے ہوئے افصح العرب جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی مدح میں خامہ فرسائی کی سعی کی جائے اور جذبے کی صداقت برقرار رکھی جائے تو بقول غالب :

ع شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فن ما

حافظ مظہرالدین کے نعتیہ کلام میں جملہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ان کے کلام کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ ہر لفظ کے عقب میں سوزِ دل، عشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی حرارت اور فنی خلوص کے رنگ جھلکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

کائنات کا سارا نظام نوری نظام ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف بھی اسی حوالے سے کروایا ہے ۔ سیماب اکبرآبادی نے آیۂ نور کا ترجمہ کچھ اس طرح نظم کیا ہے:

ہے خدا کے نور سے ارض و سما میں روشنی
اور یہ ہے اک مثالِ (خاص) اس کے نور کی

جیسے ہو اک طاق ،اور اس میں چراغ (پر ضیا)
ہو چراغ اک شیشے کی قندیل میں رکھا ہوا
اور وہ شیشہ ستارے کی طرح ہو ضو فشاں
(تیل سے)زیتون کے جو ہے مبارک (بے گماں)
جل رہا ہے (وہ چراغ ِ عظمت و جاہ و شرف)
جس کا رخ مشرق کی جانب ہے نہ مغرب کی طرف
تیل اس کا جیسے دینے کو ہے خود ہی روشنی
چاہے آگ اس سے نہ ہو مس (از رہِ پاکیزگی)
نور پر ہے نور،یعنی روشنی پر روشنی
جس کو وہ چاہے دکھائے راہ اپنے نور کی

اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے نور کی مثال دے کر اپنی ذات کا تعارف کروایا ہے وہیں اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا تعارف بھی ''نور'' ہی کے حوالے سے کروایا ہے۔ سورۂ مآئدہ کی آیت کا ترجمہ ہے:

''بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور کتابِ روشن''۔[۵:۱۵]

تفسیری حاشیئے میں مولانا نعیم مرادآبادی نے وضاحت کی :

''سیدِ عالم ﷺ کو نور فرمایا گیا کیوں کہ آپ سے تاریکیِ کفر دور ہوئی اور راہِ حق واضح ہوئی''۔

یہاں اس مثال سے واضح ہوا کہ ایک نور اللہ کا ہے ، ایک نور اس کے نبی ﷺ کا۔ چنانچہ ایک نور''واجب الوجود'' اور دوسرا نور''ممکن الوجود'' کے نام سے پہچانا گیا۔حقیقتِ محمدیہ کے اس رمز کو سمجھ کر ہی حافظ مظہرالدین نے کہا :

رسولؐ میں ہیں خدا کے جلوے،خدا کا جلوہ حجاز میں ہے
وہی ہے رنگِ رخِ حقیقت، جو رنگ حسنِ مجاز میں ہے

یہی وجہ ہے کہ حافظ مظہرالدین نے بر ملا خرد کی نارسائی کا اعلان کرتے ہوئے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔وہ کہتے ہیں:

خرد سمجھے گی کیا مفہوم سرِّ ''من رآنی'' کا
خرد کی دسترس تو حلقہء لفظ و بیاں تک ہے

اس شعر میں اس حدیث کی تلمیح آئی ہے جس میں آقائے نامدار جنابِ محمد مصطفےٰ ﷺ نے فرمایا تھا ''من رآنی فقد را الحق''،جس نے مجھے دیکھا اس نے حق دیکھا''۔اس حدیث کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا۔دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے حق (اللہ تعالیٰ) کو دیکھا۔دونوں مفاہیم اہلِ علم اور اہلِ تصوف میں رائج ہیں۔حافظ صاحب نے متصوفانہ مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے کیوں کہ یہی ان کی روحانی واردات اورعرفانِ حق کا تقاضا تھا۔اسی مفہوم کا ایک اورشعر:

حق کا مفہوم ہے معنیٰ اُن ؐ کا
حق کی تصویر ہے صورت اُنؐ کی

اس شعر میں معنیٰ [مجرد Abstraction] اور صورت[مادی شئے Concrete] کے تضاد سے بھی لطف پیدا کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا نورصورت سے پاک ہے نبی ﷺ کا نورصورت میں جلوہ پیدا کررہا ہے۔اسی متن کا ایک اورشعر دیکھیے :

جمالِ حق کا ہے آئینہ ذاتِ پاکِ نبیؐ
جو ان کو دیکھ لے وہ آدمی خدا سے ملے

انسان کی روح ''امرِ رب'' ہے ۔اللہ نے خود ہی مٹی کے جسم میں روح پھونکی تھی۔''نفخ'' روح کے بارے میں قرآنِ کریم میں متعدد بار ذکر ہوا ہے۔مثلاً سورۃ السجدہ میں ہے:

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (السجدہ : ۹)
''پھراس کی نوک پلک سنواری اور پھونکی اس میں اپنی روح''

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نور ہے تو اس کا امر بھی نور ہے اس لیے یہ امر بھی ممکن الوجود نور کی شکل میں ہے۔اب نور کے تین درجے متعین ہوئے۔ایک اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور جو واجب الوجود ہے۔دوسرا نور محمد مصطفےٰ ﷺ کا نور جس کی تخلیق سب سے پہلے ہوئی ،تیسرا وہ جزوی نور جو آدم علیہ السلام کے جسم میں بصورتِ ''امر'' پھونکا گیا۔آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے جسدِ خاکی میں پھونکی جانے والی روح (امرِ رب) بھی اسی نور کا جزو ہے جو نور اللہ تعالیٰ نے پہلے پہل تخلیق فرمایا تھا۔جس کی طرف حدیث شریف میں ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ''(یعنی پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ میرا نور ہے، سر دلبراں،سید محمد ذوقیؒ کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حضورﷺ کے نور کی تخلیق،تخلیقِ اول تھی ،اس ضمن میں حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ معروف ہے۔امام نبہانی نے جواہر البحار میں لکھا ہے :

''حدیثِ جابرؓ ہے'اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضور نبیِ اکرمﷺ کی روح منور کو پیدا فرمایا پھر عرش و کرسی اور لوح اور عالم پست و بالا (وغیرہ تمام اشیاء کو اس روح مقدس سے پیدا فرمایا) اور حدیثِ پاک میں ان اشیاء کی تخلیق کی ایسی واضح ترتیب بیان کردی گئی ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں رہا کہ تمام اشیاء حضور نبی اکرمﷺ کی فرع ہیں اور آپﷺ ان کی اصل ہے''

کائنات میں ایک اصول کارفرما ہے۔ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے. کل شیء ٍیر جع الیٰ اصلہٖ یہی وجہ ہے کہ انسان کا جزوی نور(روح) بھی کلی نور سے اتصال کا خواہش مند رہتا ہے۔تب ہی تو صوفیانہ شاعری میں فراق کا شکوہ جا بجا ملتا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وزجدائی ہا شکایت می کند

(مولانا جلال الدین رومی)

''بانسری سنو کس طرح اپنی کہانی بیان کررہی ہے۔ وہ اپنی اصل سے جدائی کی

شکایت کررہی ہے''۔

غالب نے کہا:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ شکوہ شکایت اس لیے ہے کہ نورِ امر(روح) اپنی نچلی سطح پر رہنے کے لیے آمادہ نہیں اسے صعود چاہیے کیوں کہ وہ اپنی اصل اور کل کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم جنابِ محمد مصطفےٰﷺ کی شکل میں ''نور'' کی اولین تخلیق فرمائی اور اسے انسانی صورت عطا فرمادی۔اس حقیقت کو غالب نے اس طرح بیان کیا:

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ اقدس کو انسانوں کے لیے منبعِ محبت بنادیا۔ انسانی دنیا میں تمام سعید روحیں اللہ سے محبت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے رسول اللہﷺ کی محبت میں مبتلا ہوتی ہیں۔کیوں کہ نورِ کل کی طرف صرف اسی واسطے سے سفر طے ہوسکتا ہے۔اقبال نے اس حقیقت کا بیان اس طرح کیا :

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زِ نورِ مصطفےٰؐ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰؐ است

''(اے مخاطب، زندہ رود!) تو جہاں کہیں بھی رنگ و بو کی دنیائیں دیکھ رہا ہے ۔ہر جہان جس کی خاک سے آرزوئیں [کمال حاصل کرنے کی تمنائیں]جنم لے رہی ہیں۔یا تو اس کی قیمت [اور چمک دمک]نورِ مصطفوی کے طفیل قائم ہوچکی ہے یا وہ نورِ مصطفےٰﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے''۔

حافظ مظہرالدین کے کلام میں نورِ مطلق سے اتصال کے لیے تڑپ اور عشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وہ حرارت محسوس ہوتی ہے جو حقیقتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ادراک کی غماز ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا شعرِ عقیدت اس حقیقی تڑپ کا نمائندہ شعرِ عقیدت ہے جس کا اظہار محض شعری آمد کی لمحاتی واردات میں نہیں ہوسکتا۔یعنی یہ نعتیہ شاعری ایک مسلسل قلبی تعلق ، ہمہ وقتی لگاؤ اورشب و روز کی ریاضتِ فکر وفن کے نتیجے میں ظہور میں آئی ہے۔کسی وقتی تحریک، کسی موسمی لہر، کسی لمحاتی غرض یا کسی جذبۂ نمائش کے طور پر ایسی شاعری کا نہ تو مافیہ بنت میں آسکتا ہے اور نہ ہی اسلوب پیدا ہوسکتا ہے۔گویا اس شاعری کا محرک اول وآخر صرف ایک جذبہ ہے ، جذبۂ عشقِ مصطفٰےﷺ۔رومیؒ نے کہا تھا:

مرحبا اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

یہی عشق، حافظ مظہرالدین کی جملہ علتوں کا طبیب ہے اور اس عشق کی منزل نورِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے اتصال کی آرزو کی تکمیل ہے۔اس لیے شاعر کا سب سے پہلا دعویٰ تو احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں یہ ہے:

مقصدِ بزمِ کن فکاں ہیں حضورﷺ
وجہِ تخلیقِ دو جہاں ہیں حضورﷺ

پھر کہتے ہیں:

حسنِ تخلیق و باعثِ تخلیق
نازشِ دو جہاں، قرارِ حرم

حقیقتِ محمدیﷺ کے ادراک کے بغیر یہ بات اظہار میں آنا ممکن تو ہے، صرف علم کی بنیاد پر بھی یہ کہا جاسکتا ہے۔لیکن حافظ مظہرالدین کے کلام کی اثریت ظاہر کررہی ہے کہ یہ بات کلیم[شاعر] کے روحانی مشاہدات کا حصہ بھی بن چکی ہے۔حضورِ اکرمﷺ کے اس مقامِ بلند تک عقل کی نارسائی نے بہت سے لوگوں کو بھٹکایا۔کچھ نے حضورِ اکرمﷺ کی

مثال پیدا کرنے پر اللہ کی قدرت کے دلائل دینے کی کوشش کی تاکہ حضورِ اکرمﷺ کی یکتائی کی حقیقت کو چھپایا جاسکے تو کسی نے ''مقصودِ کائنات'' کے تصور میں حضورِ اکرم کے ساتھ کچھ اور ہستیوں کو جوڑنے کی سعی کی۔یہ دونوں رویئے افراط و تفریط کے ذیل میں آتے ہیں۔حافظ مظہرالدین کا دینی علم اور حقائق کا ادراک اتنا کامل تھا کہ وہ افراط وتفریط سے بچ کر اپنی بات بڑے واضح انداز اور شاعرانہ اسلوب میں بیان کرتے ہوئے حضورِ اکرمﷺ ہی کو وجہ تخلیقِ عوالم قرار دیتے رہے۔ایک اور شعر دیکھئے:

ترے ظہور سے پھیلے ہیں سرمدی جلوے
تجلیات کا عالم ترے ظہور سے ہے

حقیقت کے اسی ادراک نے انہیں عشق کی منزلیں طے کروادیں تو وہ پکار اٹھے!

مرے رنگِ نعت میں ہے مرے دل کا سوز شامل
بہ زبانِ شعرو نغمہ مرا عشق بولتا ہے

بہ زبانِ شعرونغمہ شاعر کے ''عشق'' کی پکار کا یہ اسلوب کوئی معمولی اسلوب نہیں ہے۔حافظ مظہرالدین کی شاعری میں ان کا عشق ضور ریز ہے اور اس کی حرارت قاری کو بھی محسوس ہوتی ہے۔

ایک عاشقِ صادق کی پکار کیا ہے، ملاحظہ ہو:

وہ سودائی ہوں جس کو ان کے بام و در سے نسبت ہے
وہ دیوانہ ہوں جس کا ربط ان کے آستاں تک ہے

یہی دیوانگی ہے جس نے حافظ مظہرالدین کو عشق کا پروانہ بنادیا اور فرزانگی کے نکات شعری پیکر میں ڈھل کر ان کے قلم سے قرطاس پر بکھرنے لگے۔اس مرحلے پر وہ بھی اقبال کی طرح ''خرد'' کی کورچشمی کا حوالہ دے کر''اہلِ دل'' (اہلِ عشق،اہلِ جنوں اور اہلِ حال) کی بصیرتوں کے احوال بیان کرنے لگے:

خرَدْ اب بھی اسیرِ ظلمتِ اوہامِ باطل ہے

نظر ہم اہلِ دل کو جلوۂ حسنِ تمام آیا

اب شعر کے اساسی نکتے کی روشنی میں حافظ صاحب کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں۔الیٹ نے کہا تھا:

When we are considering poetry

we must consider it primarily as poetry and not as another thing"

''شاعری پر بنیادی طور پر محض شاعری کی حیثیت سے غوروخوض کرنا چاہیے کسی اور شے کی حیثیت سے نہیں''۔

یہی وہ نکتہ ہے جس پر مطلوبہ توجہ صرف نہ کرنے کے باعث اردو کی نعتیہ شاعری' آج تک نقادانِ ادب کی نظر میں بہت ہلکی اور غیر ادبی شاعری رہی ہے۔نعتیہ شاعری کو بطور فن محسن کاکوروی نے اپنایا اور کمال تک پہنچادیا لیکن ان کے بعد جن لوگوں نے نعتیہ شاعری میں دلچسپی لی ان میں سے بیشتر اس موضوع کو جزوقتی توجہ ہی دے سکے۔بعض استثنائی ناموں کو چھوڑ کر بیشتر ایسے شعراء نعت کہنے کی طرف مائل ہوئے جن کا کوئی ادبی مقام نہ بن سکا۔

الحمدللہ! ہمارے عہد میں نعتیہ شاعری کی طرف رجوعِ عام کی صورت پیدا ہوئی تو بعض ایسے شعراء بھی شعرِ عقیدت کہنے کی طرف مائل ہوئے جن کی ادبی ساکھ قائم ہوچکی تھی۔حافظ مظہرالدین ان نعت نگاروں میں ہیں جن کی ادبی حیثیت ، ان کی نعت نگاری ہی کے باعث مسلم ہے ۔پاکستان میں نعتیہ شاعری کا غلغلہ تو ضیاء الحق کے دور سے بلند ہوا لیکن حافظ صاحب کے نعتیہ نغموں کی گونج تو اس دور سے بہت پہلے سنائی دینے لگی تھی۔

شاعری میں زبان کی فصاحت، بیان کی دل کشی، فنی مہارت اور شعری بحور و اوزان میں پوشیدہ نغمگی (Internal Symphony) کا مظاہرہ ہی کسی شاعری کو لائق مطالعہ بناتا ہے اور الحمدللہ! حافظ مظہرالدین کے کلام میں یہ تمام خوبیاں بدرجہء اتم موجود ہیں۔فصاحت کے ضمن میں عابدعلی عابد کی رائے ہے :

''جس چیز کو انگریزی میں مطابقتِ الفاظ و معانی Concordance of

substance with expression کہتے ہیں اسے مشرق کے نقادوں نے فصاحت کہا ہے۔اگر یوں کہہ دیا جائے کہ فصاحت موزوں الفاظ کے انتخاب کا نام ہے تو بھی نادرست نہ ہوگا''۔اس معیار کی روشنی میں جب ہم حافظ مظہرالدین کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بیشتر کلام فصاحت سے لبریز ہے۔مثلاً

جو حُسن میرے پیشِ نظر ہے اگر اسے
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

اس شعر میں حضورِ اکرمؐ کے حُسن کی یکتائی کا ذکر ہے۔یہاں ''جلوے'' کا لفظ کائنات کی تمام خوبصورتیوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔یعنی کائنات کی تمام خوبصورتیوں کو بینائی میسر آجائے تو وہ بھی شاعر کی نظر کا طواف کریں کیوں کہ ''حُسنِ یکتا''ان جلوؤں سے پوشیدہ ،اور شاعر کی نظر میں ظاہر ہے۔فیض احمد فیضؔ نے مجازی محبوب کے لیے کہا تھا:

وہ تو وہ ہے تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو!

حافظ مظہرالدین کے شعر کا فیض کے درجِ بالا شعر سے موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ''شعرِعقیدت'' کے لیے جس ادبی اسلوب کی ضرورت تھی، شاعر نے اس کا بھرپور خیال رکھا ہے۔اور دیکھیے:

نَفَس کی آمد و شد کا حیات نام نہیں
وہ زندگی ہے جو گزرے میانِ کوئے رسولؐ
بہارِ گلشنِ عالم ہے ان کے جلوؤں سے
گلوں میں رنگِ نبیؐ ہے چمن میں بوئے رسولؐ

ان اشعار میں خیال کی ترسیل کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ انتہائی موزوں ہیں۔نحوی ترتیب بھی قواعد کے خلاف نہیں ہے۔تعقیدِ لفظی بھی نہیں ہے اور غرابت بھی نہیں ہے۔ اس لیے یہ کلام ترتیب الفاظ کی موزونیت کے باعث فصیح کہلائے گا۔علاوہ

ازیں ان اشعار میں ایک موجود ادبی روایت اور معروف نعتیہ آہنگ کی ہم رنگی بھی ہے۔اسی زمین میں بیدم وارثی کی بڑی مشہور نعت ہے:

عدم سے لائی ہے ہستی میں آرزوئے رسولؐ
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے جستجوئے رسولؐ

حافظ مظہرالدین نے اسی زمین کو اختیار کیا اور اپنے مزاج کی انفرادیت، اسلوب کی شناخت اور بیان کی طرفگی کو برقرار رکھا۔ نورِ مصطفےٰ ﷺ کے علمی عرفان اور روحانی مشاہدوں کے باعث اہلِ دل اور اہلِ حال نعت گوشعراء نے قصیدہ ہائے نور لکھے ہیں۔احمد رضا خاں بریلوی کا معروف قصیدہ ہے جس کا مقطع ہے :

اے رضاؔ یہ احمدِ نوری کا فیضِ نور ہے
ہوگئی میری غزل بڑھ کر قصیدہ نور کا

حافظ مظہرالدین نے بھی اسی زمین میں اشعار کہے ہیں اور یہاں بھی ان کا منفرد لہجہ اور اسلوب نمایاں ہے:

یہ بھی فیضانِ کرم ہے یہ بھی صدقہ نور کا
دامنِ دل میں لیے بیٹھا ہوں جلوہ نور کا
ان کی بزمِ ناز ہے یا ایک حلقہ نور کا
رشکِ صد خورشید ہے اک اک ستارہ نور کا

حافظ صاحب نے احمد رضا خاں کی اتباع میں زیادہ تر مطلع کہے ہیں۔درجِ بالا دونوں مطلعوں میں بیان کی فصاحت دل موہ لینے والی ہے۔دوسرے مطلع میں تلمیح ہے۔حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا "اصحابی کا لنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" (میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں جس کی پیروی کروگے ، ہدایت یاب ہوگے)۔اس مطلع میں نور کے حوالے سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اللہ کا واجب الوجود نور، نبی ﷺ کا ممکن الوجود نور اور اس نور سے جو مستنیر ہوا وہ بھی نور ہی کے تلازمے سے متصف ہوگیا۔ہدایت بھی نور

ہے اس لیے اس کے لیے دنیا کی کثافت کی ظلمت میں ''ستاروں'' ہی کی مدد سے راستہ دیکھا جاسکتا ہے۔چنانچہ ممکن الوجود نور کے ذیل میں ''ستاروں'' کی مثال انتہائی معنی خیز ہے۔حافظ صاحب نے اس مطلع میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بیان کی لطافت اور روانی کے لیے ایک اور نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

جب تک بدن میں جان، دہن میں زباں رہے
لب پر ثنائے خواجۂ کون و مکاں رہے
کیف آفریں جمالِ شہِؐ مرسلاں رہے
پیہم نبیؐ کا ذکر، نبیؐ کا بیاں رہے
جاری رہے حضورؐ کی مدحت کا سلسلہ
جب تک جیوں یہ نور کا چشمہ رواں رہے
اعجاز ہے یہ سرورِؐ عالم کی نعت کا
میں پیر ہوگیا مرے نغمے جواں رہے

آخری شعر میں شاعرانہ ''تعلی'' رقم ہوئی ،لیکن حافظ مظہرالدین کے کلام سے متبادر ہوگا کہ یہ بھی مبالغہ نہیں حقیقت ہے، کیوں کہ نعت گوئی کی توفیق ہی شاعر کے لیے منبعِ فیض ہے۔

حافظ مظہرالدین نے تلمیحات میں براہِ راست قرآن و احادیث کے حوالے کم دیئے ہیں لیکن لفظوں کے دروبست اور بیان کی ایمائی کیفیت سے تلمیح واضح کردی ہے۔جیسا کہ ہم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حوالے سے شعر نقل کیا جس میں صرف ''نور'' کے تلازمے سے ''ستاروں'' کا تذکرہ کرتے ہوئے حدیثِ مبارک کی طرف رہنمائی کی گئی تھی۔درجِ ذیل شعر میں آیہءِ قرآنی کی طرف بھی ایسا ہی اشارہ موجود ہے :

گناہگار کو مطلوب ہے اگر رحمت
گناہگار خجل انؐ کے روبرو ہوجائے

سورۂ نساء کی آیت نمبر۶۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَآءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝

’’اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنی جانوں پر تو آجاتے[اے نبیؐ] تمہارے پاس اور معافی مانگتے اللہ سے اور مغفرت کی درخواست کرتے ان کے لیے رسول بھی تو یقیناً پاتے وہ اللہ کو بڑا معاف کرنے والا‘‘۔

درجِ بالا شعر میں کتنے بلیغ انداز میں مغفرت طلبی اور حضورِ اکرمﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی شرط کو دولفظوں میں سمودیا گیا ہے، ’’خجل‘‘ اور ’’روبرو‘‘۔ظاہر ہے گناہگار جب یہ احساس کرے گا کہ اس نے اس کی اپنی ہی جان پر ظلم کرلیا ہے تو و ہ نادم ہوگا، ندامت اسے مغفرت طلبی کی طرف مائل کرے گی۔پھر وہ حضورِ اکرم کے در تک پہنچے گا اور ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے گا۔یہ عمل جب حضورِ اکرمﷺ کے ’’روبرو‘‘ (حضور اکرم کی دنیا میں بنفسِ نفیس موجودگی کی صورت میں ان کے دربار میں حاضر ہوکر، اورآج حضورِ اکرمﷺ کے روضۂ انور کے سامنے) ہوگا تو یقیناً **رحمۃ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام** اس کے لیے اللہ سے مغفرت کی درخواست فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ اس عمل سے خوش ہوکر گناہگار پر اپنی ’’رحمت‘‘ کا در کھول دے گا، یعنی اس کی مغفرت فرمادے گا!

اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی نے بھی اس متن کو چھیڑا ہے۔ان کا شعر ہے:

مجرم بلائے آئے ہیں جآؤک ہے گواہ
پھر رد ہو کب یہ شان کریموں کے در کی ہے

اس شعر میں تلمیح کے لیے قرآن کریم کی آیتِ کریمہ کا حوالہ موجود ہے جو صنعتِ اقتباس کا کرشمہ ہے۔۔تلمیح یہاں مضبوط ہے لیکن حافظ مظہرالدین کے شعر کی ایمائیت نے شعریت میں اضافہ کردیا ہے۔تلمیحاتی اشاروں کے حوالے سے ہر متن(Text) میں بین

المتنیت (Intertextuality) کے شواہد موجود ہوتے ہیں۔احمد رضا خان نے شعر کی تلمیح کی گرہ خود کھول دی ہے، جبکہ حافظ مظہرالدین نے کوئی تلمیحی اشارہ نہیں کیا ہے۔لیکن ان کے دو الفاظ(خجل اور روبرو) کی معنویت نے تلمیح کی طرف متوجہ کردیا۔نعتیہ شاعری میں متن کی بنت میں جتنی تلمیحات سما سکتی ہیں ،شاید کسی اور شاعری میں نہ سما سکیں۔یہ شاعر کے خلاق ذہن پر منحصر ہے کہ وہ کس تلمیح کو’’ شعر‘‘ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔میں نے شعر کی تلمیحاتی شان جانتے ہوئے ہی حافظ مظہرالدین کے شعر کا متنی رشتہ احمد رضا خاں کے شعر سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور میں حافظ صاحب کے شعر کو’’شعریت‘‘ کے تناظر میں بہتر درجے کا شعر قرار دیتا ہوں۔خیال سے خیال کی ضوریزی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ایک مضمون کے ہزارہا اشعار مل جاتے ہیں۔دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ بعد کے شاعر نے اپنے پیش رو کے خیال کو کتنی وسعت دی؟ اور شاعرانہ جست کے ذریعے وہ کتنا آگے گیا۔

بین المتنیت (Intertextuality) کا ذکر کرتے ہوئے، ایک اور بات کی طرف دھیان گیا۔روسی ہیئت پسندوں نے ادب میں اجنبیانے(Defamiliarisation) کے عمل پر زور دیا ہے۔ان کے نزدیک شاعری [یا ادب] میں تجربے کی تازگی کی بازیافت کا عمل ضروری ہے۔حافظ مظہرالدین کے جس شعر میں تلمیح بہت پوشیدہ ہے۔اس میں تلمیح کو سمجھنے کے لیے کوئی اشارہ نہیں ہے۔متن کی بنت کا یہ عمل میرے نزدیک اجنبیانے (Defamiliarisation) کا عمل ہے۔اس تیکنیک سے شعر میں شعریت کا اضافہ تو ہوا ہے ، ایک قسم کا ابہام بھی پیدا ہوا۔کیوں کہ مذہبی شاعری میں کوئی بات بلا سند بیان میں نہیں آسکتی اور شعر میں حوالہ دینے کا واحد طریقہ ’’تلمیح‘‘ کا استعمال ہے۔لیکن تجربہ پسند شاعر اپنے متن کی اس طرح تشکیل کرتے ہیں کہ بغیر حوالے کے بھی باذوق روایت آشنا قاری شعر کی معنویت تک رسائی حاصل کرلے!حافظ مظہرالدین نے شعر میں ابہام رکھنے کے باوجو اپنی بات اس طرح کی ہے کہ قاری کا ذہن شعر کے مفہوم میں تلمیحی اشارے تک پہنچ جاتا ہے۔تجدیدِ متن کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔

ایک شعر کی معنیاتی گرہ کھولنے کی میری اس کوشش کے ذریعے مجھے اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ نعتیہ شاعری کے تخلیق کار اور نقاد کو بیانیے کی غیر مؤثر سادگی اور فن گریز رویئے کے ماحول سے نکالنے کے لیے ایسی شعری مثالیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں۔عفو کے مضمون کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

اُن سے کوئی جو طالبِ عفوِ گناہ ہو
ممکن نہیں کہ دیر ہو عفوِ گناہ میں

خیال، عمل کے لیے بیج کا حکم رکھتا ہے۔پہلے خیال آتا ہے پھر عمل کی صورت نکلتی ہے۔خیال کی پاکیزگی کے لیے افکار کی پاکیزگی ضروری ہے۔افکار کی پاکیزگی کے لیے فکر کا تابعِ وحیء ربانی ہونا لازمی ہے۔فکر جب وحیء ربانی کی بتائی ہوئی ڈگر پر چل پڑتی ہے تو انسان کی سیرت کے جوہر کھلتے اور کردار میں راست بازی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔اسی راست بازی سے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس خیال کو شعری قالب میں کس ڈھنگ سے ڈھالا گیا ہے کہ روح بھی داد دینے لگتی ہے:

خالقِ سیرت و کردار ہیں تیرے افکار
ضامنِ عدل و مساوات ہے تیری تعلیم

یہاں ایک اہم نکتہ پیش کرتا چلوں۔کچھ لوگوں نے نعتیہ شاعری کو ضمیروں کے قضیئے میں مبتلا کر رکھا ہے۔وہ شاعری میں آپ جناب کے علاوہ کچھ لکھنا نہیں چاہتے اور اردو کے لفظ ''تو''، ''تیرا'' وغیرہ کی مذمت کرتے ہیں۔بات صرف ادب کی نہیں زبان کے استعمال کی ہے۔محبوبِ رب العالمین (ﷺ) کے لیے غزل کے پیرائے میں لکھی ہوئی نعتوں میں کہیں تو یہ پابندی نبھ جاتی ہے اور کہیں بہت مشکل ہو جاتی ہے۔درج بالا شعر میں تیرے افکار، تیری تعلیم وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔لیکن ان الفاظ کو پڑھ کر کوئی بھی صائب الفکر انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حضورِ اکرم ﷺ کی شان کے استخفاف کا باعث بنے ہیں۔بات لفظوں کے برتنے کی ہے۔شاعری کے تقاضے اور ہوتے ہیں، نثر کے تقاضے اور۔اس لیے

میں حافظ مظہرالدین کے اس شعر کے حوالے سے صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھنا چاہوں گا کہ نعتیہ شاعری میں ضمیروں کے استعمال کو تنازُع کا باعث نہیں بننا چاہیے۔کیوں کہ حقیقی شاعر کسی لفظ کو برتنے کے لیے کسی خاص لغوی نصاب کا پابند نہیں ہوسکتا۔اس ضمن میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قدماء آج کے مسلمان سے بہتر مسلمان اور آج کے نعت گو شعراء سے زیادہ ادب آداب سے واقف تھے۔حافظ مظہرالدین اور دیگر اساتذہ نے اگر قدماء کی تقلید کی ہے تو آج ان کی تقلید کرنے والوں کو مطعون نہیں کیا جاسکتا۔

حافظ مظہرالدین کا زورِ بیاں ان کی نظموں میں کھل کر سامنے آتا ہے۔انہوں نے ''سفر نامہء حجاز'' مثنوی کی ہیئت میں نظم کیا ہے۔یہ مثنوی بڑی رواں دواں بحر (بحرِ ہزج مسدس اخرب محذوف، مفعول، مفاعلن فعولن) میں ہے۔محسن کاکوروی نے اس بحر کو خوب برتا ہے۔ان سے قبل پنڈت دیا شنکر نسیم نے اس بحر میں ''گلزارِ نسیم'' لکھی تھی۔وہ لکھتے ہیں:

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے
دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے
انسان و پری کا سامنا کیا
مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے
مختار ہے جس طرح نباہے

محسن کاکوروی نے اسی بحر میں مثنوی کے پھول کھلائے اور فن کو کمال تک پہنچا دیا:

آنکھوں کو تلاشِ جلوۂ رب

کانوں میں صدائے نَحنُ اَقرَب
آیا سوئے بزمِ لِیُ مَعَ اللہ
آئینے میں جیسے پرتوِ ماہ
نزدیکِ خدا حضور پہنچے
اللہ اللہ دور پہنچے
تھی اوج پہ شانِ مصطفائیؐ
دکھلاتی تھی بندگی خدائی

یہ مثنویاں تو موضوع کی تعیین کے ساتھ نہیں تھیں اور اگر تھیں بھی تو ان میں تخیل کے لیے پرواز کی گنجائش تھی۔لیکن ''سفر نامہ'' کچھ بیانیہ قسم کی شاعری کا متقاضی تھا۔بیانیہ شاعری میں امیجری کی گنجائش صرف اعلیٰ تخلیقی صلاحیت رکھنے والے فن کار ہی نکال سکتے ہیں۔روسی ماہرِ نفسیات وائیگا ٹسکی (Vygotsky) کا کہنا ہے کہ تخلیقی سوچ تخئیلی (imaginative) ہوتی ہے۔۔۔تخلیق کار کی خود آگہی اور خود اعتمادی اپنے غیر شعوری محرکات کی عطا کو ثمر بار بنانے کے لیے عام تعقلات سے ہٹ کر متضاد رویوں سے ایک ایسی ان جانی اور انوکھی راہ تلاش کرتی ہے جو تحیر اور سرخوشی پر منتج ہو''۔حافظ مظہرالدین نے بھی سفر نامہء حجاز منظوم کرنے میں تحیر اور سرخوشی کے عناصر سے وجد آفریں ماحول پیدا کیا ہے۔انہوں نے بڑی سرشاری کی کیفیت میں یہ سفر نامہ نظم کیا۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں اپنی ہی دھن میں گارہا تھا
کونین کو وجد آرہا تھا
نغمات تھے لب پہ عاشقانہ
جبریلؑ کی لَے تھا ہر ترانہ
ویرانہء قاف و کوہِ الوند
تھی زیست کی راہ جس جگہ بند

ڈرتا نہیں آدمی بلا سے
دے انؐ کا کرم اگر دلاسے
رحمت ہو حضورؐ کی جو یاور
ہوتا ہے سفر ،حضر سے بہتر
صدقے میں رسولِؐ دوسرا کے
دیکھے ہیں مزار انبیاء کے
دیکھی ہے وہ مسجدِ امیہ
یحییٰؑ کا ہے جس میں پاک روضہ
منزل کے قریب تھا مسافر
با حالِ عجیب تھا مسافر
دنیا تھی خیال میں نرالی
روضے کا جمال، شہؐ کی جالی
چھوٹے رہِ شوق کے مشاغل
تھا سامنے میرے حُسنِ منزل

حافظ مظہرالدین کے سفر نامے کے سات بند ہیں۔ہم نے پانچ بندوں سے منتخب اشعار نقل کر دیئے ہیں۔ان اشعار سے شاعر کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ان میں زبان کا لوچ بھی ہے، روانی بھی ہے اور حقیقت کو متخیلہ کی مدد سے بیان کرنے میں جو تاثراتی اسلوب بن سکتا ہے وہ بھی اپنی پوری سج دھج سے نمایاں ہورہا ہے۔اس مثنوی کا ساتواں حصہ ''نعت'' پرمشتمل ہے ۔ اس نعت میں الفاظ کا دروبست، فکر کی جولانی، تلمیحات کی ضوریزی اور قدرتِ کلام دیدنی ہے۔فیضی کا ایک مشہور نعتیہ شعر ہے:

اُمّیّ و دقیقہ دانِ عالم
بے سایہ و سائبانِ عالم

حافظ مظہرالدین کی مذکورہ نعت کے بیشتر اشعار میں بھی ایسا ہی فنی دروبست ہے کہ کم سے کم الفاظ میں جہانِ معانی پیدا کیا گیا ہے:

اے سیدِ سرورانِ عالم
ھادئ پیمبرانِ عالم
مقصودِ حیات،نازِ تخلیق
منشائے وجود،رازِ تخلیق
دانندہء وحی آسمانی
شاھنشہء ملکِ جاودانی
مفہومِ رموزِ ''من رآنی''
معنیٔ بقاو غیر فانی
سلطانِ جہانِ خوش جمالاں
حامیٔ و انیسِ خستہ حالاں

ان اشعار میں صرف الفاظ کی نشست اور موزونیت کی لمعہ ریزی نے ہی شاعر کے لہجے کو قابلِ رشک بنادیا ہے۔۔۔عربی مقولہ ہے ''خَیرُ الْکَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ''(بہترین کلام وہ ہے جومختصر اور مراد کو ظاہر کرنے والا ہو)۔اچھی شاعری پر یہ کہاوت پوری اترتی ہے۔درجِ بالا اشعار بھی تقلیلِ الفاظ میں تکثیرِ معانی کی اچھی مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔محسن کاکوروی نے بھی جہاں نعتیہ اشعار کہے ہیں ان میں یہی التزام رکھا ہے کہ نبوی ﷺ صفات خوبصورت الفاظ میں نگینوں کی طرح ضودینے لگی ہیں۔محسن کے ہاں بھی الفاظ کی موزونیت نے اشعار میں جان ڈال دی ہے۔مثلاً

محبوبِ خدا نبیء مرسل
صبحِ دو مینِ روزِ اول
شاہنشہِ انبیاء محمد

تاجِ سرِ اصفیاء محمد
مقصودِ ازل اجل و اعلیٰ
منظور حضورِ حق تعالیٰ
سلطانِ فلک حشم محمدؐ
مہرِ عرب و عجم محمدؐ

محسن کاکوروی کے ان اشعار کے ساتھ اگر حافظ مظہرالدین کے مقتبس بالا اشعار ملا دیئے جائیں تو شناخت کرنا مشکل ہوجائے کہ کونسے اشعار محسن کوروی کے ہیں اور کون سے حافظ مظہرالدین کے۔ایک بڑے شاعر کے لہجے اور اسلوب کو اس طرح اپنا لینے کی صلاحیت کہ شناخت مشکل ہوجائے، انتہائی درجہ مشق و مُزاوَلت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔اس تقابلی اشارے سے حافظ مظہرالدین کی فنی ریاضت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک شعر معراج کے حوالے سے بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

ورائے عرش بلانے میں راز یہ بھی تھا
کہ اس جہاں کی بھی مخلوق دلربا سے ملے

اس شعر میں معراج کے حوالے سے ایک اہم نکتہ بیان ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک ہر نبی سے اپنی وحدانیت کا اعلان کروایا لیکن کسی کو براہِ راست اپنا جلوہ نہیں دکھایا۔آخری پیغام کی ترسیل جنابِ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ذریعے ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) کو اپنا دیدار کروادیا۔مقصد یہ تھا کہ مخلوق تک جوخبراب تک وحیء ربانی کے توسط سے پہنچ رہی تھی اور پہنچائی جارہی تھی، اسے نبیٔ آخرالزمان ﷺ اپنے مشاہدے کی بنیاد پر عام کریں۔اب اس تناظر میں اس شعر پر غور کرتے ہیں تو پرت پرت معانی کھلتے جاتے ہیں۔مثلاً

☆اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کومعراج پر اس لیے بلوایا کہ عالمِ بالا کی مخلوق بھی ان سے ملے یا ان کا مرتبہ پہچان لے۔

☆اگر ''اس جہاں'' کا اطلاق ''دنیا'' پر کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ حضورِ اکرم ﷺ جو اپنی دنیاوی زندگی میں اسی جہان کی مخلوق کے طور پر پہچانے جارہے تھے، وہ ، اس دنیا میں رہتے ہوئے پہلے اور آخری ''انسان'' کی حیثیت سے ''دلربا'' (اللہ تعالیٰ) سے مل لیں۔

☆معراج میں حاصل ہوجانے والی رفعتوں کے طفیل دنیاوی مخلوق (اس جہاں کی مخلوق) رسولِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد کو اچھی طرح سمجھ سکے ''من رآنی فقد را الحق'' (جس نے مجھے دیکھا اس نے حق دیکھا)۔یعنی معراج کے بعد حضورِ اکرم ﷺ سے ملنے والے لوگ، نبی ﷺ کی دلربائی (محبوبیت) سے بھی واقف ہوجائیں۔

اس طرح غوروفکر سے اس شعر میں معانی کا ایک جہان آباد نظر آئے گا۔بڑی شاعری کی ایک جہت یہ بھی ہوتی ہے کہ مفہوم کے تعین میں صرف یک رخی تفہیم کو دخل نہ ہو۔اس اعتبار سے حافظ مظہرالدین کی شاعری میں بڑی شاعری کا جوہر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

حافظ مظہرالدین کی قادرالکلامی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نظم کے لیے بیشتر کلاسیکی اصناف کا استعمال کیا ہے۔''دیارِحرم'' کے عنوان سے انہوں نے ترکیب بند لکھا ہے۔اس ترکیب بند میں قصیدے اور غزل کی طرح ہر بند کا پہلا شعر ''مطلع'' ہے، بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے میں قافیے کی پابندی ہے۔اس ترکیب بند کے آٹھ بند ہیں۔اس میں سرزمین حجاز بالخصوص مکۃ المکرّمہ اور حرمِ مدینہ منورہ کے مقامات سے شاعرانہ مکالمہ کیا گیا ہے۔ یہ شاعرانہ مکالمہ جذبات کے تموج ، خیال کی بلندی ،بیان کی فصاحت ، لہجے کی لطافت اور اظہار کی خوبصورتی کے باعث نعتیہ شعری کائنات میں ایک جدا گانہ شہابِ ثاقب بن گیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سلام تجھ پہ ہو اے سرزمینِ ملکِ حجاز
کہ تو ہے رحمتِ ربِ جہاں سے سر افراز
ہیں جذب خاک میں تیری حضورؐ کے آنسو
لٹائے تجھ پہ شہِؐ دیں نے سجدہ ھائے نیاز

تری ہواؤں میں پھیلی ہے بوئے زلفِ رسول
تری فضاؤں میں ہے قلبِ مصطفےٰؐ کا گداز
ترا جہان ہے معمور عشق و مستی سے
تری نگاہ نے دیکھا جمالِ شاہِ حجاز
تجھے نصیب ہوئے نغمہ ہائے سازِ الست
سنی ہے تونے خدا کے حبیبؐ کی آواز
تجھی پہ اترا ہے خالق کا آخری پیغام
تھی بام و در پہ ترے جبرئیلؑ کی پرواز
مقامِ بدر وحنین و احد ترے جلوے
ہے جن سے سینے میں گرمی، ہے جن سے دل میں گداز
یہیں صحابہ کی سعیِ عمل ہوئی مشکور
یہیں تھا عشقِ جنوں خیز غلغلہ انداز
یہیں قبولِ درِ حق ہوئی دعائے حضورؐ
مثال بن گئی خدامِ شاہ کی تگ و تاز
یہیں پہ آیا نظر نخلِ کفر کا انجام
یہیں سے نصرت اسلام کا ہوا آغاز

خیال کی پرواز کا یہ عالم صرف پہلے بند میں ہے تو اگلے بندوں میں کیا ہوگا، اس کا اندازہ از خود لگایاجاسکتا ہے۔سرزمینِ حجاز کے ذکر میں مکۃ المکرّمہ کے مقامات مقدسہ مثلاً مولدِ شاہِ دیں ﷺ، غارِحرا ،حرمِ کعبہ، صفا ومروہ اور منٰی اور مدینہ منورہ میں روضۂ رسول اکرم ﷺ اور جنت البقیع کا حوالہ بالخصوص آیا ہے۔ ایک بند میں حضورِ اکرم ﷺ کے حضور استغاثہ پیش کرنے کی بھی سعی کی گئی ہے۔ترکیب بند کے اس حصے کو اس ترکیب بند کی روح قراردیاجاسکتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شفیعِ حشر! گنہگار پر بھی ایک نظر
گناہگار بھی ہے آج حاضرِ دربار
ہوں داد خواہ کہ مغموم و سوگوار ہوں میں
ہے دل شکستہ ، جگر ٹکڑے ٹکڑے سینہ فگار
زبان کھل نہیں سکتی کہ ہے مقامِ ادب
یہ بارگاہِ مقدس یہ آپؐ کا دربار
جو دل میں درد ہے وہ قابلِ بیاں بھی نہیں
جو داغ سینے میں ہیں کس طرح ہو ان کا شمار؟
حضورؐ! آپ پہ ظاہر ہے حالِ قوم و وطن
حضورؐ! جانتے ہیں آپؐ غیب کے اسرار
حضورؐ! ایک توجہ کہ وقتِ نصرت ہے
حضورؐ! ہوگئے دنیا میں ہم ذلیل و خوار
کرم کی ایک نظر ہو تو سب بدل جائے
نظامِ گردشِ دوراں، نظامِ لیل و نہار

استغاثہ پیش کرنے کے سلسلے میں بعض لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم کی بارگاہ میں کیوں پیش کیا جائے؟ براہِ راست رب تعالیٰ کی خدمت میں درخواست کیوں نہ کی جائے ۔تو اس سلسلے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف بھی بنی نوعِ انسان سے براہِ راست نہیں کروایا ہے ۔اس نے بھی جب اپنی ''احدیت'' کی پہچان کروانے کے لیے سورۂ اخلاص نازل فرمائی تو پہلا لفظ ''قل'' رکھاجورسول اکرمﷺ سے مخاطبہ تھا۔ علاوہ ازیں ''جآؤکَ'' والی آیت بھی ذہن نشین رہے۔مغفرت طلبی کے لیے حضور کے دربار میں حاضری کا حکم ہے۔استغاثے میں اپنے گناہوں پر ندامت اور مغفرت طلبی کا مقصد پنہاں ہوتا ہے۔

دوسرا اعتراض اس مصرعے پر ہوسکتا ہے :

ع حضورؐ! جانتے ہیں آپ غیب کے اسرار

تو اس ضمن میں عرض ہے کہ اللہ رب العزت نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے:

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۸۱ : ۲۴)

''اورنہیں ہے یہ(رسول)غیب (کی بات بتانے میں)ذرا بھی بخیل''

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیوب کی خبر دیتا ہے ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے۔ یا اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکامِ شرعیہ سے یا مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ کے احوال سے یا واقعاتِ بعدالموت سے اور ان چیزوں کے بتلانے میں ذرا بخل نہیں کرتا نہ اجرت مانگتا ہے۔نہ نذرانہ ، نہ بخشش''۔

اس لیے حضورِ اکرمﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کو''اسرارِ غیب'' کا دانندہ کہنا کوئی ''شرک'' کی بات نہیں ، ایک حقیقت کا اظہار ہے۔

حافظ مظہرالدین کی شاعری میں شعری اسالیب کی رنگارنگی بھی ہے اوران کے اشعار سے عقائد کی ضو بھی پھوٹ رہی ہے،عشق کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے اور سلامت روی کا انداز بھی جھلکتا ہے۔حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''اِنَّ خُلُقَ نَبِیّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ الْقُرْاٰنُ''

''وہ تمام اخلاق و اوصافِ حمیدہ جوقرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں آپﷺ میں بدرجہء اتم موجود تھے''۔

اس حدیث کا مفہوم پیشِ نظر رکھ کر ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

مری نگاہ میں قرآن کا ہے یہ مفہوم
ہے لفظ لفظ جمالِ حضورؐ کی تفسیر

حافظ صاحب نے بعض تلمیحات بہت خوبصورتی سے برتی ہیں۔ ایسی ہی تلمیح کی

ایک مثال ملاحظہ ہو:

قلم نے پہلے پہل نامِ پاک لکھا تھا
اسی سے شان بڑھی لوح اور قلم کی ہے

اس شعر میں ایک حدیثِ پاک کی طرف اشارہ ہے ۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے حاکم، بیہقی اور طبرانی سے ایک حدیث روایت کی ہے جس کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی خطا معاف کروانے کے لیے محمدﷺ کا واسطہ دیا تو اللہ تعالیٰ کے استفسار پر انہوں نے فرمایا تھا:

''جب تو نے میرے پتلے کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور جان آفرینی کی ،میں نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ عرشِ اعلیٰ کے ستونوں پر **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** لکھا ہوا ہے۔ تو میں نے جان لیا کہ جس ذات اقدس کا نام نامی تیرے اسمِ گرامی کے ساتھ مکتوب ہے یقیناً وہ تیری بارگاہ میں دیگر ساری مخلوق سے اعلیٰ ومحترم ہوگا''۔

ظاہر ہے آدم علیہ السلام کے جسم اقدس میں روح آنے کے فوراً بعد جس نام سے وہ آگاہ ہوئے وہ نام ''محمدﷺ'' کا تھا اور یہ ظاہر ہے قلم نے ہر تحریر سے قبل اسی نام کو اللہ کے نام کے ساتھ لکھا تھا۔شاعر نے اسی لیے لوح وقلم کی شان بڑھنے کا ذکر کیا کہ لوح پر پہلی تحریر بھی اسمِ ''محمدﷺ'' کی تھی اور اس قلم کی بھی پہلی نگارش وہی تھی۔

انسانوں نے جنابِ نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مدح بیان کرنے کی کوششیں تو بہت کیں لیکن ہمیشہ عجزِ فن کا اظہار کرنے پر مجبور ہوئے۔ حافظ مظہرالدین کہتے ہیں :

سخنوروں نے بہت زاویئے کیے ایجاد
نہ ہو سکی ترے حُسن و جمال کی تفسیر

ہمارے عہد کی گمراہیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بعض حلقے قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت سے استغنا کا پیغام دینے کی کوششیں کر رہے ہیں۔حدیث کی حجیت کو

چیلنج کیا جارہا ہے۔حافظ مظہرالدین نے اس مسئلے کو ایک شعر کے توسط سے روشن کرنے کی کوشش کی ہے:

اب سمجھنا ہے آسان قرآن کا
شارحِ وحی تیری زباں بن گئی

''ختمِ نبوت'' کا تصور،دینِ اسلام کی تکمیلیت کا اعلان نامہ بھی ہے اور نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی عظمت کی علامت بھی۔ دین مکمل ہونے کے بعد، انسانیت کے لیے، کسی اور پیغام کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اسی لیے اب کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ نبیِ کریم جنابِ محمد مصطفیٰﷺ کے بعد بھی کوئی ایسی ہستی ہے جس کا حکم ایسا ہی واجب العمل ہو جیسا کہ نبی کا ہوتا ہے۔ اب تو قرآن و حدیث کی روشنی میں امت کا ہر وہ فرد جو علمِ دین میں راسخ ہو ، پیش آمدہ مسائل میں امتِ مسلمہ کی رہبری کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ انگریزوں نے متحدہ بھارت میں ایک جعلی نبی پیدا کردیا جس نے جہاد کی فرضیت کو ساقط کرنے کی ناپاک کوشش کی۔اس ناپاک انسان کے دعویٰءِ نبوت کے بعد شعرائے کرام نے ایسے اشعار کہنا اپنے اوپر لازم کرلیا جو اعلانِ ختمِ نبوت کا اشاریہ بن سکیں۔حافظ مظہرالدین نے بھی اس مسئلے پر لکھا ہے:

ختم ہے سلسلہء وحی و نزولِ جبریلؑ
کوئی پیغام نہ آیا ترے پیغام کے بعد

دینِ اسلام کی تکمیلیت کے اعلان کے بعد جب رسول اللہﷺ نے وصال فرمایا تو دین کے نظری اور عملی (Theoretical and Practical) ڈھانچے کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری رسول اللہﷺ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بحسن و خوبی سنبھالی۔ اس لیے نعت گو شعراء اپنی نعتوں میں رسول اللہﷺ کے تذکرے کے ساتھ ہی آپﷺ کے ساتھیوں کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں۔حلقہ بگوشانِ رسولِ اکرمﷺ کے ذکر کی ترغیب سے مملوشعر ملاحظہ ہو :

آ کریں حلقہ بگوشانِ نبیؐ کی باتیں!
کہ ہے جاں بخش بہت ذکرِ ندیمانِ جمال

اس شعر کی معنویت پر غور کریں تو بہت سے نکتے سامنے آتے ہیں۔مثلاً

☆شاعر نے براہِ راست صحابہ کرام کے ذکر کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ ''حلقہ بگوشاں'' کی ترکیب استعمال کرکے اس مفہوم کو وسعت دیدی۔نبیِ کریمﷺ کا ''حلقہ بگوش'' ہونے کا مطلب ہے ،آپﷺ کی پیروی میں کامل انسان۔جس طرح غلام اپنے آقا کے حکم کے تابع ہوتا ہے بالکل اسی طرح نبی کریم کی تعلیمات کو اپنانے والا ہر شخص آپﷺ کا حلقہ بگوش ہے۔اس میں زمانی قید بھی نہیں ہے۔

☆نبیﷺ کی ذات کے لیے شاعر نے ''جمال'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔اس جمال کی تشریح کے لیے دفتر درکار ہیں۔مختصراً یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ حضورِ اکرمﷺ کی ذات کے صوری اورمعنوی (اسوۂ حسنہ) محاسن کو کسی ایک لفظ کے ذریعے اجاگر کرنے کے لیے''جمال'' سے زیادہ موزوں لفظ ذہن میں نہیں آتا۔

☆شاعرنے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے لیے ''ندیمانِ جمال'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔یعنی حسنِ مجسم کے ساتھی۔حسنِ تمام کے ساتھیوں کے لیے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب صحبتِ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے باعث ''جمیل'' بن گئے ۔

☆شاعر نے ندیمانِ جمال کے تذکرے کو''جاں بخش'' کہا ہے اور''جاں بخشی'' کے تاثر کو دوبالا کرنے کے لیے''بہت'' کا لاحقہ بھی لگایا ہے۔''جاں بخش'' کسے کہتے ہیں۔۔۔زندگی بچانے والی شئے کو جاں بخش کہتے ہیں۔جیسے زندگی بچانے والی دواؤں کو "Life Saving Drugs" کہتے ہیں۔کوئی ایک فرد یا افراد کا گروہ اسی صورت میں ''جاں بخش'' قرار دیا جاسکتا ہے جب اس میں جاں بخشی کے تصور کی عملی تجسیم کا جوہر پایا جائے۔

☆اب ذرا سوچئے مسلمان کی جان کس طرح بچائی جاسکتی ہے۔یہاں انسان کی نامیاتی زندگی کے بجائے نظریاتی زندگی کی بات ہے۔نظریاتی زندگی برقرار رکھنے کے لیے''اسلام''

کے عملی مفہوم کو سمجھنے اور اس کو نظامِ حیات کے طور پر نافذ کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے عملی نمونہ درکار ہے۔

☆نبی علیہ السلام کے علاوہ دنیا کا کوئی انسان ''معصوم'' نہیں ہے۔''ندیمانِ جمال'' محفوظ عن الخطاء ضرور ہیں، معصوم نہیں۔نبیﷺ کے بعد قیامت تک آنے والے انسان معصوم نہیں ہوں گے۔اس لیے نظریاتی زندگی قائم رکھنے کے لیے ایسی مثال موجود ہونا ضروری ہے جس میں وحیِ ربانی کی جاری مدد کے بغیر(یعنی تکمیل دین کے بعد) صرف قرآن وسنت کے متعین کردہ اصولوں کی روشنی کافی ہو۔ندیمانِ جمال یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ایسا ہی نظام قائم کرکے دکھایا۔اس ضمن میں اقبال سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے جو کہتے ہیں:

''اسلام کی آفرینش،عقلِ استقرائی کی آفرینش ہے۔اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچی ہے کیوں کہ اس نے اپنے ہی خاتمے کی ضرورت کو محسوس کرلیا ہے۔اس میں یہ ادراک گہرے طور پر موجود ہے کہ زندگی کو ہمیشہ بیساکھیوں کے سہارے پر نہیں رکھا جاسکتا اور یہ کہ ایک مکمل خودشعوری حاصل کرنے کے لیے انسان کو بالآخر اس کے اپنے وسائل کی طرف موڑ دینا چاہیئے''۔

☆نظریاتی زندگی (جو مسلمان کی اصل زندگی ہے)صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پیش کردہ اس عملی نمونے کی تجدید کی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جو نبی علیہ السلام سے بلاواسطہ سیکھا گیا ۔شاعر نے اسی لیے''ندیمانِ جمال'' کے تذکرے کو''جاں بخش'' کہا ہے۔

☆شعر میں ایک لفظ''ذکر'' آیا ہے۔ذکر کے لیے اللہ رب العزت نے فرمایا ہے:

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اورنصیحت کرتے رہیں یقیناً یہ نصیحت ایمان داروں کو نفع دے گی۔

شعر چوں کہ اردو میں لکھا گیا ہے اس لیے اردو لغات سے بھی''ذکر'' کے معانی جان لیتے

ہیں۔

ذِکْر (کس ذ،سک ک) اند نیز امث [قدیم]

ا۔زبان سے یاد کرنا' بیان کرنا' چرچا کرنا' تذکرہ' یاد آوری۔

۲۔یادِ خدا، اللہ کی حمد و ثنا، تسبیح و دعا۔

۳۔(تصوف) جس چیز کے توسط سے مطلوب یاد آوے، عام اس سے کہ وہ اسما یا فعلاً یا رسماً یا جسماً یا جسمانیۃً حاصل ہو،نسیان کی ضد۔

۴۔کسی چیز کو محفوظ کرلینا، کسی بات کا دل میں مستحضر کرلینا، حفاظت کرنا۔

اب شعر کے معنی یہ ہوں گے کہ نظامِ حیات کو علیٰ منہاج النبوۃ ، جس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم کرکے دکھایا ، وہی نظام تمہارے لیے یاد رکھنے کے قابل ہے جس میں ''حیات بخشی'' کا عنصر صرف اس لیے ہے کہ اس میں نبی علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت سے سرِ مو انحراف نہیں کیا گیا۔یاد رہے کہ یہی ذکر نبیﷺ کی حیاتِ طیبہ کے عملی مظاہرے کا سبب بنے گا۔اردو لغت کے معنی نمبر۳ پر غور کرنے سے یہ بات زیادہ واضح ہوسکتی ہے۔یہ نصیحت اہلِ ایمان کو ہمیشہ فائدہ دے گی۔

ایک شعر کے معنیاتی دائرے کی ضو ریزی کی وسعتوں کا احاطہ کرنے کی تھوڑی سی کوشش میں ہم کچھ دور نکل آئے۔پھر بھی شعر کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

اسی نعت میں حافظ مظہرالدین نے ایک اور شعر لکھا ہے:

مانگ اللہ سے اندازِ نگاہِ صدیقؓ
کوئی آساں نہیں سرکارؐ کا عرفانِ جمال

اس شعر میں بات اور واضح ہوگئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سردار، افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق سید نا ابو بکر ن الصدیق کو جیسا ''جمالِ نبوت'' کا عرفان حاصل ہوا ، وہ کسی اور کو نہیں ہوا، اس لیے اگر مسلمان کو حضورِ اکرمﷺ کی ذات اور

آپﷺ کے اسوۂ حسنہ کا عرفان حاصل کرنا ہے تو وہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح کا عرفانِ رسالت حاصل کرنے کی تمنا اور دعا کرے۔اقبال نے کہا تھا:

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوت ِ قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی

''اگر [اے مخاطب!]تو میری بات کی تحقیق کرے گا اور حضور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی آنکھ سے نبوت و رسالت کا حسنِ تمام (نبیﷺ کا جمال) دیکھے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ نبیﷺ کی ذات ہی تیرے قلب وجگر کی قوت ہے اور یہ جان کر تیرے نزدیک نبیﷺ کی ذات سے ،اللہ کی محبت سے بھی بڑھ کر محبت ہوجائے گی(کیوں کہ اللہ کا حسن مخفی ہے اور نبی کا حسن ظاہر)''۔

اسی نعت میں حافظ مظہرالدین نے خانوادۂ رسولﷺ کی محبت کا پیغام بھی دیا ہے کہ نبیﷺ سے ان کی قرابت کا یہی تقاضا ہے ۔پھر ان ہستیوں نے دین کی تنفیذ اور عملی مظاہرے میں خلافتِ راشدہ کی مکمل حمایت کرکے آنے والے زمانوں کے لیے دین کے ڈھانچے کو اصل صورت میں برقرار رکھنے میں مدد دی ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

حیدرؓ و فاطمہ ہیں باغِ محمدؐ کی بہار
ہیں حسینؓ اور حسنؓ سنبل و ریحانِ جمال

حافظ مظہرالدین کو یہ اختصاص بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ ان کی تخلیقات میں فارسی زبان کے ''سبکِ ہندی'' کا رچاؤ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ایک نعت ملاحظہ ہو:

مصحفِ روئے تو قرآنِ من است
ایں صحیفہ دین و ایمانِ من است

حجتے بر دین و ایمان ِ من است
شکرِ حق در نعت، دیوانِ من است
آتشِ عشقِ تو در جانِ من است
شعلہ در دامِ نیسانِ من است

”(یا رسول اللہ ﷺ!) آپ کا روئے انور ہی میرا قرآن ہے۔یہی صحیفہ میرا دین و ایمان ہے۔میرے دین اور ایمان کے لیے ایک حجت میرا دیوان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ دیوان مبنی بر نعتِ مصطفٰی ﷺ ہے۔آپ ﷺ کے عشق کی آگ میری جان میں ہے۔شعلۂ عشق میرے نیستاں کے جال میں ہے“۔

ایں عجب در عاشقی شانِ من است
پارہ پارہ جیب و دامانِ من است
قبلۂ دل، کعبۂ جان من است
شہرِ محبوبی کہ ایمانِ من است
فقرِ تو سرمایۂ جانِ من است
عظمتِ کونین قربانِ من است
اے سحابِ لطف! اے ابرِ کرم
بیں کہ تشنہ کشتِ ویرانِ من است

”(یا رسول اللہ [ﷺ]!)عاشقی میں میری عجیب شان ہوگئی ہے۔میرا گریبان اور دامن تار تار ہوگیا ہے۔ایک محبوب (رسول اللہ ﷺ) کا شہر میرے دل کا قبلہ، جان کا کعبہ اور میرا یمان ہے۔آپ ﷺ کا فقر میری جان کا سرمایہ ہے [اس لیے] دونوں جہان کی عظمتیں مجھ پر قربان ہیں۔اے لطف کے سحابؑ اے کرمؑ کے ابر، آپ ملاحظہ فرمائیے کہ میری کھیتی پیاسی اور اجڑی ہوئی ہے“۔

کارواں در راہ و من در منزلے

ہر نشانِ جادہ اش جانِ من است
می نوازد ہر زماں با جلوۂ
بندہ پرور شانِ سلطانؐ من است
از فیوضِ نعتِ ختم المرسلیںؐ
آسماں گرداں بر ایوانِ من است

”قافلہ راہ میں ہے اور میں ایک منزل میں ہوں۔اس قافلے کے گزرنے سے بننے والی پگڈنڈی ہی میری جان ہے......میرے بادشاہ[محمد مصطفٰی ﷺ] کی شان یہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں اپنے جلوے سے نوازتے رہنے کی صورت میں بندہ پروری کا مظاہرہ فرماتے ہیں......جنابِ ختم المرسلین ﷺ کی نعت لکھنے کا فیضان ہے کہ آسمان میری بیٹھک کے گرد چکر لگا رہا ہے“۔

یہ ہے نعتیہ شاعری کا وہ ارژنگ جو اردو اور فارسی زبانوں میں حافظ مظہرالدین کے تخلیقی وجدان نے سجایاہے۔ اس شاعری میں ،نعتیہ شاعری کے ادبی پہلوؤں اور شرعی تقاضوں کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے۔

ادبی اور شرعی تقاضوں کے حوالے سے یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ'بشری کلام ہونے کے ناتے' حافظ صاحب کے کلام میں کچھ اسقام بھی پائے گئے ہیں جن کی نشاندہی ضروری ہے۔

☆حافظ صاحب نے کہیں کہیں مدینہ منورہ کے لیے”یثرب“ کا لفظ استعمال کیا ہے جوممنوع ہے۔حفیظ تائب نے ایک شعر میں اس کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔

حکمِ نبی ہے جو اسے یثرب پکار لے
توبہ کے بعد وہ کہے دس بار طیّبہ

☆اسی طرح اردو ادب میں فارسی کی تقلید میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کو نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔جو لغوی اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔وہ لفظ ہے”کبریا“۔قرآنِ

کریم میں کبریا دو جگہ استعمال ہوا ہے :

لَکُمَا الْکِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ ط [۷۸:۱۰]

اور تم دونوں کو (زمین میں) بڑائی مل جائے۔

وَلَهُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ص وَهُوَالْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ٥ [۳۷:۴۵]

تمام بزرگی اور بڑائی آسمانوں اور زمین میں اسی کی ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

ان آیات میں ''کبریا'' صفت کے طور پر مذکور ہے۔کسی نام کے لیے نہیں۔تفسیر احسن البیان میں صحیح مسلم ،کتاب البر،باب تحریم الکبر، کے حوالے سے ایک حدیثِ قدسی نقل کی گئی ہے جس میں ''کبریا'' بڑائی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے:

''اَلْعَظْمَةُ اِزَارِیْ وَالْکِبْرِیَآءُ رِدَآئِیْ''

''عظمت میری ازار اور بڑائی میری چادر ہے''

میر تقی میؔر نے بھی یہ لفظ انہی معنی میں استعمال کیا ہے ؎

میؔر ناچیز مشتِ خاک اللہ
ان نے یہ کبریا کہاں پائی

اس کے برعکس حافظ مظہرالدین کے کلام میں بھی کہیں کہیں ''کبریا'' اللہ کے نام کے طور پر استعمال ہوا ہے جو مناسب نہیں ہے۔

☆ایک شعر ہے:

شہِ کونین کی نازک بدنی کے صدقے
دل و جاں سیدِ مکی مدنی کے صدقے

اس شعر میں ''نازک بدنی'' انتہائی درجہ سوقیانہ ترکیب ہے۔کسی عام مرد کو بھی اگر نازک بدن کہا جائے تو یہ اس کی مردانہ وجاہت کے منافی ہوگا۔چہ جائے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے لیے ایسی بات کہی جائے۔

۞تاہم ان تسامحات کی نشاندہی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ حافظ مظہرالدین نے خاص طور پر

کوئی غلطی کی ہے۔یہ اغلاط تو ہمارے ادب کا حصہ ہیں اور اس میں بڑے بڑے جغادری شعراء کے نام آتے ہیں۔اس لیے ہوسکتا ہے کہ حافظ مرحوم کے حینِ حیات کوئی ان معاملات کی نشاندہی کرتا تو وہ جواب دیدیتے:

ع　ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

بہر حال اس مضمون کے قاری اور مستقبل کے نعت گو کے لیے یہ نکات گرہ میں باندھ لینے کے قابل ہیں اس لیے ہم نے یہاں کچھ اشارے کر دیئے۔

اب چند ایسے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں تغزل ،سوزِ عشقِ نبوی، زبان و بیان کی خوبیاں اور شعری حسن موجود ہے:

اے چارہ سازِ دردو الم! چشمِ التفات
میری حیات، دردو الم ہو کے رہ گئی

دیکھ لیتا ہوں تصور میں جو دربارِ رسولؐ
مجھ کو بے پردہ نظر آتے ہیں انوارِ رسولؐ

جز نبیؐ کون ہے دانندۂ اسرارِ خدا
جز خدا کون ہے دانندۂ اسرارِ رسولؐ

دیکھ! ویران نہ ہوجائے محبت کا جہاں
جاگ ! اے جذبۂ سرشارِ فداکارِ رسولؐ

میں یہ کیوں یقین کرلوں کہ وہ رہ نجات کی ہے
کہ جہاں نظر نبیؐ کا کوئی نقشِ پا نہ آئے

حُکم تیرا حُکمِ داور،فعل تیرا فعلِ حق
قول تیرا موجِ کوثر،بات تیری انگبیں

جب صانعِ قدرت نے حسیں نقش بنائے
اے خسروِ خوباں! تجھے شہکار بنایا

شکرِ خدا کہ امتِ خیرالوریٰ میں ہوں
خوش بخت ہوں کہ میرے پیمبر حضورؐ ہیں
راہِ نبیؐ میں غیر پہ تکیہ حرام ہے
اے عشق آ کہ بے سروساماں سفر کریں

نعت؛ دعوت الی الخیر یعنی خیر کی ترغیب کا ذریعہ بھی ہے۔دین کی عملی صورت نمایاں کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امت کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنی اصل یعنی دین کے اصلی مظاہر کی طرف لوٹنے کی دعوت دی جائے۔حافظ مظہرالدین نے بھی عشق کی سرشاری کے ساتھ ،نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے دعوت الی الخیر دی ہے:

غم کی کیفیتوں سے کیا حاصل
حلقۂ صاحبِ سرور میں آ
عقل کی قیل و قال میں نہ الجھ
غیب کو چھوڑ کر حضور میں آ
دامِ بوجہل و بو لہب سے نکل
شاہِ کونین کے حضور میں آ
عشقِ صدیقؓ و سوزِ روحِ بلالؓ
پردۂ غیب سے ظہور میں آ
آ کہ آغازِ نئے دور کی تمہید کریں
ذرے ذرے کو حریفِ مہ و خورشید کریں
عشق کے نور سے دنیا میں اجالا کردیں
بوذرؓ وخالدؓ و فاروقؓ کی تقلید کریں
صدق و اخلاص و یقیں کا وہ سبق دہرائیں
جس کو سن کر لبِ جبریل بھی تائید کریں

کارواں لے کے سوئے منزلِ جاناں دوڑیں
وقت اگر ساتھ نہ دے ، وقت کی تجدید کریں

یہ ایسی ہی دعوت ہے جیسی غالب نے اپنے ایک مصرع میں دی تھی :

ع بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

’’آ کہ ہم آسمان کی گردش کے قاعدے کو [جو ہمارے موافق نہیں ہے]بدل ڈالیں [اور یوں اپنے مقاصد حاصل کریں]‘‘

اقبال کا تو پورا کلام ہی دعوتِ فکر وعمل کا استعارہ ہے اس لیے اگر حافظ مظہرالدین کے درجِ بالا اشعار کو پیامِ اقبال کی تجدیدی کاوش قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

چھوٹی بحر میں شعر گوئی ہمیشہ سے مشکل رہی ہے ۔کیوں کہ ایسی بحر میں شاعر کو بہت کم لفظوں میں اپنی بات کہنی پڑتی ہے۔ شعراء ایسی بحروں میں اشعار کہہ کر اپنی قادرالکلامی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔لیکن کامیابی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔حافظ مظہرالدین کی ایک نعتیہ غزل ایسی ہے جسے میں یہاں مکمل نقل کرنا چاہتا ہوں:

ظلمتِ غم ہے میری شب
اک جلوہ اے ماہِ عرب
ہم عجمی وہ شاہِ عرب
عشق ہے کیا آزاد نسب
دامن بھی بھردے میرا
بخشنے والے ذوقِ طلب
وجہ اللہ صورت تیری
قرآں تیری جنبشِ لب
کیا عرشی اور کیا فرشی
سب تیرے خدامِ ادب

لاکھوں درود اور لاکھوں سلام

بھیج اُن پر پیہم یا رب!

یہ مختصر بحر بحرِ متدارک مثمن مخبون مسکن محذوذ ہے۔اس میں فعلن فعلن فعلن فع کے وزن پر ہر مصرع ہوتا ہے اور ہر بیت میں اس کی تکرار ہوتی ہے۔کم لفظوں میں معنیاتی ضو پاشیاں اور لمعہ ریزیاں حافظ مظہرالدین کی درج بالا نعت میں محسوس کی جاسکتی ہیں۔

آخر میں کچھ ایسے اشعار پیش کرتا چلوں جن سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ نعت گوئی حافظ مظہرالدین کے لیے کیا ہے؟ اور یہ کہ انہوں نے اس فن کو کیسے اپنایا ہے۔

ہوئی تقسیم جب صبحِ ازل کونین کی نعمت

مرے حصے میں حُبِّ ساقیٔ کوثر کا جام آیا

اسی بارگاہ میں ہے مرا عشق نغمہ پیرا

جہاں عقلِ خود نما کو نہیں اذنِ لب کشائی

اے ناشناسِ لذتِ سوزو گدازِ عشق!

آ مجھ سے سن لذیذ حکایت حضورؐ کی

لذت عجیب مدحِ شہِؐ بحروبر میں ہے

اک کیفِ مستقل مرے قلب وجگر میں ہے

صرف ان چند اشعار ہی سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ شاعر کا حضورِ اکرم ﷺ سے تعلق قلبی، روحانی اور مستقل نوعیت کا ہے اور یہی گرمیٔ نشاطِ تصور اسے نغمہ سنجی پر اُکسا رہی ہے۔

غالب وہ خوش نصیب شاعر ہے کہ بادہ خوار ہونے کے باوجود اس کے کلام کی حرارت شعرائے حمد و نعت کو اتنی متاثر کرتی ہے کہ وہ حمد و نعت کے پورے پورے دیوان غالب کی زمینوں میں مرتب کردیتے ہیں۔بہت سے معروف نعت گو شعراء نے غالب کی زمینوں میں نعتیں کہی ہیں۔احمد رضا خاں بریلویؒ کی بڑی مشہور نعت ہے :

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفیٰؐ کہ یوں

کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

فاضلِ بریلوی کا یہ مقطع، غالب کی غزل کی زمین میں ہے۔غالب نے کہا تھا:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالب ایک بار، پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب کے مقطع کی روشنی میں فاضلِ بریلوی کا مقطع نعت کے حوالے سے اسی قسم کا تعلی آمیز ہے۔جس طرح غالب نے اظہارِ تعلی کیا اور اپنے کلام کو فارسی کے مقابلے میں برتر ظاہر کیا اسی طرح احمد رضا خاں نے نعتیہ شاعری میں اپنے سخن میں شعریت وشریعت کے امتزاج پر فخر کیا۔وہ کہتے ہیں :

جو کہے شعرو پاسِ شرع دونوں کا حسن کیوں کر آئے

لا اسے پیشِ جلوۂ زمزمۂ رضؔا کہ یوں

حافظ مظہرالدین نے بھی غالب کی اسی زمین کو اپنایا اور دوشعر اتنے غضب کے کہہ دیئے کہ ایوانِ نعت میں سدا ان کی گونج سنائی دے گی:

سوچ میں تھے الم نصیب کیسے سکوں سے ہوں قریب

میں نے درودِ پاک انہیں پڑھ کے سنا دیا کہ یوں

جو یہ کہیں کہ فقر کی شان میں دل کشی کہاں

اُن کو درِ رسولؐ کا مجھ سا گدا دکھا کہ یوں

ان دونوں اشعار میں زباں زدِ عام ہوجانے کی خوبی موجود ہے۔آخری شعر میں تو شانِ فقر میں شاعر کی عاجزی کا اظہار، کمال کو پہنچ گیا ہے۔

حافظ مظہرالدین کے کلام کا یہ سرسری مطالعہ پیش کرتے ہوئے مجھے احساس ہورہا ہے کہ میں نے بساط بھر گفتگو کرلی ہے۔اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختتامی سطور میں احسان دانش اور محمد ایوب غنی سے مستعار لوں۔احسان دانش لکھتے ہیں:

’’میں نے پاکستان میں بہت کم لوگ حافظ مظہرالدین صاحب جیسے رقیق

القلب اور عاشقِ رسولؐ دیکھے ہیں اور دیکھا جائے تو نعت کا حق عاشقِ رسولؐ ہی کو پہنچتا ہے اور وہی کلام دلوں میں گداز اور پلکوں پر بادلہ لگاتا ہے۔جو لوگ مشق و مزاولت کے بل پر نعت کہتے ہیں، وہ فنی طور پر خواہ کتنی ہی بلندکیوں نہ ہو،دل کے دروازے پر دستک نہیں دیتی،سماعت سے الفاظ اچٹتے چلے جاتے ہیں،مگر دل سے ایک مصرع بھی کہا جاتا ہے تو اس کے تاثر سے پہلے تو شاعر خود ڈھیر ہوجاتا ہے اور پھر اس تاثر اور سوز کی کرنیں دوسروں تک مار کرتی ہیں......حافظ مظہرالدین صاحب کی ایک ایک نعت پر لکھا جائے تو دفتر ہوسکتا ہے‘‘۔

محمد ایوب غنی لکھتے ہیں:

’’دنیائے شعرو شاعری میں نعت کو بعض نادان، مدِّ فاضل تصور کرتے ہیں اور اس لیے ان کے نزدیک نعت کے فنی قواعد و محاسن کا لحاظ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔یہ طرزِ عمل نہ صرف فن کی توہین وتخریب کے مترادف ہے بلکہ خود نعت کی عظمت و پاکیزگی کے پیشِ نظر ایک طرح کی بے ادبی و گستاخی ہے۔محبوب کے حضور ہر پیش کش حسین ومتوازن انداز میں پیش کی جانی چاہیے۔ظاہر ہے کہ فن کا منصب تحسین و تزئین ہی ہے۔حافظ صاحب کی نعتیں الحمدللہ! فنی اعتبار سے بھی بے داغ ،حسین اور مزین ہوتی ہیں‘‘۔

ان وقیع آراء کی روشنی میں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حافظ مظہرالدین کے کلام کی تفہیم اور اس کے ادبی محاسن کی نشاندہی میں میری کوشش کے حوالے سے میرتقی میرؔ مجھے یہ کہہ کر متنبہ کررہے ہوں:

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ماخذ ومنابع:

۱۔القرآن،وحیِ منظوم، سیماب اکبرآبادی
۲۔القرآن :ترجمہ،کنزالایمان
۳۔میلادالنبیﷺ ، ڈاکٹر طاہرالقادری
۴۔کلیاتِ مظہر، مرتبہ: ارسلان ارسل، لاہور
۵۔جاوید نامہ، علامہ اقبال
۶۔ The Meaning of Criticism, Kalimuddin Ahmad (First Edition,1982,National Book Foundation Islamabad)
۷۔کشاف تنقیدی اصطلاحات، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۸۔نسخہ ہائے وفا،فیض احمد فیضؔ
۹۔حدائقِ بخشش،احمد رضا خاں بریلوی
۱۰۔امیجز کی جمالیات، رؤوف نیازی، اجمال،کراچی، شمارہ ۲،ص۱۱
۱۱۔تفسیرِ عثمانی
۱۲۔صحیح بخاری
۱۳۔خصائص الکبریٰ،(جلال الدین سیوطی)
۱۴۔تجدیدِ فکریات،ڈاکٹر وحیدعشرت(ترجمہ تشکیلِ جدیدالٰہیاتِ اسلامیہ،اقبال)
۱۵۔اردولغت، اردولغت بورڈ، کراچی
۱۶۔رموزِ بیخودی، علامہ اقبال
۱۷۔وسلموا تسلیما، حفیظ تائب
۱۸۔تفسیر احسن البیان
۱۹۔کلیاتِ میر
۲۰۔کلیاتِ فارسی، غالب

....

[مطبوعہ: جسارت ،سنڈے میگزین، کراچی، 16 ،23 ،30 مارچ 6 ، 13 ، اپریل 2014 ء
نعت رنگ :شمارہ 23 ،...... اگست 2012 ء]

انورِ مسعود کا شعرِ عقیدت ......باریاب

نعتیہ شاعری کی عظمت کا خیال ایک عرصے تک انور مسعود جیسے قادرالکلام شاعر کو نعت کہنے سے روکتا رہا۔

حفیظ تائب مرحوم نے نعتیہ شاعری کی ترویج کا بیڑا اٹھایا تھا اور ان کی ترغیب پر بہت سے شعراء نے نعتیہ ادب تخلیق کیا۔ انور مسعود کے لیے بھی حفیظ تائب کی ترغیب ہی نعت گوئی کا محرک بنی۔انور مسعود نے کتاب کی ''تقدیم'' میں لکھا ہے :

> ''مجھے یاد پڑتا ہے کہ حفیظ تائب مرحوم نے ایک روز دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ بلاشبہ نعت لکھنا آسان نہیں لیکن نعت ضرور لکھنی چاہیے کہ مدحِ پیغمبرؐ بھی درود کے ذیل میں آتی ہے۔ لہٰذا اپنی بساط کے مطابق اس کارِ ثواب سے محروم نہیں رہنا چاہیے''۔

حفیظ تائب کی وہ بات انور مسعود کے دل میں گھر کرگئی اور انہوں نے نعت گوئی کے لیے ذہن و دل کو آمادہ کرلیا۔ پھر انہیں مدینہ منورہ کی حاضری کا موقع میسر آگیا اور انہوں نے جدہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے ایک فارسی قطعہ کہا جس میں نعتیہ شاعری کا بلند آدرش ان کا رہنما بنا اور انہوں نے حضورِ اکرمﷺ سے ان کے شایانِ شان ''حرفِ ثنا'' کی بھیک مانگی۔ متعلقہ شعر ملاحظہ ہو :

یا سکوتم را بہ بزمِ خود پذیر
یا بدہ حرفے کہ شایانت بود

(یارسول اللہﷺ !یا تو میرا سکوت آپ اپنی بزم میں قبول فرمالیجیے یا مجھے ایسا حرف عطا فرمادیجیے جو آپ کے شایانِ شان ہو!)

ہر با ہوش شاعر نے اپنی بے بضاعتی کے اظہار کے طور پر ہمیشہ یہی کہا ہے کہ وہ حضورِ اکرمﷺ کے شایانِ شان مدح نہیں کرسکتا۔اسی احساس کی جھلک درجِ بالا شعر میں ہے ۔یہاں شاعر کا احساسِ بے بضاعتی اس کی تمنا کی صورت میں متنِ شعر بنا ہے۔

یہی احساسِ بے بضاعتی ہے جس نے انور مسعود صاحب سے یہ چھ مصرعے کہلوائے :

فقط حصولِ سعادت کا اک بہانہ ہوا
کسی سے نعتِ پیمبر کا حق ادا نہ ہوا
کوئی بھی اس کی تجلّی سے آشنا نہ ہوا
نظر کو تنگیِ داماں سے کب گِلہ نہ ہوا
وہ ظلمتوں کے سمندر کو پیرتا ہی گیا
وہ روشنی کا کنول تھا کہ تیرتا ہی گیا

انور مسعود کی شاعری کا منظر نامہ حضورِ اکرم کی حیاتِ طیبہ کے منور گوشوں سے مستنیر ہے اور اس شاعری کا اسلوب بہت سادہ بلکہ سہلِ ممتنع ہے۔حضورِ اکرم کا مطمحِ نظر کیا تھا، اس کی بڑی مؤثر، دل کش اور سادہ تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :

وہ چاہتا تھا رہ و رسمِ زندگی بدلے
بگڑ گیا تھا جو اندازِ بندگی بدلے
بھٹک رہا تھا جو اُسلوبِ آگہی بدلے
اسے یہ دھن تھی کہ اندر سے آدمی بدلے
وہ دورِ حضرتِ گردوں رکاب کیا کہنا
وہ انقلابِ سعادت مآب کیا کہنا

اسی طرح عہدِ جاہلیت اور عہدِ اسلام میں جو فرق تھا اس کا نقشہ اس شعر میں عکس بند کیا گیا ہے:

آپ کی دانشِ بیِّن سے ہوا ہے روشن
علم کا نور ہے کیا جہل کی ظلمت کیا ہے

حضورِ اکرم ﷺ کی مدح میں حضورِ اکرم کی عملی زندگی کی تصویرکشی کا سلسلہ الطاف حسین حالؔی سے شروع ہوا تھا۔ بعد کے شعراء نے اپنی شاعری میں اسی پہلو کو اجاگر کیا۔انور مسعود صاحب نے بھی اسی پہلو کو نمایاں کرکے جدید نعتیہ شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ مثلاً:

ہے اُنس و اُخُوَّت کا وہ بے مثل نمونہ
جو آپ سے دنیا کو ملا درسِ مُساوات

فارسی شاعری میں انور مسعود کا لہجہ سبکِ ہندی یا سبکِ اقبال والا ہے۔سبکِ ہندی میں فارسی کا کلاسیکی شعری آہنگ نمایاں ہوتا ہے جسے اقبال نے اس قدر اپنایا کہ بعض نقادانِ فن نے اس آہنگ کو سبکِ اقبال کا نام دیا ہے۔ اس شاعری میں اپنے ذاتی احساسات اور انتہائی درجہ والہانہ پن شعرِ عقیدت کا متن بنتا ہے۔یہاں غزل کی داخلیت اپنے عروج پر ہوتی ہے۔انور مسعود کی فارسی نعتیہ شاعری کی صورت میں فارسی کی بھولی بسری تاریخ کی تجدید بھی ہے اورتخلیقی ادب کی ایک بڑی روایت کا عکس بھی۔کاش اس شاعری میں انور مسعود کا قلم زیادہ رواں ہوتا! نعت کے روایتی مضامین کو انتہائی درجہ احساساتی سطح پر عکس ریز کرنے کی مثال درجِ ذیل اشعار میں ملتی ہے:

تنہا نیامدم بہ اماں گاہِ رحمتت
با کاروانِ گریۂ پیہم رسیدہ ام
عصیاں شعار نیست بعالم کسے چو من
ہستی تو آں کریم کہ من ہم رسیدہ ام

با گرد نے زبارِ خجالت خمیدہ اے
در پیشگاہِ لطفِ مجسم رسیدہ ام
تا زنگ تیرگی زوجودم جدا شود
در بارگاہِ نیر اعظم رسیدہ ام
انور بہ اوجِ کوکبِ بختم نگاہ کن
اندر حضورِ خواجۂ عالم رسیدہ ام

فارسی کا رچاؤ اور اس شعری آہنگ کا بعینہٖ اسلوب تو ترجمے میں اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے۔تاہم آج کا قاری فارسی سے اس طرح متمتع نہیں ہوسکتا ہے اس لیے ان اشعار کا مفہوم اردو میں بھی پیش کردینا چاہیے۔

انور مسعود کہتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ! آپ کی بارگاہ میں جو در اصل آپ کی رحمت کی صورت میں عالمین کے لیے امان گاہ ہے، میں تنہا نہیں آیا ہوں بلکہ مسلسل کیفیتِ گریہ کو اپنے ساتھ لے کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ دنیا میں میری طرح کوئی بھی گناہگار نہیں ہے۔لیکن آپ ﷺ کی ہستی اس قدر کریم ہے کہ مجھ ایسا گناہگار بھی یہاں پہنچ گیا ۔ ایسی گردن کے ساتھ جو شرمندگی اور ندامت کے بوجھ سے خم ہے، آپ ﷺ کے لطفِ مجسم کی پیش گاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ میں سورج کی بارگاہ میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ میرے وجود پر اندھیرے کی وجہ سے جو زنگ چڑھ گیا ہے وہ دور ہوجائے۔ اے انور میری قسمت کے ستارے کی بلندی تو دیکھ! کہ میں خواجۂ عالم جناب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں''۔

انور مسعود کی اس نعتیہ غزل میں فارسی شعرا کے اجتماعی رویے کی جھلک موجود ہے جس میں عموماً اپنے گناہوں پر ہونے والا احساسِ ندامت جزوِ شعر بنتا ہے جیسے درجِ ذیل شعر میں ہے:

مذنبے چوں من نباشد در تمامی امت
رحم کن بر حالِ ما یا رحمت للعٰلمین

(یا رحمۃً للعٰلمین! مجھ جیسا گناہگار تو آپ کی امت میں کوئی بھی نہیں ہوگا، اس لیے مجھ پر رحم فرمائیے!)

انور مسعود کی نعتیہ شاعری میں ایک پہلو بڑا اہم اور قابلِ تقلید ہے۔انہوں نے ایک نعتیہ نظم بچوں کے لیے لکھی ہے اور واقعتاً بچوں کی سوجھ بوجھ کا خیال کرکے ایسی ہی زبان استعمال کی ہے کہ بچوں کے لیے مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔اس نظم میں تلمیحات بھی اس طرح آئی ہیں کہ ان کا مفہوم جاننے میں زیادہ دقت نہ ہو، مثلاً:

جب وہ سفر پر جایا کرتے
سر پر بادل سایہ کرتے
ان کے بول بہاروں جیسے
اور اصحاب ستاروں جیسے
ان سا پیارا اور نہ کوئی
ان سے بچھڑ کر لکڑی روئی
وہ مہمانِ عرشِ معلیٰ
شانِ محمد اللہ اللہ

حضورِ اکرم کے سائے کا نہ ہونا مشہور ہے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ کی یہ خصوصیت تھی کہ جب آپ دھوپ میں چلتے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک بادل مستقل آپ پر سایہ کیے رہتا تھا۔درجِ بالا اشعار میں پہلا شعر اسی حقیقت کا عکاس ہے۔اس تلمیح کے استعمال میں یہ خوبی ہے کہ مفہوم کی ترسیل کے ضمن میں یہ خود مکتفی ہے، یعنی اس شعر کے مفہوم تک پہنچنے کے لیے تلمیحی نوعیت کے پس منظر سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔ اصحابِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ''ستاروں جیسے'' کہنے سے بھی یہ بات از خود واضح

ہوگئی۔حدیث شریف میں ''اصحابی کالنجوم'' آیا ہے لیکن یہاں بچوں کے لیے اس حدیث کے مفہوم کی آگاہی ضروری نہیں ۔وہ خود اس شعر کا مفہوم پا لیں گے۔ہاں حضورِ اکرم ﷺ سے بچھڑ کر لکڑی کے رونے والی روایت بچوں کو بتانی پڑے گی کہ جب حضورِ اکرم ﷺ کے لیے مسجدِ نبوی میں منبر بنادیا گیا اور آپ نے ایک کھجور کے تنے پر بیٹھ کر خطبہ دینے کے بجائے منبر پر جلوہ افروز ہوکر خطبہ دیا تو وہ کھجور کا تنا رونے لگا تھا۔آخری شعر میں مہمانِ عرشِ معلیٰ کہہ کر شاعر نے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ کردیا ہے جو بچے بچے کو معلوم ہے۔

ہماری شعری روایت میں عربی اور فارسی کی ملی جلی زبان کا ایک شعر بڑی شہرت پا گیا ہے جس کے خالق کے بارے میں محققین کی آراء مختلف ہیں۔بعض محققین نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کا نام لیا ہے۔بہر حال یہاں اس شعر کا ذکر اس کے متن کو ظاہر کرنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے جو درجِ ذیل ہے :

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس شعر میں بیان کی جانے والی حقیقت کی تجدیدِ متن کی کوشش، مختلف شعراء نے کی ہے۔ انور مسعود کے ایک شعر میں اس متن کو بڑی خوبصورتی اور سادگی سے نمایاں کیا گیاہے۔وہ کہتے ہیں۔

خدا کے نور کا مظہر ترا اجالا ہے
خدا کے بعد بڑی تیری ذات والا ہے

اسی مضمون کو ایک مطلع میں بیان کیا ہے:

بعدِ خدا بزرگتر، کون حضور کے سوا
اتنا عظیم ہے بشر، کون حضور کے سوا

علامہ اقبال نے دانشِ حاضر کو مختلف انداز سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے، مثلاً:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

علامہ کے فکری نظام میں ''عذابِ دانشِ حاضر'' کے مفاہیم کی تشریح کہیں اور موجود ہے لیکن اس شعر میں یہ ترکیب محتاجِ تشریح ہے۔انور مسعود صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس متن کی تجدید اس طرح کی ہے کہ ''دانشِ حاضر'' کی تشریح اور اس کی مضرت رسانی کا اظہار بھی ہوگیا ہے۔

کچل گئی ہے نئی روشنی تو روحوں کو
دلوں کو دانشِ حاضر نے مارڈالا ہے

انور مسعود صاحب نے درجِ بالا شعر میں دانشِ حاضر کی تخریب کاری کا ذکر کرتے ہوئے اگلے شعر میں ہی دانشِ حاضر کے زہر کا تریاق بھی بتادیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

فروغِ جاں بھی وہاں ہے، فراغِ خاطر بھی
جہاں جہاں بھی تری روشنی کا ہالہ ہے

یہ بات میں اپنے متعدد مضامین میں عرض کرچکا ہوں کہ نعتیہ شاعری میں **''محمد رسول الله''** کے ساتھ ساتھ **''والذین معه'''** کا بیان لازمی ہے۔یہ اس لیے کہ حضورِ اکرمﷺ کے لائے ہوئے نظام کی کشود وحیِ ربانی کی روشنی اور ''عقلِ استقرائی'' کی سطح پر خلفائے راشدین ہی کی عملداری میں ہوئی تھی۔اس لیے آپﷺ کے لائے ہوئے نظام کی تنفیذ جس طرح غیر معصوم لیکن محفوظ عن الخطاء گروہ نے کرکے دکھائی اب رہتی دنیا تک وہی نظام پوری انسانیت کے لیے کارگر ثابت ہوگا۔صرف نبیﷺ کی کامیاب حکمتِ عملی کے بارے میں تو عام انسان کہہ سکتا ہے کہ نبیﷺ کا تو پورا نظام وحیِ ربانی کی رہنمائی میں ہی چل رہا تھا جبکہ عام انسانوں کو ایسی کوئی رہنمائی نہ میسر ہے نہ ہی میسر ہوسکتی ہے...... اس لیے نبی علیہ السلام کے لائے ہوئے اور قائم کیے ہوئے نظام کو علیٰ منہاج النبوت برقرار رکھنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔لیکن امت میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ نہ تو صحابہ

کرام معصوم عن الخطا ہیں اور نہ ہی ان کے افعال کو وحیِ ربانی کے موجود خزانے ''کتاب اللہ'' اور رسول اللہﷺ کی احادیث (حضورﷺ کے اقوال، احوال، افعال اور تقریر) کے سوا کسی اور ذریعے سے کوئی رہنمائی ملی ہے یا مل سکتی ہے......اس لیے حضورِ اکرمﷺ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جو نظام چلا کر دکھا دیا وہ رہتی دنیا کے عام انسان بھی چلا سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ راسخ العقیدہ شعراء حضورِ اکرمﷺ کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ذکر بھی اپنے اشعار میں اسی احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔انور مسعود کے ہاں بھی شیخین کی منقبت ملتی ہے۔نمونے کے طور پر درجِ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :

آئینِ دوستی کی بقا اس کے نام سے
دنیا میں اعتبارِ وفا اس کے نام سے
شرح و مراد و معنی و مفہوم پا گئے
ایثار و صدق و جُودو سخا اس کے نام سے

(منقبت بحضور سیدنا صدیقِ اکبرؓ)

کس کو ایسی خوئے درویشی ملی؟
کس کو حاصل ہو سکا ایسا جلال؟
عدلِ فاروقی جہاں میں لاجواب
دانشِ فاروقِ اعظمؓ بے مثال

(فارقِ اعظمؓ)

جنابِ حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی نظامِ مصطفیٰﷺ کے عملی نفاذ کے لیے اہم ترین قربانی ہے جس کی یاد قیامت تک قائم رہے گی!...... انور مسعود نے بھی اس قربانی کا ذکر کرکے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوخراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

مثالِ مہرِ جہاں تاب ضو فشاں ہے حسینؓ
ہمہ خلوص ہے، ایثارِ بیکراں ہے حسینؓ

حیات راز ہے اور اس کا رازداں ہے حسینؓ
ریاضِ دہر میں خوشبوئے جاوداں ہے حسینؓ
وہ ظالموں کو ہمیشہ کا انتباہ بھی ہے
اور اپنی ذات میں تفسیرِ لا اِ الہٰ بھی ہے

حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس منقبت میں آخری مصرع علامہ اقبال کی مثنوی ''رموزِ بیخودی'' میں بیان کیے ہوئے نکات کی طرف توجہ مبذول کروا رہا ہے۔علامہ اقبال نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوخراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا :

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

(مسلمان اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا غلام نہیں ہے، اس کا سر کسی دنیاوی طاقت کے آگے نہیں جھک سکتا)

شاعرِ ''باریاب'' نے ''تفسیرِ لا الہٰ'' کہکر وہ مفہوم واضح کردیا ہے۔

انور مسعود کے ارژنگِ شعری میں سہ لسانی سخن گوئی کے نقش موجود ہیں یعنی ان کے ہاں اردو، فارسی اور پنجابی زبانوں میں مدحتِ مصطفےٰ ﷺ اور مناقبِ اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نمونے پائے جاتے ہیں۔میں پنجابی زبان کے ٹھیٹ رس سے تو واقف نہیں ہوں لیکن اتنی زبان ضرور سمجھ لیتا ہوں کہ چند اشعار حوالے کے طور پر پیش کرسکوں۔سو چند اشعار پیشِ خدمت ہیں :

رات دے سارے حمیتی زرد پیلے ہوگئے
چمکیا سورج تے لوکی بے دلیلے ہوگئے
اللہ اللہ معجزہ آواز دی تاثیر دا
زندگی دی نبض دے نغمے سُریلے ہوگئے

یا

اللہ اللہ سر بلندی درد مندی اوس دی
سرورو سردار تے غمخوار کل سنسار دا
اللہ اللہ اوس دا اخلاق، اس دی گفتگو
بے مثال اک معجزہ گفتار دا، کردار دا

ان اشعار میں بھی جدید نعت کے موضوعات ضور ریز ہیں۔جدید نعت میں حضورِ اکرم ﷺ کے جمالِ صوری سے زیادہ حسنِ معنوی یعنی آپ ﷺ کے اسوۂ پاک اور سیرتِ مطہرہ کا تذکرہ ہوتا ہے جس کی ضیا،کل عالم کو مطلوب ہے۔

میں اپنی بات معروف اسکالر اور شاعر ڈاکٹر خورشید رضوی کی تحریر سے ایک اقتباس دے کر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔وہ لکھتے ہیں :

''انور مسعود کو ان تینوں زبانوں (اردو، فارسی، پنجابی) میں غیر معمولی پختگی اور قدرت کلام حاصل ہے۔لیکن خوبی یہ ہے کہ اس کے ہاں پختگی نے شیفتگی کو اور قدرت نے ندرت کو دبایا نہیں۔اس کی برجستہ نعتوں میں دل کا گداز اور آنکھ کی نمی وہ تاثیر پیدا کردیتی ہے جو محض قادرالکلامی سے ہاتھ نہیں آتی''۔

....

[مطبوعہ: جسارت، سنڈے میگزین، کراچی، (نعت کائنات) بابت 14 اور 21 دسمبر 2014ء......نعت رنگ: 24، جولائی 2014ء]

توصیف تبسم کا نعتیہ آہنگ
......''سلسبیل'' کے آئینے میں!

ڈاکٹر توصیف تبسم کا نام ادبی دنیا میں جانا پہچانا ہے۔ وہ تحقیق کے میدان کے شہسوار بھی ہیں۔ بچوں کے ادب کے خالق بھی ، عام شاعری بھی کرتے ہیں اور حمد و نعت و منقبت بھی لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کی کتاب ''سلسبیل'' دیکھ کر مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا:

سلسبیلِ نور میرے قلب تک پہنچی عزیزؔ
احمدِ مختارؐ کی الفت کا یہ فیضان ہے

سلسبیل ، جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔شعراء کو اس نام کے معنوی فیضان سے مسلسل رزق ملتا رہتا ہے جو ان کی نورانی فکر کے اظہار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کی شاعری میں بھی فیضانِ سلسبیل نمایاں ہے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ جو شعراء کوچہء جاناں کے مجازی آہنگ سے غزل کی انگلی پکڑ کر شاعری کرتے ہوئے میدانِ حقیقت میں پہنچتے ہیں وہ حقائق و معارف کے موتی اس طرح رولتے ہیں کہ ان کی شعری آواز بھی توانا رہتی ہے اور ان کے مذہبی احساسات بھی لطافتوں اور نزہتوں کے ساتھ اظہار میں آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کا شمار بھی ایسے ہی شعراء میں ہوتا ہے جو کوچہء غزل سے حلقہء مداحانِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف آئے ہیں۔ چنانچہ ان کی شعری اقدار کے بارے میں تو بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ وہ مکمل طور پر ادبی اسلوب کی حامل ہیں۔ رہا معاملہ مذہبی جذبوں کو شاعرانہ زبان دینے کا......تو ظاہر ہے کہ جب شعری دنیا میں

ایک مدتِ مدید گزارنے کے بعد لطیف جذبوں کو احساس کی زبان دینے کا ہنر آشکار ہوہی گیا ہے تو پیرایہء بیاں کو شعریت آمیز کرنے اور عقیدے اور شریعت کو شعری سانچے میں ڈھالنے میں کامیابی حاصل کرنا کونسا مشکل مرحلہ ہے؟......سو ڈاکٹر توصیف تبسم کے لیے بھی مرحلہء توصیفِ نبی ﷺ آسان ہوگیا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کے مقام و مرتبے کے حوالے سے بہت سے شعراء نے خامہ فرسائی کی ہے۔توصیف تبسم نے بڑے سلیقے سے وہ مضمون باندھا ہے:

وہ خالق و مخلوق میں اک ربطِ جلی ہے
دھیان اُس کا بھلا کیسے کسی دل سے نکل جائے

یہاں ''دل'' کہہ کر صاحبِ دل ، صاحبِ ایمان اور صاحبِ عقل و خرد کہا گیا ہے کیوں کہ وہی حضورِ اکرم ﷺ کی ہستی کو خالق و مخلوق کے درمیان ایک ربطِ جلی تسلیم کرتا ہے۔ کچھ اشعار اور ملاحظہ ہوں جن میں حضورِ اکرم ﷺ کے مقام و مرتبے کا تخلیقی شدت اور انتہائی عقیدت کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ اس مضمون کو نعتیہ ادب میں بہت زیادہ شعری پیکروں میں ڈھالا گیا ہے۔لیکن توصیف تبسم نے جس سلیقہء اظہار اور ادبی پیرائے میں بات کی ہے اس سے ان کا آہنگ بڑا دل کش ہوگیا ہے:

رحمت للعالمیں ؐ ، سب سے بڑا اثباتِ حق
یوں تو ہر جھونکا ہوا کا ہے، نشانِ بے نشان
دھوپ میں تپتی زمیں پر سایہء ربِ جلیل
بے اماں صحرائے ہستی میں وہی جائے اماں

نعتیہ غزلوں میں بیشتر شعراء کا متغزلانہ انداز تو ابھر جاتا ہے لیکن نعتیہ آہنگ برقرار نہیں رہ پاتا۔جبکہ نعتیہ شاعری میں اس بات پر خصوصی توجہ مرکوز رہنی چاہیے کہ غزل کی ہیئت میں کہا ہوا شعر مجازی محبوب سے تخاطب کی چغلی نہ کھارہا ہو۔توصیف تبسم کی غزلیہ نعتوں میں یہ اہتمام ملتا ہے کہ شعری بُنت میں نعتیہ علائم ضرور شامل ہوں۔ چند اشعار دیکھیے :

کب حوصلہ نعت کا ہوا ہے
بس عجز کا لفظ لکھ دیا ہے
فاراں پہ سنی تھی گونج جس کی
وہ لہجہ، لہو میں بولتا ہے
کھینچے ہے جو دل کو عشقِ طیبہ
ہر فاصلہ دور کی صدا ہے
سوچیں تو یہ درد بھی کرم ہے
جو اشک ٹپک گیا، دعا ہے
مظہر ہے خدا کا، ذات اس کی
خوشبو کہاں پھول سے جدا ہے
اے روشنیء مقامِ محمود!
سورج ترے سائے میں کھڑا ہے
نظر کے سامنے ہے بابِ رحمت
زہے نظارگی سینہ حرا ہے
لب پہ ان کا نام ہے یا نامہ بر خوشبو کا ہے
کھلتے جاتے ہیں دریچے، سب سفر خوشبو کا ہے
حلقہء خوشبو نظر آئے، حرم کے بام و در
یہ منارہ نور کا ہے، یا شجر خوشبو کا ہے
مجھ پہ اتمامِ کرم کیجے، بصیریؔ کی طرح
میں بھی تو چادرِ توصیف کا بافندہ ہوں
میں اگر ہوتا تو طائف میں سپر بن جاتا
میں وہاں کیوں نہ ہوا، آپ سے شرمندہ ہوں

جدید نعت، جدید اصنافِ سخن کے ملبوس میں بھی نظر آتی ہے اور اگر شاعر میں جدید شعری صنف کو برتنے کا سلیقہ ہو تو بڑی دیدہ زیب نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کے ہاں آزاد نظم کے پیکر میں نعت بڑی سجی بنی نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر ان کی ایک نظم کی چند لائنیں ملاحظہ ہوں:

فضا میں فرشتوں کی پرواز کی سرسراہٹ
عجب نغمہء سرمدی ہے!
کہ جیسے یہاں
وقت بھی سانس روکے ہوئے چل رہا ہو!
یہ تصویر دل میں سجالو!
ان انوار سے اپنے سینے کو بھرلو!
یہاں سے چلو گے
تو رستے میں اک دشتِ ظلمت پڑے گا
تو پھر کیا کروگے! (مُراجعت۔صفحہ ۸۷)

مدینہ منور سے واپسی کا یہ منظر اور آخری سوال؟؟؟
......کہ رستے میں اک دشتِ ظلمت پڑے گا
......تو پھر کیا کروگے!

شاعر نے چند لائنوں میں مدینہ منورہ کی واپسی کے تناظر میں کتنا بڑا سوالیہ قائم کیا ہے!!! ...... مدینے میں قلب و ذہن پر دینی اقدار اور حبِ رسول ﷺ کی چادر تنی ہوئی تھی۔ اپنے اعمال کی نگہداشت کا بھی کچھ خیال تھا۔اپنی گزشتہ زندگی کی غلطیوں پر پشیمانی اور آئندہ زندگی کو دینی سانچے میں ڈھالنے کا عزم بھی تھا......لیکن اب پھر اس مقدس فضا سے نکل کر زندگی کی ان فضاؤں میں قدم رکھ رہے ہیں جن کو ''دشتِ ظلمت'' ہی کہا جاسکتا ہے۔ مدینہ منور سے واپسی پر زائرین کی قلبی واردات منظر بدلنے پر بدل جائیں گی اور بہت کم زائرین

اس کیفیت کو دائمی کیفیت بنانے کی سعی میں کامیاب ہوسکیں گے!عمل کی تحریک اور جذبوں کی سچائی کی شدت میں کمی آجائے گی!......ایسی صورت میں شاعر کا یہ سوال کتنا اہم بن جاتا ہے

کہ رستے میں اک دشتِ ظلمت پڑے گا...............تو پھر کیا کروگے!

توصیف تبسم کی حمدیہ شاعری میں بھی شوقِ اظہار کی فراوانی ہے اور اپنے من میں ڈوب کر معرفتِ حق کی سعی نمایاں ہے:

ٹھہر گیا ہے سرِ آئینہ مرا پرتو
مرے سوا کوئی شاید یہاں نہ رہتا ہو

ڈاکٹر ریاض مجید، نعتیہ ادب میں تنقیدی و تحقیقی شعور کی علامت ہیں۔انہوں نے کیا خوب لکھا ہے:

’’توصیف تبسم کی نعتوں میں ایک خاص جذب اور کیف موجود ہے جس کے اظہار کی دل آویز صورتیں ان کے یہاں با آسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔شاعر نے گویا اپنی تخلیق کے لمحات کو دوام آشنا اور ثبات شناس صدیوں سے ہم کنار کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے‘‘۔

ڈاکٹر توصیف تبسم نے اظہارِ عقیدت کے اس خوبصورت مجموعے میں حمد و نعت و مناقب کا خوبصورت سلسلہ قائم کیا ہے جو اللہ کی حمد، رسول اللہ ﷺ کی نعت اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے مناقب کے ساتھ ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کی صورت میں زیبِ قرطاس ہوا ہے۔

نعتیہ شعری منظر نامے میں،مافیہ (content) ، ہیئت (form) اور اسلوب (style) کے امتزاج کی چندخوبصورت مثالوں میں ڈاکٹر توصیف تبسم کے شعرِ عقیدت کی مثالوں کو بڑے اعتماد کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

....

[مطبوعہ: نعت رنگ 24، جولائی 2014ء۔ جسارت سنڈے میگزین بابت:28 دسمبر 2014ء]

احساسات کی تجسیم......’’رسائی روشنی تک‘‘

شاعری احساسات کی تجسیم کا عمل ہے ۔شاعر اپنے احساسات کی شدت کو جن الفاظ میں سمودیتا ہے ان میں قاری کے دل پر بھی وہی احساسات طاری کرنے کی تاثیر پیدا ہوجاتی ہے۔شرط صرف اتنی ہے کہ قاری بھی شاعری کو ویسی ہی شدتِ احساس کے ساتھ پڑھے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی قرأت کا عمل قاری سے، یک سوئی، شعر میں ڈوب جانے کی صلاحیت ،لفظوں میں پوشیدہ جذبے کی شدت کو انگیز کرنے کا رجحان اور احساسات کی لہروں میں خودکوسمو دینے کے ہنر کی آگہی کا متقاضی ہے۔

اگر ورڈزورتھ کے نزدیک شاعری ’’شدید احساسات کا برجستہ اظہار‘‘ ہے تو شاعری کی قرأت بھی اس جیسی ہی شدتِ احساس کا مطالبہ کرتی ہے۔شاعر اپنے شعری عمل میں اپنی ذاتی واردات رقم کرتا ہے۔لیکن اس کے لاشعور سے مس ہوکرقرطاس پر بکھرنے والے الفاظ ایک جداگانہ اسلوب پا لیتے ہیں۔اسلوب یا اسٹائل کسی شاعر کی ذات سے اسی طرح منسلک ہوتا ہے جس طرح اس کے حلق سے نکلنے والی آواز، دوسرے لوگوں کی آوازوں سے مختلف ہوتی ہے۔

بدقسمتی سے مذہبی شاعری میں بیشتر ایسے شعری نمونے سامنے آتے ہیں جن میں اظہار کا عمل کچا، احساسات کولفظوں میں سمونے والا ہنر ناپید اور اسلوب غیر مؤثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعرصرف جذبوں کا مالک ہوتا ہے زبان و بیان اور شعری ضرورتوں کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا۔ایسی صورت میں وہ اپنے اچھے خیالات کو اظہار کی بھونڈی شکل

دے دیتا ہے اور بس۔لیکن ہر کلیے میں کچھ استثنائی صورتیں بھی ہوتی ہیں۔مذہبی شاعری بھی جب لفظوں کے تقدس، موضوع کی عظمت اور احساسات کی نزاکت کے اظہار کا داعیہ پیدا کرکے کی جاتی ہے تو وہ دل سے نکل کر دل تک پہنچنے والی ہوجاتی ہے۔چنانچہ ایسے شعراء، جن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا عام شاعری میں کچھ نہ کچھ انفرادی شان سے اظہار ہوچکا ہو، مذہبی شاعری میں بھی اچھے اور سچے شعر کہنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

حمیرا راحت نے اپنی عمرِ شاعری کا بیشتر وقت اپنی شعری آواز کی معرفت کی جستجو میں گزاردیا اور جب انہوں نے شعری اظہار کے نمونے ادبی سطح پر پیش کیے تو واقعی ان کی شاعری تحیرِ عشق کا نقش قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔''رسائی روشنی تک'' میں حمیرا راحت کی شاعری نے حمد و نعت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ان کی شاعرانہ مشق کی بدولت انہیں اس میدان میں بھی کامیاب شاعری پیش کرنے کی سعادت مل رہی ہے۔

نعتیہ شاعری کے موضوعات میں زیادہ تر حضورِ اکرم ﷺ کی ذات سے شاعر کا جذبہء الفت جھلکتا ہے اور اسی لیے ہجرِ مدینہ کا موضوع صورتِ اظہار پاتا ہے۔نعت گوئی کے محرکات میں جذباتی وابستگی، شدتِ احساس اور عظمتِ خیرالبشر ﷺ کا احساس شامل ہے۔اس لیے ہر شاعر کے ہاں زیادہ تر پہلے اظہار میں آئے ہوئے خیالات ہی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔شاعری میں خیال سے زیادہ اظہار کی خوبصورتی اہم ہے اس لیے ہر شاعر کچھ نہ کچھ انفرادی شان کے شعر کہنے کی کوشش ضرور کرتا ہے یا اسے ایسی کوشش کرنی چاہیے۔

حمیرا راحت نے جو نعتیہ شاعری کی ہے اس میں ان کا تداخل (میں اس لفظ کو Personal Involvement کے معنی میں استعمال کرتا ہوں) نمایاں ہے۔''رسائی روشنی تک'' میں شاعرہ نے نعتیہ اشعار میں اپنے احساس کی شدت اس طرح سمودی ہے کہ الفاظ میں عشقِ نبوی کی حرارت محسوس ہونے لگی ہے۔حمیرا کی نعتیں پڑھ کر مجھے ڈبلیو۔بی۔ییٹس (W.B.Yeats) کی بات یاد آگئی جو کہتا ہے:

A poet writes always of his personal life, in his finest work out of its tragedy, whatever it be, remorse, lost love, or mere loneliness, he never speaks directly as to someone at the breakfast table, there is always a phantasmagoria.

یعنی ایک شاعر، اپنے لطیف ترین فنی عمل (شعری عمل) میں، ہمیشہ اپنی ذاتی زندگی ہی لکھتا ہے۔زندگی کی المیہ کیفیات جو اور جیسی بھی ہوں، اپنے پچھتاوے، کھوئی ہوئی محبت یا محض احساسِ تنہائی۔وہ براہِ راست کلام نہیں کرتا جیسے ناشتے کی میز پر کسی سے مخاطب ہو۔اس کے اظہار میں ہمیشہ ایک خوابناک کیفیت ہوتی ہے۔

عام شاعری کے اظہاری زاویئے جو کچھ اور جیسے کچھ ییٹس نے بتائے ہیں۔مذہبی شاعری میں ان زاویوں کے علاوہ شاعر کے جذبات کا ترفع (SUBLIMITY) موضوع کا تقدس،فنی خلوص اور جذبات کی طہارت کے عناصر بھی داخل کردیتا ہے اور اس طرح وہ شاعری عقیدت کے رشتے سے منسلک تمام لوگوں کے لیے ایک مشترک آواز بن جاتی ہے۔

حمیرا راحت کی شدتِ احساس، جذبات کے ترفع اور اظہار کے خلوص کے باعث ان کا شعرِ عقیدت ہشت پہلو ترشے ہوئے ہیرے کے مانند ہوگیا ہے۔یہ بات اس طرح بھی کہی جاسکتی ہے کہ حمیرا نے اپنے شعرِ عقیدت کے لفظ لفظ میں وہ منشور (Prism) نصب کردیا ہے جس سے دیکھنے والی آنکھ رنگوں کی دھنک (الوانِ منشوری Prismatic colours) کا نظارہ کرسکتی ہے۔

حمیرا راحت کی نعتیہ شاعری میں تداخل، احتساسی کیفیات کا اظہار، نسائی جذبات کی عکاسی، عملِ تجسیم (personification) اور بیان کی برجستگی جیسے عناصر کی موجودگی نے ان کی شعری آواز کو دیگر تخلیق کاروں کی آواز سے مختلف اور نمایاں کردیا ہے۔

حمیرا راحت نے غزل کے جدید پیرائے میں بھی نعت کہی ہے اور آزاد نظموں کی صورت میں بھی شعرِ عقیدت کی خوشبو بکھیری ہے۔احتساسی کیفیت کا یہ مطلع ملاحظہ ہو:

رنگ خوشبو، گلستاں باتیں کریں

بے زباں سارے وہاں باتیں کریں

اس شعر میں خوشبو کو رنگ دے کر اور گلستاں کو گویائی کا مظہر بنا کر ایک طرف تو احساسی کیفیت(SENSUOUSNESS) پیدا کر دی گئی ہے اور دوسری طرف مدینے کی سرزمین سے اپنے تداخل (Personal involvement) کا احساس شعر میں سمو دیا ہے۔شاعرہ نے اپنی قلبی کیفیات کا اظہار بڑے دل نشین انداز میں کیا ہے مثلاً

یا محمد کہہ کے آنکھیں بند کیں
اور فلک کو چھو لیا یکبارگی
چاند تھا پہلو میں تارے ساتھ تھے
سب مدینے میں ہمارے ساتھ تھے

اس شعر کی خوبی جاننے کے لیے معانی کی قلمونی کو سمجھنا ہوگا۔شعر کا پہلا معنوی انسلاک امیر مینائی کے اس شعر سے قائم ہوتا ہے:

حلقے میں رسولوں کے وہ ماہِ مدنی ہے
کیا چاند کی تنویر ستاروں میں چھنی ہے

اس شعر میں نبی علیہ السلام کے لیے چاند کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ حمیرا راحت کے شعر میں بھی چاند کا استعارہ اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ موجود ہے۔

دوسرا تلازمہ ''تارے'' کا ہے۔یہاں تارے کے استعارے سے اصحابی کا النجوم والی حدیث شریف کی طرف دھیان جاتا ہے۔اس خیال کے آتے ہی شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حضورِ انور ﷺ کے پہلوئے مبارک میں موجودگی کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے۔یہاں چاند تھا اور تارے اس کے پہلو میں ساتھ تھے کی معنویت اور کھلتی ہے.....اگلے مرحلے میں شاعرہ کا تداخل جلوہ ریز ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ میں چاند اور ستاروں کی موجودگی اور ان کی قربت کا احساس شاعرہ کو اس منظر نامے کا زندہ حصہ بنا دیتا ہے۔پھر شعر کی ردیف ''ساتھ تھے'' سے اس بات کا

بھی احساس ہوتا ہے کہ اب یعنی لمحۂ شعر گوئی کے وقت شاعرہ اس منظر سے محروم ہوگئی ہے۔اس محرومی کی کسک بھی شعر کے الفاظ میں پوشیدہ حرارت کے طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔درجِ بالا شعر کے معنوی ابعاد(DIMENSIONS) کا پھیلاؤ دیکھنا ہو تو ایک شعر اور دیکھ لیجیے، روشنی کا تلازمہ حمیرا کی پوری شعری کائنات پر محیط محسوس ہوگا۔وہ کہتی ہیں:

جب مدینے سے میں واپس آئی تھی
چھوڑنے آئی تھی گھر تک روشنی

اس شعر کی قرأت کے ساتھ ہی مجھے وحید الدین وحیدؔ کا یہ مشہور شعر یاد آ رہا ہے:

میں نے جب وادیءِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

اس طرح حمیرا راحت کا لہجہ غزل کے روایتی احساسِ غربت سے بھی جڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور شعری بنت کی خوبی بھی ظاہر ہوتی ہے۔روشنی کے استعارے سے شاعرہ کا شعری نگار خانہ جگمگا رہا ہے۔

حمیرا راحت کا شعری فن ان کی آزاد نظموں میں بڑی خوبصورت کہکشاں بناتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔آزاد نظموں میں وہ اپنے خیال کے نقطے کو لکیر اور لکیر کو دائرہ بناتی ہوئی اپنی بات اس طرح مکمل کرتی ہیں کہ الفاظ کی قلت کے باوجود، کہانی کا پورا مفہوم قاری کے ذہن میں منتقل ہوجاتا ہے۔ مجموعے میں شامل ان کی ساری نظمیں ہی دلکش ہیں لیکن شہرِ بے مثال، واپسی کا سفر، اذان، ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؟ اور ''خطا'' ایسی نظمیں ہیں جن پر نعتیہ شاعری کے آفاق روشن ہوگئے ہیں۔مؤخر الذکر نظم تو مذہبی ادب میں نسائی احساس کی انتہائی مؤثر عکاسی کی مظہر ہے۔نعتیہ ادب میں ایسی مثال میرے محدود مطالعے میں اب تک نہیں آئی تھی، جس نے میرے ذہن و دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ ڈرامائیت کا عنصر شاعری کو تاثر اور مکالمہ اسے زندگی عطا کر دیتا ہے۔حمیرا راحت نے اپنے تلخ تجربے کو ڈرامائیت اور مکالمے کی صورت لکھ کر روضہء رسولِ اکرم ﷺ پر حاضر ہونے والی لاکھوں خواتین کے

احساسات کی ترجمانی کا حق ادا کردیا ہے۔ذرا ابتدائی مکالمہ ملاحظہ ہو:

''تمہاری حد یہیں تک ہے''
وہ عورت جس کے چہرے پر
فقط آنکھیں ہی دکھتی تھیں
بہت مغرور لہجے میں مجھے سمجھا رہی تھی

اس کے بعد جب اس بظاہر مغرور لہجے میں بات کرنے والی عورت نے بتایا کہ وہ بھی اس حد کو پار نہیں کرسکتی ہے تو شاعرہ کی بیچارگی کا احساس اس کے احساسِ محرومی کا حصہ بن کر دو آتشہ ہوگیا......

میں شرطی ہوں مگر......میں بھی نہیں
اس کی سنہری سبز آنکھوں میں
عجب غم ناک سی گہری نمی جاگی

اور نظم کی آخری لائنوں میں تو ساری مسلم عورتوں کا کربِ بیچارگی سمٹ آتا ہے:

جو میرے سامنے دیوار تھی
میں اس پہ اپنے ہاتھ رکھ کر رو پڑی
آقاؐ......مرے آقاؐ
میں عورت ہوں
مگر اس میں مری اپنی خطا کیا ہے؟

ان لائنوں میں عورت کے جذبات کی اتنی بھرپور عکاسی ہوئی ہے کہ احساسات کو لفظوں میں قید کرنے کی صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے۔پڑھنے والا مبہوت ہوجاتا ہے۔ایک سوالیہ ہے جس میں ہر زائر عورت کا شکوہ بڑے سلیقے سے رقم ہوگیا ہے۔تاثیرِ کلام کو مواجہہ شریف کے قریب پہنچنے اور اس کی زیارت سے محروم کردیئے جانے والی عورت کے دل کی آہ کے تناظر میں دیکھیے!......زائرینِ روضۂ رسولﷺ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خواتین کو

مواجہہ شریف تک آنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

عام شاعری میں نئے موضوعات کم کم ہی سامنے آتے ہیں۔نعتیہ ادب میں تو موضوع کی وحدت، جذبات کی یکسانیت اور خیال کی جہت نمائی کے باعث، موضوعات کم اور احساسات زیادہ رقم ہوتے ہیں۔لیکن شاعر تو کائنات کے ذرے ذرے سے مکالمہ کرنے کا فن جانتا ہے۔''سڑک'' کے زیرِ عنوان جو نظم رقم ہوئی ہے وہ نعتیہ ادب میں خاصے کی چیز ہے۔شاعرہ نے سڑک کا دکھ بھی محسوس کیا ہے جو حضورِ اکرمﷺ کے دربارِ اقدس تک لوگوں کو پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہے لیکن خود وہ سڑک 'درِ اقدس تک پہنچنے سے پہلے ہی معدوم ہوجاتی ہے۔یہ نظم نعتیہ تقدیسی ادب میں اضافہ بھی ہے اور تخلیقی دانش کا قابلِ قدر مرقع بھی...... چند لائنیں ملاحظہ ہوں:

پھر اک دن یوں ہوا
میں سوچ میں گم تھی
مجھے ایسا لگا جیسے
کہ اس سیدھی سڑک کی دونوں آنکھیں
آنسوؤں سے بھر گئی ہوں
وہ اک نادیدہ غم سے ہو کے بوجھل کہہ رہی ہو
''میں کہاں خوش بخت ہوں بی بی''
مرے دکھ کو کسی نے آج تک جانا نہیں
میں کیسے سمجھاؤں
کہ میں تو سب کو لے جاتی ہوں اُن کے در پہ
لیکن خود کبھی در تک نہیں پہنچی

اس نظم کی علامت سڑک ہے لیکن یہ بھی نسائی دکھ کا حوالہ بن کر معانی کے پرت کھول رہی ہے۔عورت نہ جانے کتنے زائرین کی ماں بن کر ان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ

روضہء اقدس کی زیارت کو جائیں لیکن خود اس کے لیے حدود مقرر ہیں!

نسائی احساسات سے مملو شاعری نے حمیرا راحت کی شاعری کو ایوانِ نعت میں گونجنے والی منفرد آواز بنادیا ہے۔ اب ایک نعتیہ غزل کا آہنگ دیکھیے:

جب ان کے نام پہ جلتا چراغ ہاتھ میں تھا
میں کیسے بھولتی رستا، چراغ ہاتھ میں تھا
شبِ سیاہ مجھے بھی ڈرا رہی تھی مگر
لبوں پہ نام تھا ان کا چراغ ہاتھ میں تھا
نہ زادِ راہ تھا کوئی نہ خوش گمانی تھی
بس ایک حرفِ دعا کا چراغ ہاتھ میں تھا
کوئی بھی آندھی کبھی ڈگمگا سکی نہ مجھے
اجالا دل میں نہاں تھا، چراغ ہاتھ میں تھا
سفر کے وقت مرے ساتھ میرے آنسو تھے
اور ایک ان کی رضا کا چراغ ہاتھ میں تھا
ہوائے دہر نے کوشش تو کی بہت راحتؔ
نہ بجھ سکا کبھی ایسا چراغ ہاتھ میں تھا

حمیرا راحت کی شعری اقدار کی آگہی کے لیے ان کے کلام سے یہ چند نمونے دیدینا ہی کافی ہے۔ یقیناً یہ شاعری جدید علائم سے ثروت مند بھی ہے اور اس میں موضوع کے احترام وعظمت کا بھی بھرپور احساس موجزن ہے۔ ''رسائی روشنی تک'' ایک ایسا نعتیہ مجموعہ ہے جس کی روشنی ادبی افق پر ہمیشہ دیکھی جاسکے گی!!!

....

[مطبوعہ: جسارت سنڈے میگزین، کراچی۔(نعت کائنات) ۱۸رجنوری ۲۰۱۴ء،ص ۱۶
نعت رنگ: 24، جولائی 2014ء]

''مقامات''(منظوماتِ حرمین الشریفین)......

مقاماتِ مقدسہ کی حاضری پر روح کی بلند پروازی کا شعری مرقع !!!

حال ہی میں راولپنڈی سے شرف الدین شامیؔ کی ایک کتاب ''مقامات(منظوماتِ حرمین الشریفین)'' شائع ہوئی ہے۔اس کتاب میں حرمین الشریفین کی زیارت کے ہنگام جو تاثرات شاعر کے دل نے قبول کیے ان کا شعری عکس ہے۔اس شعری نگار خانے میں داخل ہوکر قاری کومحسوس ہوتا ہے کہ جن مقامات سے وہ حج یا عمرے کے دوران میں گزرا تھا، ان مقامات پر احساسات و واردات کی جو لہریں اس کے دل میں موجزن ہوسکتی تھیں یا ہوئی تھیں......ان کا اظہار اس کے لیے ممکن نہ تھا لیکن اب اس کتاب کی منظومات کے ذریعے وہ اپنی قلبی روداد بیان کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ حٰمٓ السجدہ میں فرمایا ہے:

''سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيٓ اَنْفُسِهِمْ''

(عنقریب دکھائیں گے ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کے انفس میں بھی۔آیت ۵۳ سورہ حٰم السجدہ ۴۱)

آفاق میں دکھائی جانے والی نشانیاں اہلِ عقل وخرد کے لیے اورفکر وتدبر کرنے والے طبقات کے لیے ہیں اور انفس میں دکھائی جانے والی نشانیاں اپنی ذات کے اندرون

میں سفر کرنے والوں کے لیے ہیں۔ پہلے طبقے میں فلسفی اور سائنسدان قسم کے لوگ آتے ہیں اور دوسرے طبقے میں صوفیا کرام اور شعراء داخل ہیں۔شعراء میں چوں کہ دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک گروہ اپنی شعری صلاحیتوں کو صرف سفلی خواہشات کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے تو دوسرا گروہ اپنی صلاحیتِ شعرگوئی کو اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ انفس کی سیر کا صحیح لطف صرف مؤخر الذکر طبقۂ شعراء ہی اٹھا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شعائراللہ(اللہ کی مقرر کردہ نشانیاں جن میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں اور قربانی کے جانوروں کا شمار ہوتا ہے) کے احترام کرنے والوں کے بارے میں فرمادیا ہے کہ وہ اس لیے ان کا احترام کرتے ہیں کہ ان کے دل میں تقویٰ ہے۔

ذٰلِکَ ق وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَاللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (الحج: ۳۲)

’’حقیقت یہ ہے اور جوادب و احترام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا تو یہ [احترام]اس وجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے‘‘۔

شعائر اللہ کو دیکھنے سے دل میں ان کے احترام کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اگر اس جذبے کے اظہار کی توفیق بھی مل جائے ،تو یہ عمل خود شاعر کے لیے ایک مقدس عمل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے سامعین یا قارئین کے لیے بھی باعثِ ازدیادِ تقویٰ ہوسکتا ہے۔

شرف الدین شامی کا شعری عمل (poetic work) اس اعتبار سے منفرد عمل ہے کہ ان کے دل میں شعائراللہ کو دیکھ کرجو احترام کے جذبات ابھرے تھے ان جذبات کا اظہار کرکے انھوں نے اپنے سامعین و قارئین کو بھی نہ صرف اپنی کیفیات میں شامل کرلیا ہے بلکہ عوام الناس کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے زبان بھی دیدی ہے ۔شاعر کے دل پر ’’تقویٰ‘‘ کا جو رنگ چڑھا تھا اس کا لونی عکس(shades) بھی اس نے عام فضاؤں تک پھیلانے کی کوشش کی ہے۔

’’مقامات‘‘ دیکھ کر مجھے بے اختیار پوپ کا وہ شہرہ آفاق مقولہ یاد آگیا جس میں اس نے کہا تھا:

All art is nature to adventagedrest. What:
oft was thought but never so well exprest.

...... فراق گورکھپوری نے ،ان سطور کا بہت خوبصورتی سے ترجمہ کیا تھا کہ’’فن کی تمام تر خوبی یہ ہے کہ زندگی کے مسلمات اور پنچائتی خیالات اور معتقدات کو حسین طریقے پر ظاہر کردیا جائے۔ یعنی جو بات سب جانتے اور مانتے تھے لیکن جس کا اب تک اس خوش سلیقگی سے اظہار نہیں ہوا تھا‘‘۔

کتاب کے ایک تقریظ نگار کے بیان نے میرے اس تأثر کو مزید تقویت دی ۔ نسیم سحر کہتے ہیں:

’’میں کوئی اکتیس برس سعودی عرب میں رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کئی بار حج کیا، کعبہ شریف اورروضہء رسولﷺ کی زیارت مسلسل نصیب ہوتی رہی،مگر اب جب میں نے شرف الدین شامی کی شاعری میں ان کی آنکھ سے ان تمام مقامات کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ میں تو ان مقامات کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں اور ان تمام کیفیات کو پہلی مرتبہ محسوس کررہاہوں جو شرف الدین شامی نے محسوس کرکے پوری پوری والہانہ کیفیت اور سرشاریٔ عشق کی حالت میں قلم بند کیے ہیں۔
اللہ اللہ۔ یہ نصیب اللہ اکبر......‘‘

کتاب کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ ایک حصے میں حرمِ کعبہ شریف ، صفا ، مروہ، منیٰ ،عرفات اور مزدلفہ کے مقامات کے حوالے سے شاعر کے محسوسات کی ملفوظی عکس بندی ہے اور دوسرے حصے میں حضورِ اکرم کے طریقِ ہجرۃ سے مدینہ منورہ اور مسجدِ نبوی شریف سے جبلِ احد تک جن جن مقامات و آثار کے حوالے سے شاعر کے قلبِ مجلّا پر روحانی کیفیات طاری ہوئیں وہ شعری سانچے میں ڈھال کرحوالہءقرطاس کردی گئی ہیں۔

یہاں میں شاعری کے کچھ نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرا دعویٰ بے دلیل نہ

رہے:

بشارت ہو کہ ہم نے
اپنی تائیدِ مشیت میں
مصافِ استجابت میں
سزاوارانِ رحمت میں
تمھیں داخل کیا
تم پر بھی اپنا دستِ شفقت رکھ دیا ہے
چلے آؤ
درِ رحمت کھلا ہے
باریابی کی گھڑی ہے
اور تمھیں اذنِ جلی ہے (اذنِ حاضری)

جیسے ہو روح میں پھوٹا ہوا جھرنا کوئی
رنگ اترے ہوئے سب دل کے مناجات میں ہیں
وہی باہر بھی ہے اندر ہے جو جھلمل جھلمل
یوں نہائے ہوئے ہم نور کی برسات میں ہیں
ہم گنہگار بھلا لائقِ اکرام تھے کب
زہے خوبی جو تری چشمِ عنایات میں ہیں (مضافاتِ حرم)

عبودیت نشاں سجدہ گہہِ ختم الرسلؐ ہے
دوسرے کلمے کی نصف آخر
شہادت کی امیں محرابِ نوریں
زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے
کہ تاحینِ ابد سارا زمانہ آپؐ کا ہے

نسلِ فردا، مقتدی ہے (مصلائے نبویؐ پر)
مرے اطراف
عہدِ رحمت للعالمینی کی
ہوائیں چل رہی ہیں
اور مناظر جاگتے ہیں
یوں کہ جیسے
عہدِ ماضی کے سب اکنافِ مدینہ
حال کی مسجد میں شامل ہوگئے ہیں
آنے والے اور سب کے سب زمانے
اسی دھارے میں آکر مل گئے ہیں (بازآمد)

وارفتگیٔ ذوقِ نظارہ نہ پوچھئے
اس بحرِ بے کراں کا کنارہ نہ پوچھئے
دہلیز پر کھڑا ہوں رسولِ کریمؐ کی
کس اوج پر ہے اپنا ستارہ نہ پوچھئے
یہ چند اشک حاصلِ عجزِ بیاں ہوئے
اب دل کی بات ہم سے خدارا نہ پوچھئے
سارے جہاں کے رنج و الم کتنے ہیچ ہیں
یوں دل کو مل گیا ہے سہارا نہ پوچھئے
(نہ پوچھئے!)

میں نے نعتیہ ادب کے مطالعے کے دوران میں یہ محسوس کیا ہے کہ بیشتر شعراء اپنی روحانی واردات کا اظہار اس تخلیقی شان کے ساتھ نہیں کر پاتے ہیں جس کی خواندگی سے قاری کو یہ احساس ہوسکے کہ وہ شاعر کے تجربے میں شامل ہوگیا ہے۔نعتیہ تخلیقات میں زیادہ تر

بیانیہ لہجہ اختیار کیا جاتا ہے جس میں جذبے کی ترسیل کے امکانات محدود ہوتے ہیں۔

مذہبی شاعری کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ اس کا قاری یا سامع اس شاعری کے موضوع اور مافیہ یا متن ہی کی عظمت کی بنا پر اس کو مقدس جان کر قبول کرلیتا ہے اور فنی باریکیوں کی طرف دھیان نہیں دیتا۔لیکن ادب کے کسی سنجیدہ قاری یا نقاد کا یہ رویہ نہیں ہوتا۔اس لیے اسے بیشتر مذہبی شاعری میں کوئی charm نظر نہیں آتا ۔نعتیہ شاعری کی ادبی حیثیت کوتسلیم کروانے میں یہ عنصر بھی بہت مدت تک مانع رہا ہے۔

مذہب کا موضوع انسان ہے اور شاعری کا موضوع بھی انسان ہی ہے لیکن انسان کی اندرونی دنیا کا سفر ہر شاعری میں نہیں ہوتا۔ مذہبی شاعری میں مذہبی جذبات اس طور بیان کیے جاتے ہیں کہ صرف اس مذہب سے منسلک لوگ ہی اس شاعری سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔جبکہ عام شاعری میں انسانی جذبات کی عمومیت ہوتی ہے اور یوں اس میں آفاقیت پیدا ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ شامی کی نظموں میں ایسی شعری قدریں ہیں جو شعر کو شعریت اور احساس کو لطافتوں سے ہم کنار کررہی ہیں۔ ان کی نظموں میں نظموں کے عنوانات کی وضاحتیں یا عنوانات کی تشریحات اور تفصیلی عکس بندی نہیں ہے ۔بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی نظموں میں احساسات کی شدت اور جذبات کی پاکیزگی نے ایک ماورائی دنیا تخلیق کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔''مقامات'' میں شامل بیشتر نظموں کو پڑھ کر قاری ایک نئے احساساتی ہالے میں آجاتا ہے اس طرح وہ شاعری سے حظ بھی اٹھاتا ہے اور مذہبی احساسات میں ترفع(Sublimity) بھی محسوس کرتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ قاری کو کسی مقام یا حج کے رکن کی تفصیلات جانے بغیر صرف شعر کی قرأت ہی فکری ، جمالیاتی اور احساساتی ترفع عطا کردیتی ہے۔

مشرقی شعریات میں آمد کا تصور ،تخلیقی لمحوں میں شاعر کی طبیعت پر پڑنے والے جبرِ اندروں (Internal Urge) کو ظاہر کرتا ہے۔ شرف الدین شامؔی کی شاعری میں جبرِ اندروں کا یہ احساس نمایاں ہے اسی لیے ان کی شاعری ، مؤثر ادب (Literature of

Power) کے بلند مقام پر فائز نظر آتی ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے ،شامؔی ملتزم پر کھڑے ہوکر کیا محسوس کرتے ہیں:

حِسیں منجمد ہیں
زمان و مکاں ادھ کھلی آنکھ کا خواب تھے
بجھ گئے
فاصلوں کا کہیں شائبہ تک نہیں
میں کماں کی طرح جاں خمیدہ بھی
چلّہ چڑھے تیر سا بھی
زمیں میں گڑا
رفعتوں کی طرف کھنچ گیا ہوں
سراپا دعا ہوں (ملتزم پر)

ملتزم پر حاضر ہوکر ایک زائر جو کچھ محسوس کرتا ہے اورکیفیات کا جو تموج ہوتا ہے،اس کی عکس بندی بڑی مشکل ہے۔شامؔی کی اس نظم میں زائر کی کیفیات کومجسم کردیا گیا ہے۔مشرقی انتقادی شعوراس طرح کی شاعری کو''مُحاکات'' کے ذیل میں رکھ کر پرکھتا ہے۔اس نظم میں شامؔی محاکات کی بلند سطح چھونے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

مذہبی شاعری میں بالعموم مسلم معاشرے کے اجتماعی شعور کا عکس ہوتا ہے لیکن احساساتی سطح پر کسی روحانی واردات کی تصویر کشی ہر کہہ و مہہ کے بس کی بات نہیں ہوتی اس لیے بیشتر شعراء ذاتی احوال کی عکس بندی میں تعمیم (Generalization) کا عنصر داخل نہیں کرپاتے۔ شامی نے اپنی شاعری میں اپنے احساسات کے ارتعاشات کو جزوِہنر بنا کر ان کو اجتماعی مسلم شعور کا فطری اظہاریہ بنا دیا ہے۔

ایلیٹ نے لکھا تھا:

''شاعری میں ہمیشہ کسی نہ کسی نئے تجربے کا ابلاغ ہوتا ہے یا پھر کوئی

نامانوس تجربہ نئے ادراک کے ساتھ پیش ہوتا ہے یا پھر کسی ایسی چیز کا اظہار ہوتا ہے جس کا ہم نے تجربہ تو کیا تھا مگر اس کے اظہار کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں تھے۔ ایک ایسا تجربہ جو ہمارے شعور میں وسعت پیدا کرتا ہے یا ہمارے ادراک کو لطافت بخشتا ہے''۔

(ایلیٹ کے مضامین ص۸۳)

عام طور سے مذہبی تجربات یا مذہبی رسومات کے ذکر میں ادبی اسلوب پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے کہ بیشتر مذہبی شاعری کرنے والے لوگ یہ کہہ کر ادبی ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں کہ

ع   نالہ پابندِ نے نہیں ہے

لیکن جو لوگ اپنی کسی بھی شعری کاوش کو شعریت سے مملو دیکھنا چاہتے ہیں وہ مذہبی شاعری میں بھی شعریت کی آفاقی قدریں پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اس طرح ان کی شاعری میں ایک عمومی کشش پیدا ہوجاتی ہے یہی عمومی کشش (General Appeal) کسی فن پارے کی عظمت کی ضامن ہوتی ہے۔ صرف درجہ بندی کا فرق رہتا ہے جس کا ادراک فن پارے پر زمان و مکان کی سرحدیں پار کرنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

شاؔمی کی شاعری بھی اسی قسم کی شاعری ہے کہ ان کے مذہبی جذبات اور شعائراللہ سے متعلق ان کے احساسات جب شعری قالب میں ڈھلے تو ان کی شعرگوئی کی صلاحیت نے انہیں اسلوب کی دل کشی اور بیان کی چاشنی سے مالا مال کردیا۔ راقم الحروف اپنے مطالعے کی وسعت کا مبالغہ آمیز ذکر تو نہیں کرتا کیوں کہ وسعتِ مطالعہ کا ہر دعویٰ علم کی توہین اور اپنی ذات کی بڑائی کے التباس پر مبنی ہوسکتا ہے۔تاہم اتنا کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ مناسک و مقاماتِ حج کے حوالے سے ایسا سفر نامہ جو منظوم ہوکر شاعری کی بیشتر مقتضیات بھی پوری کررہا ہو اور مذہبی احساسات و جذبات میں اعتدال و توازن کا بھی مرقع ہو اردو نعتیہ ادب کے سرمائے میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

''مقامات'' کی شاعری پڑھتے ہوئے قاری کو بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ حج کے اس رکن کی ادائیگی کے وقت اس کا وہ شدید احساس الفاظ کی زنجیر میں قید نہیں ہوسکا تھا لیکن شاؔمی نے اپنی شعری صلاحیت کے ذریعے مجھے اس قابل کردیا ہے کہ اگر میں اپنا تجربہ بیان کرنا چاہوں تو بلا جھجک ان کے الفاظ مستعار لے سکتا ہوں۔ یہی حال حج کے مقامات کے بیان کا ہے کہ مقامات تو بہت سے عام آدمیوں نے بھی دیکھے تھے اور شعراء نے بھی ان مقامات سے گزرنے کے مواقع پائے تھے لیکن ان مقامات کی عظمت (Gradeur) کا اتنا پر کشش تاثر اس کی طبیعت پر نہیں پڑسکا تھا جس قدر پرکشش تاثر شاعرِ ''مقامات'' نے قبول کیا ہے اور جس کے اظہار پر مبداء فیاض نے انہیں قدرتِ کلام کے جوہر سے نوازا ہے۔

''مقامات'' کی شاعری میں ،سلیقہء اظہار اورایک خاص اسلوب نے شعری مافیہ (content) اور شاعرانہ لہجے (Poetic diction) کو ایک حسین اکائی میں بدل دیا ہے۔اسی لیے اس شاعری میں تعیم اور مفاہیم کی ترسیل کا عنصر داخل ہوسکا ہے۔

کچھ غزل طور لکھے ہوئے اشعار کی ضوریزیِ افکار اور احساسات کی جھنکار ملاحظہ ہو:

اے دلِ بے قرار تھم، شہرِ نبیؐ ہے سامنے
خواب و خیال کا نگر، یہ تو وہی ہے سامنے
کرلے یہیں سے فیصلہ ، جانا ہے اب کدھر تجھے
دنیا بنی ٹھنی سہی، ان کی گلی ہے سامنے
کھول دریچہء نظر، دل کو تجلیوں سے بھر
کل یہ سماں نہ ہو کہ ہو، یہ جو ابھی ہے سامنے
ان کے حضور پیش ہو، چہرے کو آنسوؤں سے دھو
جالی پہ آ، قریب ہو، یہ جو لگی ہے سامنے
ان کی تجلیِ نظر، چھانے لگی وجود پر

ہے کبھی دل کے آر پار اور کبھی ہے سامنے
سائل خستہ کو یہاں، اپنا بھی ہوش ہے کہاں
حاصلِ زندگی کہیں، ایسی گھڑی ہے سامنے

ایک سلسلہء منظومات میں شاعر نے ،بارگاہِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضری کے لمحات کی عکس بندی بڑی خوبصورتی سے کی ہے:

اک عرصہء دست بستگی میں
جن، انس و ملائکہ سے ہٹ کر
ذی روح و شعور جو بھی شے ہے
سب بھول کے اپنی منزلت کو
اوقات مٹا کے اپنی اپنی
تسلیم و ادب کے دائروں میں
نیہوڑائے ہوئے سروں کو اپنے
بے خود سی، جناب میں کھڑی ہے
یہ بارگہِ محمدی ﷺ ہے

(یہ بارگہِ محمدی ﷺ ہے)

یہ نظم میں نے مکمل نقل کردی ہے تاکہ تاثر پذیری کو ٹھیس نہ لگے۔ عمرانیات میں ،خیالا ت،نظریات، یقین ا و رعقیدے کے تلقینی عمل کے انداز اور طریقہ کو'' نظریاتی ذہن نشینی'' (INDOCTRINATION) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے جذبات، اقدار اور عقائد کو ہم ہر لمحہ ایک معیار کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور وہ معیار مقرر ہوتا ہے حوالہ جاتی ماحول (افراد یا گروہ کے مسلسل عمل) کی بنیاد پر۔ شاعری کے ذریعے شاعر کا تفاعل (INTERACTION) اپنے لوگوں یا معاشرے سے علامتی (symbolic) زبان میں ہوتا ہے۔ درجِ بالا نظم اور اس کی ذیلی نظموں میں شاعر نے حضورِ اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے افراد کا حوالہ

(Reference) ''ادب آموز'' رخ سے پیش کیا ہے۔ اس اظہاریے میں شاؔمی نے مواجہہ شریف پر کھڑے مجموعہء افراد[انسان] کے ذکر کے ساتھ ساتھ غیر محسوس مخلوق [جن اور فرشتوں] کو بھی اپنے دینی معلوماتی دائرے میں رہتے ہوئے وہاں مؤدب کھڑا ہوا دکھایا ہے۔ اس طرح نظم میں ایک محاکاتی شان پیدا ہوگئی ہے۔

اب اس سلسلے کی بقیہ نظموں کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

[ا]

انداز بدل گئے جنوں کے
جب حسن وہؐ بے نقاب آیا
اِس خاک سرشت خاکداں میں
وہؐ روحِ بہار بن کے آیا
نبیوں کا سبق برنگِ قرآں
تکمیل پذیر ہو کے آیا
اول تھا جو روزِ آفرینش
آخر کو اسی کا دور آیا
تہذیب بدل رہی ہے چولہ
تاریخ ورق الٹ رہی ہے
یہ بارگہِ محمدی ﷺ ہے

[۲]

ہر قلبِ سلیم کے مقابل
آقا کا جمالِ با صفا ہے
سنت ہے نبیِ محتشم کی
مطلوب حضورؐ کی رضا ہے

حق جلوہ گرِ بساطِ عالم
باطل کا طلسم ٹوٹتا ہے
وہ نسل و زبان و رنگِ عالم
اک ضربتِ لا سے توڑتا ہے

[۳]

اللہ کی تھے نظر میں ہردم
خالق کے حضور میں رہے ہیں
وہ حلقہ بگوش انؐ کے اصحابؓ
اک جذب و سرور میں رہے ہیں
اِس طبقۂ منزلت نشاں کا
خود شوقِ تمام دیدنی ہے
یہ بارگہِ محمدی ﷺ ہے

[۴]

اخلاص و حیا و راستی میں
مشکل ہے مثال انؓ کی لانا
ہے انؓ کا وجودِ با سعادت
ملنے کا نبیؐ سے اک بہانہ
چن لے کوئی گفتگو کے موتی
آواز بہ گوش ہے زمانہ
بے گانہ کیے ہوئے ہے خود سے
اک جذبہ و شوقِ والہانہ
اسلاف کے ساتھ یوں خلف کا

جا ملنا کمالِ دیدنی ہے
یہ بارگہِ محمدی ﷺ ہے

[۵]

معدوم سے اس ہماہمی تک
خلیے سے خرامِ زندگی تک
تخمیں سے یقین و حق رسی تک
اوہام سے نورِ آگہی تک
کلمے سے کتابِ آخری تک
ظلمت سے ہدیٰ کی روشنی تک
رو میں رہی کائنات جس پر
جادہ وہی خطِ منتہی ہے
یہ بارگہِ محمدی ﷺ ہے

[۶]

تھی حکمِ فنا کے دائرے میں
تیرے لیے شاخ سے جدائی
ہر ایک ہوا کے سنگ اڑنا
کب رِیت ہمیں یہ راس آئی
رستہ وہی ایک تھا جہاں سے
بے رہروی تجھ کو گھیر لائی
رہ اب بھی وہ منتظر ہے گویا
رہ دے جو تجھے گرفتہ پائی
بھولوں کے لیے ہے اک ٹھکانہ

بھٹکوں کے لیے جو رہبری ہے
یہ بارگہہِ محمدی ﷺ ہے

[۷]

سوچا بھی کبھی کہاں سے ہوگی؟
تائیدِ وفا کہاں سے ہوگی؟
جب جب بھی ہوئی جہاں سے ہوگی
اک لطف کے آستاں سے ہوگی
توثیقِ وفا کہاں سے ہوگی؟
یہ جانیئے انؐ کے ہاں سے ہوگی
وہ جنؐ کے مطاف و بام و در کی
جاروب کشی بھی خواجگی ہے
یہ بارگہہِ محمدی ﷺ ہے

[۸]

ظلمت سے نکل کے عصرِ نو کی
قرآں پہ عبور کی طرف آ
ذرے میں جو آفتاب ٹانکے
اس منبعِ نور کی طرف آ
داخل ہو مطافِ عاشقی میں
آپھر سے حضورؐ کی طرف آ
جو مبدائے خیر و عقل و بینش
رحمت ہے تمام روشنی ہے
یہ بارگہہِ محمدی ﷺ ہے

یہاں شامیؔ کا پیغام اقبال کے ترانے سے مل گیا ہے ۔اقبال نے اپنی شاعری کا مقصد اس طرح واضح کیا تھا:

ع سوئے قطار می کشم ناقہء بے زمام را

شامی نے اپنی کتاب میں مقاماتِ حرمین شریفین کے جغرافیائی محلِ وقوع یا ان کی تعمیراتی دلکشی کی بات نہیں کی ہے بلکہ ان مقامات سے وابستہ جذبات اور پاکیزہ احساسات کی عکس بندی کرنے کی کوشش کی ہے ۔ انہوں نے جسمانی طور پر وہاں پہنچنے سے پہلے اپنی روح کو اس سفر پر روانہ کردیا ۔اس روحانی سفر میں مقاماتِ مقدسہ پر پہنچنے کے لیے احکاماتِ الٰہیہ کی بجا آوری اور پیروی ء رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے حاصل ہونے والی سرشاری کا غلبہ ہے۔ جذبے کی تخلیص (Purity) اور احساس کی پاکیزگی نے شامیؔ سے ایسی شاعری کروائی جس میں تخلیقی وجدان کا بھرپور عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی شاعری ہے جسے

ع از دل خیزد بر دل ریزد

(بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے)

یا بقول غالب:

ع میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کا نقشِ محسوس کہہ سکتے ہیں۔

سچ کہا ہے پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر نے کہ

''سفرِ حرمین کے سفر نامے بھی دیکھے، رہنما کتابچے بھی دیکھے، تواریخ تو پھر تواریخ ہیں مگر یہ شوقِ سفر جو اس کتاب کے قاری کا ہم سفر ہوجاتا ہے اور سی شے ہے''۔

پروفیسر انور مسعود بھی شامی کے باطنی سفر پر عش عش کرتے نظر آتے ہیں:

''خانہء خدا میں شرفِ باریابی نے شرف الدین کو ایسی باطنی رفعت، پاکیزہ رِقت، طمانیتِ خاطر اور دولتِ قُرب وحضوری سے نوازا ہے کہ

وہ نشاطِ بندگی سے چُور ہوکر آیا ہے۔نزہتِ تخیّل کے حوالے سے اُس کا سفرِ حج ایک بے مثال صوفیانہ تجربہ ہے''۔

پروفیسر جلیل عالی نے شامی کے نگارخانہءفن کی سیر کرنے کے بعد کہا ہے:

''مقامات'' کے اس آئینہ خانے میں جسم و روح، بصارت و بصیرت، دل و دانش، زمین و زماں، انفس و آفاق، موجود و ماوراء اور غیب و حضور کی صد رنگ معنوی جہتیں جلوہ گر ہوگئی ہیں''۔

ایمانی قوت،قلبی حرارت ،حضورِ اکرمﷺ کی سچی محبت، جذبہء اتباعِ رسولﷺ ، اوردین پر مر مٹنے کا داعیہ رکھتے ہوئے شاعرانہ رویہّ (Poetic Approach) اختیار کیا جائے توشعرِ عقیدت کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ۔شرف الدین شامؔی کی کتاب میں حمد ومناجات ، مناسکِ حج ، مکہ مکرمہ، منیٰ ،عرفات، مذدلفہ اور مدینہ منورہ کے مقامات کے حوالے سے ۱۲۹ نظمیں ہیں۔ان نظموں میں مذہبی حسیت (Religious sensibility)، بھرپور تخلیقی قوت، جذبے کی حرارت اور اسلوب کی دلکشی کے ساتھ جلوہ آراء تو ہے ہی لیکن مضامین کی ندرت اور موضوعات کی کثرت بھی حیرت انگیز ہے۔

....

[مطبوعہ: جسارت ،سنڈے میگزین، کراچی۔6 اور 13 /اکتوبر 2013 ء
نعت رنگ:24 ، جولائی 2014 ء]

ڈاکٹر عزیزؔ احسن کی تنقیدی تصانیف کے مندرجات کا اشاریہ

☆**اردونعت اور جدید اسالیب**: ناشر:فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اردو بازار کراچی ,دسمبر ۱۹۹۸ء

عنوانات: ۱۔نعت کے علمی و ادبی افق　　۲۔شعر کے فنی لوازمات
۳۔اردونعت اور شاعرانہ رویہ　　۴۔اردو نعت میں آفاقی قدروں کی تلاش
۵۔نعت اورشعریت　　۶۔اردونعت اور جدید اسالیب (اول)
۷۔اردونعت اور جدید اسالیب(دوم)
۸۔عاصی کرنالی کا نعتیہ کلام ,فن کا طیفِ رواں
۹۔صبیح رحمانی کی نعتیہ شاعری ......حبِ رسولﷺ کا جمالیاتی اظہار
۱۰۔قمر وارثی کے سنگلاخ زمینوں میں نعتیہ شعری تجربے
۱۱۔شاخِ غزل پہ مدحت کے خوشنما پھول
۱۲۔جاذب قریشی ......جدید تر نعتیہ لہجے کا شاعر

☆**نعت کی تخلیقی سچائیاں**: ناشر: اقلیمِ نعت، کراچی۔محرم الحرام ۱۴۲۴ھ مطابق: مارچ ۲۰۰۳ء

عنوانات: ۱۔معجزہءفن کی ہے خونِ جگر سے نمود　　۲۔نعت کا مقصدِ تخلیق
۳۔نعت کی تخلیقی سچائیاں
۴۔غالب کی اردو شاعری میں مضامینِ نعت کا فقدان
۵۔ردیفوں کے مثبت استعمال کی تحریک
۶۔''نسبت''......احساس اور لطافت کا مرقع
۷۔ثنائے محمدﷺ　　۸۔ارمغانِ حافظ......ایک جائزہ
۹۔نعتِ نبیﷺ میں زبان و بیان کی بے احتیاطیاں
۱۰۔پاکستان میں نعت (نصف صدی کا سفر)☆☆

☆☆یہ مضمون ترمیمات' اضافوں اور مختلف سرخیوں کے ساتھ ''پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر'' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، کراچی۔جولائی 2014 ء

☆**ہنر نازک ہے (مدح سرکارِ دوعالم ﷺ کا ہنر نازک ہے)**

ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، کراچی۔رجب ۱۴۲۸ھ مطابق: جولائی ۲۰۰۷ء

عنوانات: ۱۔ایک حمد کا تجزیاتی مطالعہ		۲۔افصح العرب ﷺ کے حضور میں

۳۔مقصودِ کائنات		۴۔فی امامٍ مبین

۵۔کلامِ رضا میں مناقبِ صحابہ کرامؓ اور امہات المؤمنینؓ

۶۔ولائے رسول ﷺ کے اظہاری زاویے......قمر رعینی کی شعری اقدار کا جائزہ

۷۔نعتیہ ادب میں تنقید اور مشکلاتِ تنقید (ایک مطالعہ)

۸۔تیرا وجود الکتاب (ایک مطالعہ)

☆**نعت کے تنقیدی آفاق۔** نعت ریسرچ سینٹر، کراچی۔شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ مطابق: ستمبر ۲۰۱۰ء

عنوانات: ۱۔اردو کی حمدیہ شاعری میں جدید اسالیب کی دھنک

۲۔مظفر وارثی کا حمدیہ آہنگ

۳۔نعتیہ شاعری میں متنی رشتوں کی تلاش

۴۔تخلیقی ادب اور نعتیہ ادب کی موجودہ صورتِ حال

۵۔پروفیسر محمد اقبال جاوید کی نعت شناسی

۶۔اسلوب شناس   نعت نگار......احسان اکبر

۷۔صبا اکبرآبادی کی نعت گوئی

۸۔قلزمِ انوار......تخلیقِ مقاصد کا آئینہ

۹۔جاذب قریشی کا قلمی سفر......تخلیقِ نعت سے تنقیدِ نعت تک

۱۰۔قمر وارثی کے ریاضِ فن میں نعتیہ پھولوں کی مہک

۱۱۔عابد سعید عابد کی نعتیہ شاعری